منتخب احادیث

بمعہ مقدمہ و اصطلاحات

انتخاب و مقدمہ

غزالی دوراں
علامہ احمد سعید کاظمی
قدس سرہ

ترجمہ و تشریح
مولینا محمدّ رفیق

مکتبہ مہریہ رضویہ ڈسکہ

بخاری و مسلم سے

منتخب احادیث

بمعہ مقدمہ و اصطلاحات

انتخاب و مقدمہ

غزالی دوراں علامہ احمد سعید کاظمی قدس سرہ

ترجمہ و تشریح

مولانا محمد رفیق صدر مدرس دار العلوم نقشبندیہ رضویہ ڈسکہ

ناشر
مکتبہ مہریہ رضویہ جامعہ روڈ ڈسکہ (سیالکوٹ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب ——— مجموعہ صد احادیث (حصہ اول)

مرتب ——— شیخ الحدیث علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ

ترجمہ و تشریح ——— ابوالخیر مولانا محمد رفیق قادری

نظر ثانی ——— مولانا محمد ریاض احمد سعیدی

کتابت ——— محمد عاشق حسین ہاشمی (چنیوٹ)

اشاعت بار اول ——— فروری ۲۰۰۱ء

اشاعت بار دوم ——— مارچ ۲۰۰۳ء

تعداد ——— ۱۱۰۰

باہتمام ——— محمد ضیاء اللہ قادری

ناشر ——— مکتبہ مہریہ رضویہ، ڈسکہ

قیمت ——— ۱۳۵ روپے

سبب تالیف

عرصہ سے دل میں یہ خیال آتا رہتا تھا کہ کوئی کتاب تحریر کی جائے جو عوام و خواص کو مفید ہو۔ صدقہ جاریہ ہو اور بعض احباب نگاہ بگاہ مشورہ بھی دیتے تھے لیکن اپنی کم علمی اور مصروفیت کی وجہ سے کتاب تحریر کرنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ اس کش مکش میں کبھی ارادہ کرتا کبھی ارادہ چھوڑ دیتا۔ کئی بار عزیزم حافظ محمد حمد اللہ سلمہ نے بھی کہا کہ کچھ نہ کچھ تحریر کرنا چاہیئے۔ آخر کمر ہمت باندھی اور کچھ لکھنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ کتاب مجموعہ صد احادیث اس میں غزالی زمان علامہ احمد سعید کاظمی علیہ الرحمت نے بخاری مسلم کی متفق علیہ احادیث انتخاب کی ہیں۔ ان کے انتخاب کو سند بناتے ہوئے ان احادیث کا ترجمہ و تشریح کرنا شروع کر دیا۔ جب چند احادیث کی شرح تحریر ہو گئی تو خیال ہوا کسی کو دکھا لیا جائے۔ یہ کام صحیح بھی ہو رہا ہے یا نہیں تو مولانا علامہ عبد الحکیم صاحب شرف شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ لاہور کو چند احادیث کی شرح کا مسودہ بھیجا۔ انہوں نے پڑھ کر حوصلہ افزائی فرمائی اور کام جاری رکھنے کا حکم فرمایا۔ پھر بندہ اس تلاش میں لگ گیا کہ کوئی عالم دین اس پر نظر ثانی کی ذمہ داری قبول کر لے۔ علماء کرام کی بہت مصروف زندگی ہوتی ہے۔ بہر حال خدا بھلا کرے۔ مولانا علامہ ریاض احمد سعیدی مدرس جامعہ قادریہ رضویہ فیصل آباد کا کہ انہوں نے نہ صرف نظر ثانی بلکہ کتابت کروانے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ جو لکھتا جاتا وہ

مسودہ ان کو بھیج دیتا۔ وہ نظر ثانی فرما کر کاتب کو پہنچاتے اور کتابت کے بعد خود ایک دفعہ پھر پڑھتے۔ اس طرح کام ہوتا رہا۔ بندہ ان کا مشکور و ممنون ہے۔ جب ۴۱ احادیث کی شرح مکمل ہو گئی۔ گھر میں بیماری اور پریشانی شدید لاحق ہونے کی وجہ سے ذہن حاضر نہ رہا۔ ادھر دارالعلوم میں پڑھانے کی ذمہ داری وغیرہ .... لہٰذا آگے کام رک گیا۔ خیال کیا جو ہو گیا ہے اس ہی کی اشاعت کر دی جائے۔ یہ حصہ اوّل ہو جائے گا۔ پھر اگر ہمت ہوئی تو بقایا احادیث کی شرح حصہ دوسرا ہو جائے گی۔ پہلے خیال تھا کہ علامہ کاظمی صاحب علیہ الرحمت نے جو شروع میں مقدمہ لکھا ہے اس کو چھوڑ دیا جائے کیونکہ وہ قدرے مشکل ہے لیکن استاذ العلماء حضرت مولانا علامہ محمد معین الدین صاحب مہتمم دارالعلوم نقشبندیہ رضویہ اور مولانا علامہ ریاض احمد مذکور نے مشورہ دیا کہ مقدمہ اور اصطلاحات کو بھی اشاعت میں شامل رکھا جائے تاکہ غزالی زمان کے علمی کمالات (جواہر پارے) سے بھی ساتھ ساتھ استفادہ ہوتا رہے اور کتاب عوام و خواص کو فائدہ مند ہو۔ ان کا مشورہ قبول کرتے ہوئے اس کو بھی شامل اشاعت کر دیا ہے۔ صرف تبدیلی یہ ہے کہ رواۃ حدیث کے حالات ہر حدیث کے تحت حاشیہ میں کر دیئے گئے ہیں جب کہ آپ نے مقدمہ میں یکجا لکھے تھے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ حدیث شریف کی خدمت کو قبول فرمائے اور بقایا کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

قارئین سے التماس ہے کہ اگر کسی جگہ راقم الحروف یا کتابت کی غلطی پائیں تو مطلع کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے۔ دوسرے حصے کے لیے مفید مشوروں سے رہنمائی فرمائی جائے۔

فہرست عنوانات

تقریظ

کائنات کی اس بوقلموں محفل میں قرآن و سنت ہی ہدایت اور انسانی فلاح و بہبود کا سرچشمہ ہے۔ حضور نبی اکرم رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات و احکام کا ایک بلند پایہ اور دائمی ذخیرہ ہے۔ پس اگر کوئی بدبخت خبثِ باطنی اور جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حدیث کی اہمیت کا انکار کرتا ہے تو وہ یہ بات جان لے کہ احادیثِ مبارکہ کو تسلیم کئے بغیر ایمان حاصل نہیں ہو سکتا۔

زندگی میں پیش آنے والے تمام معاملات معاشی اور سماجی ہوں یا اقتصادی اور سیاسی، انفرادی صورت ہو یا اجتماعی، ہمیں ہر شعبے میں رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور خالقِ کائنات جلّ وعلا نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر اپنے محبوب کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا۔ ارشادِ مبارک ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء: ۸۰)

ترجمہ: "جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اُس نے اللہ کا حکم مانا۔"

گویا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ہر ارشاد اور حکم واجب التسلیم ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا بھی ہر فرمان واجب الاعتقاد والعمل ہے، ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء: ۶۴)

ترجمہ: "اور ہم نے کوئی رسول نہ بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے"

خود آقائے دوجہاں مالکِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں:۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ۔

ترجمہ" یعنی تم میں سے کوئی شخص (اُس وقت تک) مومن نہیں ہوگا، جب تک اُس کی خواہش ہمارے لائے ہوئے احکام کے تابع نہ ہو۔" (   )

اِس لئے انسان کی معاشی ناہمواریوں، اِقتصادی بدحالیوں، نظری و فکری ٹھوکروں اور رُوحانی بیماریوں سے محفوظ رہنے کا بہترین حل قرآن و سُنّت پر عمل ہی ہے۔

آج کے پُرفتن دَور میں جبکہ باطل، اپنے دندانِ آز مزید تیز کرچکا ہے۔ ہرطرف ہاہاکار مچی ہوئی ہے، پہلے سے کہیں زیادہ قرآن و سُنّت پر عمل پیدا ہونے اور تعلیماتِ اسلام پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اب باطل اور کفر کے ناسُور کی چیرپھاڑ اور گمراہی کی ژاژخائی کا جواب دینے کا بہترین اور مناسب مُوقع ہے۔ قبل اس کے کہ آج کی آرام طلبی اور کاہلی کل کا روگ بن جائے، ہمیں خوابِ خرگوش سے بیدار ہوکر باقاعدہ منظم طریقے سے اپنا لٹریچر زیادہ سے زیادہ پھیلانا چاہیئے اور اپنا نقطۂ نظر بہترین انداز سے واضح کرنا چاہیئے۔

پیشِ نظر کتاب احادیث کا بہترین اِنتخاب اور خوبصورت گلدستہ غزالئ زماں، رازئ دَوراں ضیغمِ اسلام، سیّدی وسندی حضرت علامہ سیّد احمد سعید شاہ صاحب کاظمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیار فرمایا تھا۔ انسانی زندگی میں پیش آنے والے مختلف معاملات پر صحیحین سے ایک سو احادیث یکجا فرمائیں۔

قابلِ صد تحسین ہیں حضرت علامہ مولانا محمد رفیق صاحب قادری رضوی دامت برکاتہم العالیہ، جنہوں نے اِنہی یکصد احادیثِ مبارکہ سے فی الحال ابتدائی

چالیس ۴۰ احادیث کی شرح، آسان فہم، اور دل نشین انداز میں فرمائی ہے — یہ آپ کی ایک بہترین اور زرالی و مثالی کاوش ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو باقی احادیثِ مبارکہ کی بھی شرح کرنے کی بھی توفیق انیق ارزاں فرمائے۔ آمین!

اس سے پہلے آپ مکتبہ مہریہ رضویہ، ڈسکہ کی جانب سے مختلف موضوعات پر متعدد کتب شائع فرما چکے ہیں۔ اِنشاء اللہ تعالیٰ العزیز آپ کی اس کاوش پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جائیں گے، اور ہمیشہ آپ کے فکر و تدبر اور علم و بصیرت کو یاد رکھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ آپ جیسے اہلِ علم اور صاحبِ فہم حضرات کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے تاکہ اُمتِ مُسلمہ ایسے شہ پاروں سے مستفید ہوتی رہے۔ اللہ ربّ العزّت آپ کے علم اور قلم میں مزید برکت اور وسعت عطا فرمائے۔

آمین بجاہِ سیّد المرسلین!
علیہ الصلوٰۃ والتسلیم!

محمد ریاض احمد سعیدی
جامعہ قادریہ رضویہ، مصطفےٰ آباد
سرگودھا روڈ، فیصل آباد،
۱۵؍ رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ
۱۲؍ دسمبر ۲۰۰۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیرِ نظر مجموعہ "صد احادیث" حسبِ ارشادِ محترم عالی جناب ڈاکٹر سید حامد حسن صاحب بلگرامی رئیس الجامعہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور مرتب کیا گیا ہے تاکہ جامعہ کے مبتدی طلبہ کے نصاب میں اسے داخل کیا جائے۔ اِس مجموعہ کی ترتیب میں حسبِ ذیل خصوصیات کو ملحوظ رکھا گیا ہے:

۱۔ اِس کی تمام حدیثیں بخاری اور مسلم کی متفق علیہ ہیں۔

۲۔ نہایت مختصر حدیثیں منتخب کی گئی ہیں تاکہ ان کا حفظ کرنا بھی آسان ہو۔

۳۔ تکثیرِ فوائد کے لئے مختلف و متعدد ابواب سے احادیث کا انتخاب کیا گیا ہے، مثلاً: ایمان، طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، جہاد، آداب، زُہد، اخلاق، مناقب، عنواناتِ کثیرہ سے متعلقہ احادیث جمع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کے ذہن کو ہر قسم کے مسائل سے مناسبت پیدا ہو جائے اور آگے چل کر وہ ان کے لئے مفید ثابت ہو۔

۴۔ ہر وہ صحابی جس کی حدیث اس مجموعہ میں لی گئی ہے، اس کے مختصر حالات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا فی الجملہ تعارف ہو جائے۔

۵۔ صحابہ کرام کے حالات کے علاوہ اس مجموعہ میں ایک نقشہ دکھایا گیا ہے جس میں احادیثِ مجموعہ کے روایت کرنے والے صحابہ کرام کے اسماء گرامی کُنیٰ، سنین وفات اور ہر صحابی کی روایت کی ہوئی تمام احادیث کی تعداد لکھی گئی ہے، بلکہ ہر صحابی کی روایاتِ متفق علیہا کی تعداد بھی بتا دی گئی ہے۔ نیز ہر صحابی کی جتنی حدیثیں صرف صحیح بخاری یا صرف صحیح مسلم میں ہیں، ان کی تعداد بھی لکھ دی گئی ہے جس کا جاننا فوائد سے خالی نہیں۔

۶۔ ہر حدیث کے ساتھ بخاری و مسلم کے صفحات بھی لکھ دیئے گئے ہیں اور صفحات کے نمبر لگاتے وقت اصح المطابع دہلی کی مطبوعہ صحیحین کو سامنے رکھا گیا ہے۔ بعض احادیث میں الفاظ کا تفاوت تعددِ طرق کی وجہ سے ہے جو اُن کے متفق علیہ ہونے پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

۷۔ ضروری معلومات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی اس مجموعہ کی ابتداء میں شامل کر دیا گیا ہے تاکہ طلبہ کے لئے فی الجملہ موجبِ بصیرت ہو۔ وما توفیقی الا باللّٰہ العلیّ العظیم۔

مقدمہ

طلبہ کی ابتدائی ضروری معلومات کے لئے حسبِ ذیل عنوانات پر مشتمل یہ مقدمہ مرتب کیا گیا ہے:

عنوانات فضیلتِ حدیث، ضرورتِ حدیث، حجیتِ حدیث، کتابتِ حدیث، تدوینِ حدیث، فضیلت حفظِ حدیث، علم اُصولِ حدیث کی بعض ضروری اصطلاحات، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا اجمالی تعارف، امام بخاری و امام مسلم (رحمہما اللہ تعالیٰ) کے مختصر حالات۔

فضیلتِ حدیث

۱۔ حدیث کی فضیلت کے لئے اِتنی بات کافی ہے کہ اس کے قائل صاحبِ لولاک، باعثِ تخلیقِ کائنات، حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں، جن کے فضائل و مکارم اور محامد و مدائح کا احصا کسی بشر کے لئے ممکن نہیں۔

۲۔ امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص رضائے الٰہی کا متمنی ہو اُس کے لئے میرے علم میں علمِ حدیث سے افضل کوئی علم نہیں۔ حدیث وہ علم ہے جس کی طرف لوگ اپنے کھانے پینے اور شب و روز کی تمام ضروریات میں محتاج ہیں۔

۳۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فحفظہا ووعاھا واداھا فرب حامل فقہ الیٰ من ھو افقہ منہ رواہ الشافعی والبیہقی۔

"یعنی خوشحال کرے اللہ تعالیٰ اس آدمی کو جس نے میری بات سُنی اور اس کو یاد رکھا اور دل کی گہرائیوں میں اسے محفوظ کر کے دوسرے تک پہنچایا، کیونکہ اکثر حاملِ فقہ ایسے شخص کی طرف فقہ لے جانے والا ہوتا ہے جو اس سے زیادہ فقیہ ہے۔"

۴ - اسی مضمون کی حدیثیں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ابی داؤد۔ ترمذی میں دینار و ابن حبان مروی ہیں۔

۵ - مسلمانوں میں حدیثیں پھیلانا سُنن دین کی اشاعت اور جماعت مسلمین کی عظیم خیرخواہی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کام انبیاء کرام علیہم السلام کے معمولات سے ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی احادیث روایت کرنے والوں کو اپنا خلیفہ قرار دیا ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے طبرانی نے اوسط میں روایت کی۔

۶ - امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تدریب الراوی میں فرمایا کہ علم حدیث اشرف العلوم ہے کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ کے ساتھ تعلق اور رابطہ کا موجب ہے۔ اس علم میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے بحث کی جاتی ہے۔

۷ - اس کے بعد اشرف العلوم ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ باقی علوم شرعیہ کے لئے اس کی طرف ضرورت واقع ہوتی ہے۔ علمِ فقہ میں اس کی احتیاج ظاہر ہے اور علم تفسیر میں حدیث کی ضرورت اس لئے ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل پر نظر نہ کی جائے، کلامِ الٰہی سے مُرادِ خداوندی ظاہر نہیں ہوتی یعنی قرآن کا علم حدیث کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ معنی کو بغیر جانے عمل ممکن نہیں، اس لئے تفسیرِ قرآن اور عمل بالقرآن دونوں کا مدار حدیث پر ہے۔ موقوف علیہ موقوف پر مقدم ہوتا ہے، لہٰذا علمِ حدیث علمِ تفسیر پر مقدم اور اس سے اشرف ہے۔

۸ - شرافت و فضیلت علمِ حدیث کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہر علم کی فضیلت اس کے موضوع کی فضیلت کے مطابق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ علمِ حدیث کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ ہے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم افضل الخلق ہیں، لہٰذا علمِ حدیث بھی افضل العلوم قرار پائے گا۔

ضرورتِ حدیث

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید ایسی جامع کتاب ہے جس میں عقائد و اعمال، عبادات و اخلاق، حلت و حرمت، کے احکام اور بنی نوع انسان کی تمام جسمانی اور روحانی ضرورتوں کے پورا ہونے اور دونوں جہان کی فوز و فلاح حاصل کرنے کے اصول موجود ہیں، لیکن یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ ان اصول کی ایسی تشریحات جو پیش آنے والی ضروریات کے تمام جزئیات پر منطبق ہو جائیں، قرآن مجید میں مذکور نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک وہ تشریحات سامنے نہ آئیں اس وقت تک قرآنی اصول کے مطابق عمل نہیں ہو سکتا اور کوئی شخص اپنی زندگی کو اصولِ قرآنیہ کے مطابق بسر نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کو بحیثیتِ مسلمان ہونے کے حدیث کی اشد ضرورت ہے۔

استدراک

اگر اس مقام پر یہ شبہ وارد کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو کتابِ مفصل قرار دیا ہے اور اس کے حق میں تبیانا لکل شیئ فرمایا ہے اور ایسی صورت میں یہ کہنا کہ اصولِ قرآنیہ کے لئے قرآن کے علاوہ کسی تشریح کی ضرورت ہے، کیونکر صحیح ہوگا؟ تو ہم جواباً عرض کریں گے کہ: قرآن مجید میں جہاں تبیان و تفصیل اور بیان وغیرہ کے الفاظ وارد ہیں، اُن کا یہ مطلب نہیں کہ اصولِ قرآن کی وہ تمام تر تشریحات قرآن مجید میں بیان کر دی گئی ہیں، جو ہر شخص کے لئے قیامت تک پیش آنے والے تمام واقعات کی جزئیات کو حاوی ہوں، کیونکہ یہ مطلب قرآن مجید کی روشنی میں غلط ہے۔ دیکھئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا اور نماز اور زکوٰۃ کے بنیادی اُصول بھی قرآن مجید ہی میں بیان فرمائے، لیکن ان اصول کی تشریحات مثلاً ارکانِ صلوٰۃ کی ترتیب، تعدادِ رکعت، مقادیرِ زکوٰۃ اور اُن کے شرائط و دیگر احکامِ تفصیلیہ قرآن مجید میں کہیں مذکور نہیں۔ اب اگر تفصیلا لکل شیئ اور تبیانا لکل شیئ کا یہی مطلب لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید ہی میں تمام مسائلِ جزئیہ کی تفصیلات و تشریحات کھلے طور پر بیان فرما دی ہیں، تو یہ بات بالکل خلافِ واقعہ ہوگی، جو کذبِ محض ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے

قطعاً پاک ہے معلوم ہوا کہ تفصیل و تبیان سے احکامِ جزئیہ کی لفظی تفصیل و تشریح مراد نہیں، بلکہ وہ معنوی تشریح مُراد ہے؟ جو الفاظِ قرآن کے نزول کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو اُن کے نورِ نبوت کی روشنی میں عطا فرمائی۔ قرآن مجید کی آیات مخاطب کے لئے اس قدر روشن، مفصّل اور واضح ہیں جس کے بارے میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا نہیں ہوتا اور جس کو اس کلامِ پاک کا مخاطب کیا گیا ہے، وہ مکمل شرح و بسط کے ساتھ اسے سمجھتا ہے۔

قرآن کا مخاطب

قرآنِ کریم کا بالواسطہ مخاطب ہر وہ شخص ہے جو احکامِ خداوندی کا مکلف ہے اور بلا واسطہ اس کے مخاطب صرف حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم ہیں۔ جس مخاطب کے لئے ہم نے قرآن مجید کو "تبیاناً لکل شیئ" مانا ہے، اس سے ہماری مراد مخاطب بلا واسطہ ہے۔ ہمارے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو اصول بیان فرمائے وہ سب بلکہ جملہ آیات قرآنیہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں بیان و تبیان اور تفصیل کا حکم رکھتی ہیں اور قرآن مجید کا ایک لفظ بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس طرح نازل نہیں ہوا کہ اس کو سُن کر مرادِ الٰہی کے سمجھنے میں رسُول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو کسی قسم کا کوئی اشتباہ واقع ہوا ہو۔ یہ نہیں کہ ہر شخص قرآن سُن کر مرادِ الٰہی کی تفصیلات و تشریحات کو بخوبی سمجھ لے، بلکہ دوسروں کے لئے ان تشریحات کا سمجھانا اور کتاب اللہ کی تعلیم دینا رسُول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کا منصب ہے اسی لئے ارشاد فرمایا

یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔

تلاوتِ آیات کے بعد تعلیم کتاب کے معنی صرف یہ ہیں کہ اصولِ قرآنیہ اور آیاتِ کتاب کی تفصیل و تشریح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خاص ہے۔

نیز ارشاد فرمایا:

وَاَنزلنا الیك الذّکر لِتبیّن لِلنّاس مانزل الیھم۔ (نحل)

ترجمہ: "اور ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تاکہ آپ بیان کر دیں۔"

لوگوں کے لئے اس چیز کو جو اُن کی طرف نازل کی گئی ہے۔ جب ذکر اور ما نزل الیہم سے کتاب اللہ ہی مراد ہے، جیسے کتاب مفصل اور تبیان لکل شیئ فرمایا گیا، تو مفصل کی تفصیل اور تبیان کا بیان کیونکر ممکن ہوگا۔ جو چیز ہر شے کا بیان کرنے والی ہو۔ اس کا بیان تحصیل حاصل نہیں، تو اور کیا ہے؟ ثابت ہوا کہ قرآن مجید کا تبیانا لکل شیئ اور کتاب مفصل ہونا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خصوصیات سے ہے۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن مجید کا دوسروں کے لئے تبیان و تفصیل نہ ہونا اس لئے نہیں کہ قرآن ناقص ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ اس نورِ نبوت سے محروم ہیں، جس کا ہونا تبیانا لکل شیئ کے لئے ضروری ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

آیۂ قرآنیہ: وَھُوَ الّذی انزل الیکم الکتاب مفصلا۔ میں لفظ الیکم سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن سب کے لئے مفصل و مبین ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بالواسطہ مخاطبین مراد ہیں جو ان لوگوں میں شامل ہیں، جن کے متعلق تبین للناس ما انزل الیھم فرمایا گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کے حق میں کتاب کا مفصل ہونا بلا واسطہ نہیں، بلکہ بواسطۂ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے، خلاصہ یہ کہ ان آیات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ تعلیم کتاب اور ما نزل الیھم کا بیان وظائف نبوت سے ہے، اور اسی بیان اور تعلیم اور تشریح کو سنت اور حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی ضرورت اس قدر اہم ہے کہ اس کے بغیر قرآن کا سمجھنا ممکن ہے نہ اس پر عمل کرنا۔

حجیّتِ حدیث

اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو واجب القبول اور واجب العمل قرار دیا، وہی ہمارے لئے حجتِ شرعیہ ہے، قرآن مجید میں مذکور ہے: مَا اٰتٰکُمُ الرّسُول فخذ دہ وما نھاکم عنہ فانتھوا۔ "رسول تمہیں جو کچھ دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے وہ روک دیں، رُک جاؤ۔"

عہدِ رسالت سے لے کر آج تک امّتِ مسلمہ اس امر پر متفق ہے کہ اس آیت میں لفظ "ما" اپنے عموم پر ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے تمام ارشادات شامل ہیں۔ بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس امِّ یعقوب آئیں اور انہوں نے دریافت کیا کہ آپ نے گودنے اور گودوانے والی اور پیشانی کے بال اکھاڑنے والی اور اپنے دانتوں کو کشادہ کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں اس پر کیوں لعنت نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے لعنت فرمائی، اور جو کتاب اللہ میں ملعون ہے۔ امِّ یعقوب نے کہا: میں نے سارا قرآن پڑھا ہے، اس میں کہیں میں نے وہ بات نہیں پائی، جو آپ فرما رہے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر تم اسے پڑھتیں، تو ضرور پالیتیں۔ کیا تم نے قرآن کریم میں یہ نہیں پڑھا کہ ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا۔ امِّ یعقوب بولیں کیوں نہیں، یہ آیت تو میں نے قرآن میں ضرور پڑھی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کاموں سے منع فرمایا ہے، یعنی وہ ما نھاکم عنہ میں داخل ہیں اور بحکمِ خداوندی فانتھوا ان سے بچنا ضروری ہے۔ دیکھئے بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۱۵، مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۰۵ اصح المطابع۔

معلوم ہوا کہ عہدِ رسالت ہی سے اس آیۂ کریمہ کے یہ معنی سمجھے گئے تھے کہ کسی حکمِ شرعی کی دلیل قرآن مجید کے صریح الفاظ ہی نہیں، بلکہ رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے ارشادات بھی حجتِ شرعیہ ہیں۔

نیز ارشادِ ربّانی ہے: فلا وربّک لا یؤمنون حتّٰی یحکّموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت و یسلّموا تسلیما۔ اس آیت کریمہ میں واضح طور پر موجود ہے کہ ہر اختلاف میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو حَکَم بنانا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہر فیصلہ

کو بدل و جان تسلیم کرنا مدارِ ایمان ہے "مِمّا قضیت" میں "ما" اپنے عموم پر ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہر فیصلہ حضور (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی سنت اور حدیث ہے جسے تسلیم کر لینے پر اللہ تعالیٰ نے ہمارے مومن ہونے کو موقوف فرمایا جو چیز ایمان کا موقوف علیہ ہو، اس کے حجت ہونے میں کسی مومن کو کلام نہیں ہو سکتا ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم۔ یعنی ان لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے امر کی مخالفت کرتے ہیں، یہ کہ انہیں کوئی فتنہ پہنچے یا وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے امر کی مخالفت کرنے والوں کو ڈرانا اور ان کے حق میں وعید شدید نازل فرمانا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ امر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قولی ہو یا فعلی بہر صورت واجب القبول اور حجتِ شرعیہ ہے۔

کتابتِ حدیث

یہ درست ہے کہ عہدِ صحابہ میں احادیث کی تدوین کتابوں کی صورت میں نہیں ہوئی، بلکہ اُن کے قلوب و صدور میں یہ خزانہ محفوظ تھا، اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عہدِ رسالت میں مطلقاً کتابتِ حدیث نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیثِ کثیرہ سے زمانۂ اقدس میں کتابتِ حدیث ثابت ہے، بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو حدیثیں لکھنے کا حکم فرمایا۔ ابوداؤد میں ہے: عن عبد اللہ بن عمرو قال کنت اکتب کل شیئ اسمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارید حفظہ فنھتنی قریش وقالوا أتکتب کل شیئ تسمعہ ورسول اللہ

صلّی اللہ علیہ وسلّم بشر یتکلّم فی الغضب والرضا فامسکت عن الکتابۃ فذکرت ذلک الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فاوماء باصبعہ الیٰ فیہ فقال اکتب فوالّذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا الحق - (ابوداؤد، جلد ۲ صفحہ ۵۱۳، ۵۱۴)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں میں جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ہر سُنی ہوئی حدیث کو یاد کرنے کے لئے لکھ لیا کرتا تھا۔ قریش کے چند لوگوں نے مجھے روکا اور کہا کہ تم رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے ہر سُنی ہوئی بات کو لکھ لیتے ہو، حالانکہ رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم بشر ہیں، وہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں کلام فرماتے ہیں (قریش کی یہ بات سُن کر) میں کتابتِ حدیث سے رک گیا اور میں نے یہ بات رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی خدمت میں عرض کی، حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمایا، سب کچھ لکھ لیا کرو اور اپنی مبارک انگلی سے اپنے دہنِ اقدس کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

"جس ذات پاک کے قبضۂ قدرت میں میری جانِ مقدس ہے، میں اُس کی قسم کھا کر فرماتا ہوں کہ اس دہن مبارک سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اس حدیث مبارک میں کتابت کا صریح حکم وارد ہے اور جن روایات میں لَا تکتبوا عنّی سِوی القرآن" آیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ اور کچھ نہ لکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن غیر قرآن کے ساتھ مخلوط ہو جائے ۔ معلوم ہوا کہ نفسِ کتابتِ حدیث عہدِ رسالت میں ثابت ہے ۔ البتہ کتابی صورت میں تدوینِ حدیث اس وقت نہیں ہوئی۔"

حضرات صحابہ کرام و کبار تابعین کے عہد میں حدیث

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ نیز فرمایا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول اس کے علاوہ بار بار اتباع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم دیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے امر کی مخالفت کرنے والوں کو عذاب الیم سے ڈرایا گیا۔ ان تمام ارشادات ربانی کا مفاد یہ ہے کہ صحابہ کرام سے لے کر قیامت تک ہر مومن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال اور احوال مقدسہ کو پوری طرح پیش نظر رکھے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ وہ اقوال و افعال و احوال مبارکہ محفوظ ہوں۔

اسی لئے تقریباً دس ہزار صحابہ کرام علیہم الرضوان نے احادیث مقدسہ اپنے سینوں میں ضبط کر کے تابعین کو پہنچائیں اور تابعین نے تبع تابعین کو اور اسی طرح سنن مقدسہ و احادیث کریمہ کی نعمت عظمیٰ ہم تک پہنچی۔

ان صحابہ کرام میں جن حضرات کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ انہوں نے اکثار فی الروایۃ سے کام لیا، تو وہ خطا میں واقع ہو جائیں گے۔ انہوں نے قلت روایت کو اختیار کیا اور جنہیں یہ اندیشہ نہ تھا، انہوں نے اکثار فی الروایۃ پر عمل کیا۔ درحقیقت ہر دو گروہ کا طرز عمل اس حکمت ایزدی کے موافق تھا کہ خاصان بارگاہ رسالت روایت حدیث میں محتاط رہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث مقدسہ کی تبلیغ بھی ہو جائے۔

مقلین صحابہ کرام میں خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ متوفی ۱۳ھ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، متوفی ۲۳ھ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، متوفی ۳۵ھ

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم، متوفی ۴۰ھ

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مکثرین صحابہ کرام میں سے بعض کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

۱- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۵۷ھ

۲- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، متوفی ۶۸ھ

۳- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، متوفی ۷۰ھ

۴- حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما، متوفی ۷۴ھ

۵- حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما، متوفی ۹۳ھ

۶- حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، متوفیہ ۴۹، ۵۷، ۵۸، ۵۹ھ

۷- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، متوفی ۴۶، ۷۴، ۶۴ھ

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے روایتِ حدیث میں سب سے اعلیٰ مرتبہ پانے والے تابعین کرام میں سے بعض کے اسماء گرامی حسبِ ذیل ہیں:

۱- حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۹۳ھ

۲- حضرت حسن بصری، رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۱۱۰ھ

۳- حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۱۱۰ھ

۴- حضرت عروہ بن زبیر، رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۹۴ھ

۵- سیدنا علی بن الحسین (زین العابدین سجاد) علیہما السلام، متوفی ۹۴ھ

۶- حضرت مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۱۰۴ھ

۷- حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر علیہ الرحمہ متوفی ۱۰۶ھ

۸- حضرت ہمام بن منبہ رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۱۳۱ھ

۹- حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رحمہم اللہ تعالیٰ، متوفی ۱۰۶ھ

۱۰- حضرت نافع مولیٰ ابن عمر رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۱۱۷ھ؛

۱۱- حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۹۵ھ

۱۲- حضرت ابن شہاب زہری رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی سنہ ۱۲۴ھ

۱۳- حضرت عکرمہ مولی ابن عباس رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی سنہ ۱۰۵ھ

۱۴- حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی سنہ ۱۱۷ھ

۱۵- حضرت قتادہ بن دعامہ، رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی سنہ ۱۱۷ھ

۱۶- حضرت عامر الشعبی، رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی سنہ ۱۰۴ھ

۱۷- حضرت ابراہیم نخعی، رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی سنہ ۹۶ھ

۱۸- حضرت یزید بن ابی حبیب رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی سنہ ۱۲۸ھ

جن تابعین کرام نے صحابہ کرام علیہم الرضوان سے احادیثِ نبویہ کو روایت کیا۔ وہ مختلف شہروں اور مرکزی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، مثلاً مدینہ منورہ میں چار سو چوراسی تابعین کے حالات طبقات ابنِ سعد وغیرہ کتب تاریخ و سیر میں ملتے ہیں۔ اسی طرح مکہ مکرمہ میں ایک سو اکتیس اور کوفہ میں چار سو تیرہ، بصرہ میں ایک سو چونسٹھ تابعین کرام کے اعداد و شمار، ان کے مفصل حالات بالخصوص علم حدیث سے ان کے شغف کا تذکرہ کتبِ فن میں موجود ہے۔

تدوینِ حدیث

جب صحابہ کرام دُنیا سے بکثرت تشریف لے جانے لگے اور تابعین کرام کے جس مقدس گروہ کو سُننِ کریمہ و احادیثِ نبویہ کی یہ امانت پہنچی تھی، اس کے بعض اہلِ بصیرت حضرات کو اس زمانہ کے حالات کے پیشِ نظر یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اگر کتابی صورت میں تدوینِ احادیث کا کام نہ کیا گیا تو ہم اس نعمتِ عظمٰی سے محروم ہو جائیں گے، اس لئے انہوں نے کتابی صورت میں حدیثیں جمع کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تحریک سے تدوینِ حدیث کا باقاعدہ کام شروع ہوا۔ ان مؤلفین میں ربیع بن صبیح متوفی سنہ ۱۶۰ھ موسیٰ بن عقبہ متوفی سنہ ۱۴۱ھ امام مالک متوفی سنہ ۱۷۹ھ ابن جریج سنہ ۱۵۶ھ

امام ابو یوسف، متوفی ۱۸۲ھ، امام محمد، متوفی ۱۸۹ھ، امام اوزاعی متوفی ۱۵۶ھ امام سفیان ثوری، متوفی ۱۶۱ھ، حماد بن سلمہ بن دینار، متوفی ۱۷۶ھ امام اعظم ابو حنیفہ متوفی ۱۵۰ھ اور ان کے علاوہ دیگر محدثین کبار رحمہم اللہ تعالیٰ نے کتابوں کی صورت میں احادیث جمع کیں اور دوسری صدی کے اواخر تک کتب احادیث کے مجموعے بکثرت مرتب ہو گئے۔

تیسری صدی کے اوائل میں مسدد بن مسرہد، متوفی ۲۱۸ھ، اسد بن موسی البصری متوفی ۲۱۲ھ، نعیم بن حماد الخزاعی، متوفی ۲۲۸ھ، امام احمد بن حنبل، متوفی ۲۴۱ھ اسحٰق بن راہویہ، متوفی ۲۳۸ھ، عثمان بن ابی شیبہ، متوفی ۲۳۹ھ ابوبکر بن ابی شیبہ ۲۳۵ھ نے مختلف موضوعات، مثلاً سیرت، احکام، مغازی پر احادیث کے مجموعے مرتب کئے۔ ان میں سے بعض مؤلفین کی تصانیف موجود نہیں، لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ضائع ہو گئیں، بلکہ ان کا پورا مواد ان کے ہم عصروں اور ان کے بعد آنے والوں نے اپنی کتابوں میں شامل کر لیا اور لوگ اُن سے بے نیاز ہوتے چلے گئے۔ اسی صدی میں امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ، امام مسلم، متوفی ۲۶۱ھ، امام ابو داؤد، متوفی ۲۷۵ھ، امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، امام نسائی ۳۰۳ھ، امام ابن ماجہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) متوفی ۲۷۳ھ نے صحاح، جوامع اور سنن تالیف فرمائیں اور تدوینِ حدیث کا کام نہایت خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ہم ان اجلّہ صحابۂ کرام و تابعین عظام و اجلّہ محدثین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اس احسانِ عظیم کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کو کتابی صورت میں مدوّن کر کے امتِ مسلمہ کے لئے ہدایت کا ایک روشن مینار قائم کر دیا اور حق کو باطل سے ممتاز کر کے سننِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والتحیۃ کے انوار سے ہر مومن کے دل کو منوّر فرمایا۔ فجزاھم اللہ عنّا وعن سائر المسلمین، آمین!

فضیلت حفظِ حدیث

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیثیں یاد کرنے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من حفظ امتی اربعین حدیثا فی امر دینھا بعثہ اللہ فقیھا وکنت لہٗ شافعا یوم القیمۃ وشھیدا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ نے "اشعۃ اللمعات" میں اس حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے فرمایا: کسے کہ یاد گیرد وبرساند امتِ مرا چہل حدیث از کارِ دین ایشاں، برانگیزد اورا خدائے تعالیٰ روزِ قیامت در زمرۂ فقہاء، وباشم من مراورا روزِ قیامت شفاعت کنندہ مرگناہان اورا وگواہی برطاعت او۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱، ص۱۸۶)

"یعنی جو شخص یاد کرے اور پہنچائے میری امت کو چالیس حدیثیں جو ان کے امر دین سے ہوں، اٹھائے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن فقہاء کے زمرہ میں اور میں اس کے لئے اس کے گناہوں کی شفاعت کرنے والا اور اس کی اطاعت پر گواہی دینے والا ہوں۔"

ابنِ عدی نے "کامل" میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: من حفظ علیٰ امتی اربعین حدیثا من السنۃ کنت لہٗ شفیعا وشھیدا یوم القیمۃ۔ نیز ابن نجار نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: من حفظ علیٰ امتی اربعین حدیثا من سنتی ادخلتہ یوم القیمۃ فی شفاعتی۔ (دیکھئے جامع صغیر للسیوطی، جلد ۲، ص۱۶۹)

بیہقی کی روایت کے متعلق امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: ھٰذا متن مشھور فیما بین الناس ولیس لہٗ اسناد صحیح، اور امام نووی علیہ الرحمۃ نے اپنی اربعین میں کہا

کہ حدیث ضعیف ہے، لیکن اس کے طرق متعددہ ہیں جس کی وجہ سے اس حدیث میں قوت پیدا ہو گئی۔ (اشعۃ اللمعات جلد ۱، صفحہ ۱۸۷) اور روایت ابن عباس کو امام سیوطی نے ضعیف قرار دیا، اور حدیث ابی سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصحیح فرمائی۔ (جامع صغیر للسیوطی ج ۲ صفحہ ۱۹۶) اس میں شک نہیں کہ ائمہ کبار نے ان حدیثوں کو تلقی بالقبول کے ساتھ اور ان پر عمل کرکے ان کے مقبول اور حجت ہونے کو تسلیم کر لیا۔ کیونکہ علماء کبار نے سلف و خلف میں اربعینات تصنیف کیں، اور وہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت اور مغفرت کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شہادت کے امیدوار رہے۔ قطع نظر اس کے کہ ضعاف فضائل اعمال میں مقبول ہیں۔ اس امر میں کسی کو شک وشبہ کے لئے گنجائش باقی نہیں کہ احادیث مذکورہ قابل قبول اور حجت شرعیہ ہیں، کیونکہ یہ تینوں حدیثیں ایک دوسرے کے لئے شاہد ہیں اور حدیث ابی سعید خدری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے صحیح ہونے کی تصریح تو خود امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے فرما دی ہے۔ خلاصہ یہ کہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یاد کرنا اور انہیں مسلمانوں تک پہنچانا ایسی فضیلت اور اجر و ثواب کا موجب ہے۔ ایسا شخص قیامت کے دن فقہاء کے گروہ میں اٹھایا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کے شفیع اور شہید ہوں گے، بشرطیکہ ایمان اور اخلاص کامل کے ساتھ یہ عمل ہوا اور مرتے دم تک کوئی ایسا گناہ سرزد نہ ہو جس سے یہ نیکی ضائع ہو جائے، کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انما الاعمال بالخواتیم۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان، اخلاص اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے، آمین!

علم اصول حدیث کی بعض ضروری اصطلاحات

حدیث: جمہور محدثین کرام کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قول و فعل و تقریر حدیث ہے۔

تقریر: اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں کوئی بات کہی جائے یا کوئی کام کیا جائے اور اس کے جاننے کے باوجود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس پر انکار نہ فرمائیں، بلکہ سکوت فرما کر اس کو برقرار رکھیں۔ بعض محدثین کے نزدیک صحابی و تابعی کے قول و فعل اور تقریر کو بھی حدیث کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، صحابی، تابعی کے اعتبار سے حدیث کی تین قسمیں ہو گئیں۔

۱۔ **حدیث مرفوع:** وہ قول و فعل اور تقریر جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر منتہی ہو۔
۲۔ **حدیث موقوف:** جو قول و فعل اور تقریر صحابی تک پہنچے۔
۳۔ **حدیث مقطوع:** جو قول و فعل اور تقریر تابعی پہ منتہی ہو۔

حدیث، اثر اور خبر: بعض محدثین کے نزدیک مرفوع اور موقوف کو حدیث کہتے ہیں، اور مقطوع کو ان کے نزدیک اثر بھی کہا جاتا ہے اور بعض اوقات حدیث مرفوع کو بھی اثر کہہ دیتے ہیں اور لفظ خبر حدیث کا مترادف (ہم معنیٰ) ہے، لیکن بعض محدثین کے نزدیک حدیث انہیں امور کو کہا جاتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، صحابی، اور تابعی سے منقول ہوں، اور خبر ان کے نزدیک گزشتہ زمانے کے تاریخی حالات اور واقعات کو کہتے ہیں۔ علم حدیث جاننے والے اور اس کی تعلیم میں شغف رکھنے والے کو محدث کہا جاتا ہے، اور تاریخ و واقعات گزشتہ سے شغف رکھنے والے کو اخباری کہا جاتا ہے۔

سنت طریقہ کو کہتے ہیں اور لسان شرع میں طریقہ مسلوکہ فی الدین کا نام سنت ہے، یعنی امور دینیہ میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جاری کیا ہوا طریقہ سنت ہے، خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا طریقہ سنت نبوی کہلاتا ہے۔ محدثین صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کے پسندیدہ طریقوں کو بھی سنت کہتے ہیں۔

سند: ناقلین و رُواۃ حدیث کو سند کہتے ہیں، اسناد بھی سند کے معنی میں ہے لیکن بسا اوقات ذکرِ سند کو اسناد کہا جاتا ہے۔

متن: منتہائے سند ہے۔

متصل: وہ حدیث جس کے سلسلۂ سند میں کوئی اِنقطاع نہ ہو۔

منقطع: وہ حدیث جس کی سند سے کوئی راوی ساقط ہو جائے۔

مُعضل: وہ حدیث جس کی سند سے دو یا دو سے زائد راوی پے درپے ساقط ہو گئے ہوں۔

مرسل: وہ حدیث جس میں تابعی سے اوپر کا راوی ساقط ہو۔ اسی طرح اسقاط راوی کے ساتھ روایت کو ارسال کہتے ہیں۔

معلق: جس حدیث کی سند حذف کر دی گئی ہو، یا ابتدائے سند میں کوئی راوی مذکور نہ ہو۔

تعدادِ رُواۃ کے اعتبار سے حدیث کی چار قسمیں ہیں

متواتر: جس کے راوی اوّل سے آخر تک ہر طبقہ میں اتنے کثیر ہوں جن کا جھوٹ پر جمع ہونا عادتاً محال ہو، ان کی تعداد میں اختلاف ہے، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ حدیث کا تعلق حِس اور مشاہدہ سے ہو۔

خبرِ مشہور: وہ ہے، جس کے راوی ہر طبقہ میں کم از کم تین ہوں۔

عزیز: وہ حدیث ہے، جس کے ہر طبقہ میں دو راوی پائے جائیں۔

غریب وہ حدیث ہے جس کی سند میں ہر جگہ یا کسی ایک جگہ صرف ایک راوی ہو، اُس کو فرد بھی کہتے ہیں۔ فرد کی دو قسمیں ہیں، فردِ مُطلق، فردِ نسبی۔

فردِ مُطلق: جس کی سند میں ہر جگہ ایک ہی راوی ہو۔

فردِ نسبی: جس کی سند میں بعض جگہ صرف ایک راوی ہو۔

اَوصافِ رواۃ کے اعتبار سے حدیث کی تقسیم

صحیح: جس کی سند متصل ہو، اس کے تمام راوی عادل وضابط ہوں اور اس میں علتِ قادحہ وشذوذ نہ ہو۔

حسن: جس کی سند میں صحیح کے تمام شرائط پائے جائیں، لیکن اس کے راویوں میں صفتِ ضبط کم ہو۔ صحیح اور حسن ہر ایک کی دو قسمیں ہیں: لذاتہٖ اور لغیرہٖ۔

صحیح لذاتہٖ: جس کی سند متصل ہو اور اس کے رواۃ میں صفاتِ معتبرہ فی الصحیح علیٰ درجہ الکمال پائی جائیں۔

صحیح لغیرہٖ: جس کے راویوں میں صفاتِ مذکورہ کمی کے ساتھ پائی جائیں لیکن طرقِ متعددہ سے مذکورہ کمی پوری ہو جائے۔

حسن لذاتہٖ: جس کے راویوں میں صفتِ ضبط ناقص ہو اور اس کمی کو پورا کرنے والا کوئی امر نہ پایا جائے۔

حدیثِ ضعیف: وہ ہے جس کے رواۃ میں صفاتِ معتبرہ فی الصحیح والحسن سب یا بعض نہ پائی جائیں اور شذوذ یا نکارت یا کسی علتِ خفیہ کی وجہ سے اس کے راوی کی مذمت کی گئی ہو۔ اس اعتبار سے اس کے متعدد اقسام ہیں جو بخوفِ طوالت ذکر نہیں کئے گئے۔

حسن لغیرہٖ: جس حدیثِ ضعیف کے ضعف کا تدارک تعددِ طرق سے ہو جائے۔

شاذ ومحفوظ: اگر ثقہ راوی کسی ایسے راوی کے خلاف روایت کرے جو اس سے ارجح اور زیادہ ثقہ ہے، تو اس کی حدیث کو شاذ کہیں گے اور اس کے مقابل کو محفوظ۔

منکر ومعروف: اگر ضعیف راوی نے قوی راوی کے خلاف روایت کی تو اس کی حدیث کو منکر اور اُس کے مقابل کو معروف کہتے ہیں۔

متابع: جس حدیث کو کوئی راوی کسی دوسرے راوی کے موافق روایت کرے، بشرطیکہ دونوں حدیثیں ایک ہی صحابی کی مسند ہوں، تو اس موافق کو متابع اور موافقت کو متابعت کہتے ہیں۔

شاہد: اگر کسی دوسرے صحابی سے ایسی حدیث مروی ہو تو اُس کو شاہد کہتے ہیں۔

موضوع: وہ ہے جس کے راوی کا کذب کسی حدیثِ نبوی میں ثابت ہو گیا ہو۔

متروک: وہ ہے جس کا راوی متہم بالکذب ہو۔

متفق علیہ: وہ حدیث ہے جسے امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی صحیحین میں ایک ہی صحابی سے روایت کیا ہو۔

اَحادیثِ صحیحہ اور ان کے مراتب و درجات میں تفاوت

"علم اصولِ حدیث کی بعض ضروری اصطلاحات" کے تحت حدیثِ صحیح کی تعریف میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ حدیثِ صحیح وہ ہے جس کی سند متصل ہو اور اُس کے سب راوی ثقہ، عادل اور ضابط ہوں، اس میں شذوذ اور علتِ قادحہ نہ پائی جائے، لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام صحیح حدیثیں قوت و صحت میں مساوی ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ حفظ و ضبط اور عدالت کے مراتب میں اعلیٰ و ادنیٰ کا تفاوت ہے۔ اِس طرح محدثین کے شرائط میں تشدد و تساہل کا فرق ہے۔ اسی اختلاف و تفاوت کے پیشِ نظر علماء نے احادیثِ صحیحہ کی قوت و صحت کا معیار قائم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل ضابطہ بیان کیا ہے:

۱۔ قوت و صحت میں سب سے اعلیٰ درجہ کی وہ احادیث ہیں جو بخاری و مسلم دونوں کی متفق علیہ ہیں۔

۲۔ ان کے بعد وہ حدیثیں ہیں جو صرف صحیح بخاری میں ہیں۔

۳- پھر وہ جو "مسلم" میں ہیں۔
۴- پھر وہ جو شرائطِ شیخین کے موافق ہیں۔
۵- ان کے بعد وہ حدیثیں، جو صرف امام بخاری کی شرط پر ہیں۔
۶- پھر وہ جو صرف امام مسلم کی شرط کے موافق ہیں۔
۷- ان کے بعد ان احادیث کا درجہ ہے، جنہیں بقیہ اصحابِ صحاح ستہ نے اپنی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا ہو۔

علمِ حدیث میں مشغول ہونے والوں کی پانچ قسمیں ہیں

۱- **طالب:** وہ مبتدی ہے جو علمِ حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہو۔
۲- **محدّث:** جو علمِ حدیث کی تعلیم دینے والا ہو
۳- **حافظ:** وہ محدّث جو ایک لاکھ حدیث کے اسانید و متون کا عالم ہو۔
۴- **حجّت:** جس عالمِ حدیث کو تین لاکھ حدیثیں یاد ہوں۔
۵- **حاکم:** وہ محدّث جسے جملہ احادیث مرویہ اسانید و متون کے ساتھ یاد ہوں اور وہ راویوں کے پورے حالات جانتا ہو۔

بعض اقسامِ کتبِ حدیث

(۱) صحیح (۲) جامع (۳) سُنن (۴) مُسند (۵) معجم (۶) مستخرج، (۷) مُستدرک (۸) جزء، (۹) مفرد (۱۰) اربعین (۱۱) مراسیل، (۱۲) امالی (۱۳) اطراف۔

صحیح: وہ کتاب ہے، جس میں احادیثِ صحیحہ کے وارد کرنے کا التزام کیا گیا ہو جیسے کہ صحیح بخاری وغیرہ۔ جن کتبِ صحاح میں بعض غیر صحیح حدیثیں ہیں، انہیں تغلیباً صحیح کہا جاتا ہے۔

جامع: وہ کتاب ہے جو آٹھ قسم کی حدیثوں پر مشتمل ہو، وہ اقسام ثمانیہ اس شعر میں مذکور ہیں۔
سِیَر، آداب، تفسیر و عقائد، فِتَن، اشراط، احکام و مناقب۔ جیسے جامع صحیح بخاری و جامع ترمذی
سُنن: وہ کتاب جس میں ابواب فقہیہ کی ترتیب پر احادیثِ احکام جمع کی جائیں،
جیسے سُنن ابی داؤد وغیرہ۔
مُسند: وہ کتاب، جس میں صحابہ کرام کی ترتیب کے موافق احادیث ہوں جیسے
مُسند امام احمد وغیرہ۔
معجم: وہ کتاب جس میں شیوخ کی ترتیب پر احادیث ہوں، جیسے معجم للطبرانی۔
مُستخرج: وہ کتاب، جس میں حدیث کی کسی دوسری کتاب کی احادیث کے
اثبات کے لئے احادیث جمع کی جائیں، جیسے "مستخرج ابی نعیم علی البخاری" وغیرہ۔
مُستدرک: وہ کتاب جس میں حدیث کی کسی کتاب پر ایسی حدیثوں کو زائد کیا جائے جو
اس کتاب میں قابلِ ذکر ہونے کے باوجود مذکور نہ ہوں، جیسے "مستدرک للحاکم"۔
جُزء: وہ کتاب ہے جس میں صرف ایک مسئلہ کی احادیث جمع ہوں،
"جزء القراۃ للبخاری"۔
مُفرد: وہ کتاب ہے جس میں ایک شخص کی احادیث جمع ہوں، جیسے،
"مُسند ابی ہریرہ لابراہیم بن العسکری"۔
اربعین: وہ کتاب جس میں چالیس حدیثیں جمع کی گئی ہوں جیسے "اربعین نووی"۔
مراسیل: وہ کتاب، جس میں مرسل حدیثیں جمع کی گئی ہوں، جیسے "مراسیل ابی داؤد"۔
امالی: وہ کتاب جس میں کسی محدث عالم کے اپنے تلامذہ کے سامنے بیان کئے ہوئے
مطالب حدیث اور اس کے نکات جمع ہوں، جیسے امالی حافظ ابن حجر عسقلانی"
اطراف: وہ کتاب ہے جس میں کسی معین کتاب کی احادیث کے اطراف
جمع کئے گئے ہوں، جیسے" اطراف للمزی۔"

حَدثنا، اخبرنا، اَنبأنا کا فرق

ان تمام الفاظ میں امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک کوئی فرق نہیں لیکن امام مسلم اور دیگر ائمہ متاخرین کے نزدیک ان میں یہ فرق ہے کہ حدثنا اس وقت کہا جائے گا، جب راوی حدیث شیخ کے الفاظ سُنے، یعنی شیخ پڑھتا ہوا اور شاگرد سنتا ہوا اور اگر کسی شاگرد نے شیخ پر قرأت کی اور شیخ نے سُنا تو اس صورت میں اخبرنا وانبانا کہا جائے گا۔ اگر شیخ کی قرأت سُننے والا تنہا ایک شخص نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ دوسرا بھی شامل ہو تو وہ حدثنا کہے گا اور اگر تنہا ہے تو حدثنی سے تعبیر کرے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اگر کئی شاگردوں کی موجودگی میں ایک شاگرد نے شیخ پر قرأت کی، تو راوی اخبرنا کہے گا اور اگر قاری تنہا تھا، تو وہ اخبرنی استعمال کرے گا۔

صحیحین کا اجمالی تعارف

امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مقدمہ شرح صحیح مسلم میں فرمایا کہ علمائے محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے بعد اصح الکتب صحیحین ہیں، یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان دونوں کے حق میں امتِ مُسلمہ کی تلقی بالقبول ان کی عظمت کی روشن دلیل ہے۔

صحیح بخاری جمہور علماء کے نزدیک صحت وقوت میں صحیح بخاری کا مرتبہ صحیح مسلم پر فائق ہے اور بخاری مسلم سے اصح ہے، اس کے فوائد صحیح مسلم کے فوائد سے بہت زیادہ ہیں اور اس کے ظاہری و باطنی محاسن و معارف بے شمار ہیں امام مسلم نے خود امام بخاری سے استفادہ کیا اور اس بات کا اقرار کیا کہ امام بخاری علم حدیث میں بے نظیر ہیں۔ امام حاکم کے شیخ حسین بن علی نیشاپوری اور بعض شیوخ مغرب نے مسلم کو بخاری سے اصح قرار دیا۔

لیکن جمہور کے نزدیک قول اوّل صحیح ہے۔ حافظ ابن صلاح نے علوم الحدیث میں کہا کہ صحیح مجرد میں سب سے پہلے مصنف امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں۔ ان کے بعد امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مقام ہے اور ان دونوں کی کتابیں اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ صحیح بخاری کا صحیح مسلم پر راجح ہونا بچند وجوہ ہے:

۱- رواۃ بخاری، رواۃ مسلم سے زیادہ ثقہ ہیں۔

۲- اسانید بخاری کا اتصال اسانید مسلم کے اتصال سے زیادہ قوی ہے کیونکہ امام مسلم علیہ الرحمہ کے نزدیک راوی اور مروی عنہ کی معاصرت اور امکان لقا کافی ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک فعلیتِ لقا ضروری ہے۔

۳- صحیح بخاری میں مسائلِ فقہیہ کا استنباط لطائفِ عجیبہ و نکاتِ غریبہ کا وجود بکثرت پایا جاتا ہے۔

۴- امام بخاری کے متکلم فیہ رواۃ مسلم کے متکلم فیہ رواۃ سے بہت کم ہیں یعنی صرف تیئس ۲۳ راوی ایسے ہیں، جو بخاری کے مخصوص متکلم فیہ رواۃ ہیں اور مسلم کے متکلم فیہ رواۃ ایک سو ساٹھ ہیں۔

۵- بخاری جامع ہے مسلم جامع نہیں، کیونکہ مسلم میں تفسیر برائے نام ہے، جن لوگوں نے اس برائے نام تفسیر کا اعتبار کیا، انہوں نے صحیح مسلم کو جامع قرار دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ صحیح مسلم میں تفسیر کا وجود بوجہ قلت کالعدم ہے، اس لئے وہ جامع نہیں۔

وجوہ ترجیح میں ہم نے چند خصوصیات ہی کو بیان کیا ہے، ان کے علاوہ بھی بکثرت خصوصیات ہیں۔ مثلاً بخاری میں تیئس ثلاثی حدیثوں کا پایا جانا صحیح مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں کوئی ثلاثی حدیث نہیں پائی جاتی۔ بخاری کے علاوہ ترمذی میں صرف ایک حدیث ثلاثی ہے۔ ابن ماجہ میں پانچ ثلاثیات ہیں۔

تالیف صحیح امام بخاری کی غرض اس کتاب سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ احادیث صحیحہ مرفوعہ جمع ہو جائیں۔ اس کتاب کے پڑھنے والوں کو استخراج احکام و استنباط مسائل کا ملکہ حاصل ہو۔

تالیف صحیح بخاری امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مسجد حرام میں بیٹھ کر صحیح بخاری کی تالیف شروع کر دی۔ سولہ یا اٹھارہ برس میں اس کا مسودہ تیار ہوا، جس کی تبییض انہوں نے مدینہ منورہ میں منبر شریف اور قبر انور کے درمیان بیٹھ کر کی۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے تین مرتبہ اپنی صحیح کو ترتیب دیا اور تینوں مرتبہ کچھ نہ کچھ تغییر کیا، اسی وجہ سے اس کے نسخوں میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔

صحیح بخاری کی تالیف اس طرح ہوئی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ہر ترجمۃ الباب کے لئے غسل کیا اور دو نفل پڑھے، جو حدیث اس میں درج کی، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا اور اس کی صحت پر وثوق ہونے کے بعد اسے اپنی صحیح میں داخل کیا۔

حوائج و مہمات میں ختم بخاری شریف کثیر مشائخ اور علمائے ثقات نے حصول مرادات، کفایت مہمات، قضائے حاجات، دفع بلیات، کشف کربات، صحت امراض و مضائق و شدائد سے نجات پانے کے لئے صحیح بخاری کو پڑھا، اُن کی مرادیں حاصل ہوئیں۔ انہوں نے اپنے مقاصد میں کامیابی پائی۔ اور ختم بخاری شریف، اُن کی مرادوں کے بر آنے میں تریاق مجرب ثابت ہوا۔ یہ ایسی بات ہے کہ علمائے حدیث کے نزدیک شہرت و استفاضہ کے درجہ کو پہنچی ہے، دیکھئے اشعۃ اللمعات صفحہ ۱۲/۱ اور الحطۃ فی ذکر الصحاح الستہ مقدمہ تحفۃ الاحوذی صفحہ ۱۶۸

صحیح بخاری اور صحیح مسلم صحت، شہرت اور قبولیت کے لحاظ سے کتب حدیث کے طبقۂ اولیٰ میں شمار کی جاتی ہیں، بالخصوص صحیح بخاری، ان تینوں اوصاف میں صحیح مسلم پر فوقیت رکھتی ہیں۔

شرحِ بخاری بخاری شریف کی شروح اس قدر کثیر ہیں کہ ان کا احصاء دشوار ہے، جن میں فتح الباری للحافظ العلامۃ ابی الفضل احمد بن علی حجر العسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ ۱۴ جلدوں میں اور عمدۃ القاری للعلامۃ بدرالدین العینی الحنفی، متوفی ۸۵۵ھ گیارہ جلدوں میں اور ارشاد الساری مؤلفہ علامہ شہاب الدین احمد بن محمد الخطیب القسطلانی متوفی ۹۲۳ھ دس جلدوں میں عظیم و ضخیم شروح ہیں۔

صحیح مُسلم

یہ بات ابھی معلوم ہو چکی ہے کہ کتبِ حدیث میں صحیح بخاری کے بعد سب سے اصح و ارجح صحیح مسلم شریف ہے۔

صحیح مسلم کی تالیف سے امام مسلم کی غرض احادیثِ صحیحہ مرفوعہ کو بکثرت جمع کرنا اور ان کی اسانید کثیرہ بطرقِ متعددہ کو وارد کرنا، تاکہ صحت و قوتِ احادیث کی تائید مزید ہو اور ان احادیث کے حجت ہونے کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچے۔ استنباطِ مسائل امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مقصد نہیں۔ اس لئے وہ ایک حدیث کی اسانیدِ متعددہ کے ساتھ متنِ احادیث کا اعادہ نہیں کرتے، اسی لئے صحیح مسلم میں تکرار نہیں پائی جاتی، بخلاف صحیح بخاری کے کہ ان کا مقصد استنباطِ مسائل ہے اور وہ متنِ حدیث کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جب ایک حدیث سے متعدد مسائل مستنبط کرتے ہیں، تو اس کے متن کا بھی اعادہ فرماتے ہیں، اور اسی استنباطِ مسائل کے پیشِ نظر امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب کی تبویب کی ہے اور تراجم ابواب قائم کئے ہیں اور امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی غرض چونکہ استنباطِ مسائل نہیں، اس لئے انہوں نے اپنی کتاب میں ابواب نہیں رکھے۔

صحیح مسلم کے نسخوں میں حواشی پر جو ابواب اور ان کے عنوانات پائے جاتے ہیں، وہ امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نہیں، بلکہ بعض شراح صحیح مسلم نے قائم کیے ہیں۔ صحیح مسلم کی خصوصیات میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس کی ترتیب صحیح بخاری کی ترتیب سے احسن ہے، اس میں ہر حدیث ایسی جگہ وارد کی گئی ہے، جو اس کے لائق ہے اور اسی جگہ اس حدیث کے ان سب طرق و اسانید کو بھی امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جمع کر دیا ہے جو اُن کے نزدیک پسندیدہ تھے۔

جن طرق میں الفاظ کا اختلاف تھا، وہاں الفاظِ مختلفہ کو بیان کر دیا ہے اور ساتھ ہی زیادۂ ثقات کو بھی ذکر فرما دیا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے اس طریق کار سے صحیح مسلم میں حدیث تلاش کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ نیز حدیثوں کے طرقِ متعددہ اور مختلف الفاظ و زیادۂ ثقات جاننے سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں، جن کی تفصیل اس مختصر مضمون میں نہیں آسکتی۔

رُباعیاتِ صحیح مسلم صحیح مسلم ثلاثیات سے خالی ہے، البتہ اسی ۸۰ سے زائد اس میں ایسی حدیثیں ہیں جن کی سند میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مابین صرف چار واسطے ہیں اور یہ احادیث رُباعیات کہلاتی ہیں۔

ترجمہ امام بخاری

آپ کا نام محمد بن اسمٰعیل ہے اور کنیت و نسب کے ساتھ آپ کو الامام الحافظ الحجۃ ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ کہا جاتا ہے اور امام بخاری کے لقب سے آپ مشہور ہیں۔

آپ کے اجداد میں سے مغیرہ ایمان لائے۔ مغیرہ کا باپ بردزبہ فارس کا رہنے والا

اور مجوسی تھا، اس کی وفات کفر پر ہوئی۔ مغیرہ حاکمِ بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے اور ان کے ساتھ موالاتِ اسلام کی نسبت انہیں حاصل ہوئی اور اسی نسبت کی بنا پر انہیں جعفی کہا گیا۔

امام بخاری کی ولادت و وفات

امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۱۳ شوال بروز جمعہ ۱۹۴ھ بمقام بخارا پیدا ہوئے، اور ان کی وفات شب عید الفطر ۲۵۶ھ میں ہوئی اور عید کے دن بعد نماز ظہر سمرقند سے چھ میل کے فاصلے پر علاقہ خرتنگ میں مدفون ہوئے۔ بعض محدثین نے ان کی ولادت اور وفات کو دو شعروں میں بیان کیا،

کان البخاری حافظا ومحدثا — جمع الصحیح مکمل التحریر

میلادہ صدق ومدۃ عمرہ فیہا — حمید وانقضی فی نور

۱۹۴ — ۶۲ — ۲۵۹

امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے والد آپ کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ نو یا دس سال کی عمر میں علمِ حدیث کی طلب کا آغاز فرمایا اور گیارہ سال میں آپ کو اسانیدِ حدیث میں اس قدر مہارت پیدا ہوئی کہ بخارا میں ایک استاد نے سند بیان کی "حدثنا سفیان عن ابی زہیر عن ابراہیم"۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے ادب سے عرض کیا "ابوزہیر لیس لہٗ روایۃ عن ابراہیم بل ہو ابوزبیر" (نقلہٗ علی القاری فی المرقاۃ) جب استاد نے اصل کی طرف مراجعت کی، تو اس میں ابوزہیر کی بجائے ابوزبیر تھا۔

حصولِ علمِ حدیث کے لئے امام بخاری کا سفر اور مشائخ سے استفادہ

سولہ سال کی عمر میں امام بخاری نے ابنِ مبارک اور امام وکیع کی کتب حدیث کو یاد کر لیا۔ پھر طلب علم کے لئے رحلت کی۔ شام، مصر اور جزیرہ میں دو مرتبہ تشریف لائے اور چار مرتبہ بصرہ گئے، اور

چھ مرتبہ حجازِ مقدس میں اقامت فرمائی اور محدثین کے ساتھ کوفہ اور بغداد بے شمار مرتبہ گئے۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ میں نے ایک ہزار سے زیادہ آدمیوں کی حدیث لکھی ہے اور خود امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بے شمار لوگوں نے علم حدیث حاصل کیا۔ نوّے ہزار آدمیوں نے امام بخاری سے صحیح بخاری کو روایت کیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ حفظ حدیث میں کوئی شخص مقابلہ نہیں کرسکتا۔ سنداور متن اور معرفت علل اور تمیز بین الصحیح والسقیم میں امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بے مثل اور بے نظیر تھے۔

امام بخاری اپنے ہم عصروں کی نظر میں

حسین بن محمد المعروف بالعجلی فرماتے ہیں: میں نے محمد بن اسمٰعیل اور امام مسلم جیسا حافظِ حدیث نہیں دیکھا، لیکن امام مسلم اس کے باوجود بھی امام بخاری کے مرتبہ کو نہیں پہنچے۔ امام ابوعبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی نے کہا کہ میں نے علماء حرمین علماء حجاز و شام و عراق کو دیکھا، ان سب میں امام محمد بن اسمٰعیل بخاری جیسا اعلم وافقہ کسی کو نہیں پایا۔ امام مسلم نے امام بخاری کو مخاطب کرکے کہا: "لا یبغضك الا حاسد واشهد انه ليس فی الدنیا مثلك۔" ابوعبداللہ بن اخرم نے کہا، میں نے اپنے باپ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ میں نے مسلم بن حجاج کو امام بخاری کی بارگاہ میں اس حال میں دیکھا کہ وہ صبی متعلم کی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سوال کررہے تھے۔ ایک دن امام مسلم، امام بخاری کے پاس آئے اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور کہا: "دعنی اقبل رجلیك یا استاذ الاستاذین وسید المحدثین ویا طبیب الحدیث فی علله۔"

اور حافظ صالح بن جزرہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بغداد میں مسندِ درسِ حدیث پر جلوہ افروز ہوتے تھے، میں اُن کے درس کا املاء کرتا تھا۔ اُن کی مجلسِ درس میں بیس ہزار سے زیادہ آدمی ہوتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ مذہباً شافعی تھے اور بعض نے کہا وہ مجتہد تھے۔

ترجمہ امام مسلم

ابوالحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری النیشاپوری رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ ائمہ حفاظ اور اعلام محدثین سے ہیں۔ آپ نے حجاز و عراق، شام و مصر کی طرف متعدد سفر کئے۔ آپ کے شیوخ میں یحییٰ بن یحییٰ النیشاپوری، احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، عبداللہ بن مسلمہ القعنبی وغیرہم ہیں۔ امام مسلم علیہ الرحمہ کئی مرتبہ بغداد تشریف لائے اور اہلِ بغداد نے آپ سے روایت حدیث کی۔ آپ کا آخری قدوم بغداد ۲۵۹ھ میں ہوا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے آپ سے روایت حدیث کی۔ امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہے کہ میں نے تین لاکھ احادیث مسموعہ میں سے منتخب کر کے یہ مسند صحیح تالیف کی ہے۔

حافظ ابوعلی نیشاپوری نے کہا "ما تحت ادیم السماء اصح من کتاب مسلم۔"

ابوعبداللہ محمد بن یعقوب نے کہا کہ جب امام بخاری متوطن نیشاپور ہوئے، تو آپ کی خدمت میں امام مسلم کا آنا جانا بکثرت ہوا۔ جب محمد بن یحییٰ ذہلی اور امام بخاری کے درمیان مسئلۃ اللفظ میں اختلاف واقعہ ہوا اور محمد بن یحییٰ ذہلی نے امام بخاری کے خلاف اعلان کیا اور امام بخاری کے پاس لوگوں کو جانے سے روک دیا۔ یہاں تک کہ امام بخاری نیشاپور سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ اس ابتلاء کے زمانے میں اکثر لوگ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو چھوڑ گئے سوائے امام مسلم کے کہ انہوں نے امام بخاری کی زیارت سے تخلف نہیں کیا۔

ابنِ خلکان نے کہا: امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ولادت ۲۰۶ھ میں ہوئی اور وفات ۲۵ رجب ۲۶۱ھ میں بروز اتوار شام کے وقت ہوئی۔ آپ نیشاپور سے باہر نصر آباد میں مدفون ہوئے، اس وقت آپ کی عمر پچپن سال تھی۔

رواۃ حدیث

نمبر شمار	اسماء گرامی	سنِ وفات	تعداد مرویات	متفق علیہ	افراد بخاری	افراد مسلم
۱	ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما	سنہ ۷۳، ۷۴ھ	۲۶۳۰	۱۶۸	۸۱	۳۱
۲	ابو العباس عبداللہ ابن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما	۶۸	۱۶۶۰	۷۵	۱۱۰	۲۹
۳	ابو موسیٰ عبداللہ بن قیس الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۴۲، ۴۴، ۵۳	۳۶۰	۴۹	۴	۱۵
۴	ابو حمزہ انس بن مالک بن نضر بن ضمضم رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۹۱، ۹۲، ۹۳	۲۲۸۶	۱۶۸	۸۰	۷۰
۵	ابو ہریرہ عبداللہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۵۷، ۵۸، ۵۹	۵۳۷۴	۳۲۶	۹۳	۱۹۰
۶	ابو اسحٰق سعد بن ابی وقاص مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۵۰، ۵۵، ۵۷، ۵۸	۲۷۱	۱۵	۵	۱۸
۷	ابو بکرہ نفیع بن حارث ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۵۱، ۵۲	۱۳۲	۸	۵	۱
۸	عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۳۲، ۳۳	۸۴۸	۶۴	۲۱	۳۵
۹	حذیفہ بن الیمان حسیل بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما	۳۶	۲۲۵	۱۲	۸	۱۷
۱۰	ابو ایوب خالد بن زید بن کلیب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۵۰، ۵۱	۱۵۵	۷	۱	۵
۱۱	ابو سعید سعد بن مالک بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۶۳، ۶۴، ۶۵، ۷۴	۱۱۰۰	۴۳	۱۹	۵۲
۱۲	ام المومنین عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما	۵۷، ۵۸	۲۲۱۰	۱۷۴	۵۲	۶۹
۱۳	ابو طریف عدی بن حاتم بن عبداللہ الطائی رضی اللہ عنہ	۶۷، ۶۸، ۶۹	۶۶	۳	-	۲
۱۴	ابو عبدالرحمٰن معاویہ بن ابی سفیان صخر بن حرب رضی اللہ عنہما	۶۰، ۵۹	۱۶۳	۴	۴	۵
۱۵	ام المومنین حفصہ بنت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہما	۴۵	۶۰	۴	-	۶

شمار نمبر	اسمائے گرامی	سنِ وفات	تعداد مرویات	متفق علیہ	افراد بخاری	افراد مسلم
۱۶	ابوالحسن علی بن ابی طالب بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ	سنہ ۴۰ھ	۵۳۶	۲۰	۹	۱۵
۱۷	ابو محمد عبد اللہ بن زید بن عاصم بن کعب المازنی رضی اللہ عنہ	۶۳	۴۸	۸	-	-
۱۸	ابو عبد اللہ المغیرہ بن شعبہ بن ابی عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۵۰	۱۳۶	۹	۱	۲
۱۹	ابو محمد عبد اللہ بن عمرو بن العاص بن وائل رضی اللہ عنہما	۶۳، ۶۵، ۶۷، ۵۵، ۶۸، ۷۳	۷۰۰	۱۷	۸	۲۰
۲۰	ابو عبد اللہ جابر بن عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہما	۷۷-۷۴	۱۵۴۰	۵۸	۲۶	۱۲۶
۲۱	ابو قتادہ حارث بن ربعی بن بلذمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۵۴	۱۷۰	۱۱	۲	۸
۲۲	ابوالعباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہما	۸۸-۹۲	۱۸۸	۲۸	۱۱	-
۲۳	ابو عمرو جریر بن عبد اللہ بن جابر البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۵۱، ۵۴	۱۰۰	۸	۱	۶
۲۴	ابو عبد اللہ نعمان بن بشیر بن ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما	۶۴	۱۱۴	۵	۱	۴
۲۵	ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط ابان رضی اللہ تعالیٰ عنہا	-	۱۰	۶	-	-
۲۶	ابو عبد اللہ عمرو بن العاص بن وائل السہمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۴۳-۴۷، ۴۸-۵۱	۳۹	۳	۱	۲

۱۔ اسد الغابہ

۲۔ تلقیح فہوم اہل الاثر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ رب العٰلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ

والسلام علیٰ سیدنا محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین

ارکانِ اسلام

حدیث ۱: عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَہَادَۃُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامُ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءُ الزَّکٰوۃِ وَالْحَجُّ وَصَوْمُ رَمَضَانَ۔

(بخاری جلد اوّل ص۶، مسلم جلد اوّل ص۳۲)

حلِ لغات: بُنِیَ: بنا کی گئی (ماضی مجہول) خَمْسٍ: پانچ۔
شَہَادَۃُ: گواہی دینا، اِیْتَآءٌ: ادا کرنا۔

ترجمہ: "سیدنا عبداللہ[۱] بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی بنا رکھی گئی ہے پانچ چیزوں پر، گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔"

---

[۱] عبداللہ بن عمر بن الخطاب القرشی العدوی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اپنے والد ماجد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ اسلام لائے تھے۔ ابھی بچے تھے، بالغ نہیں ہوئے تھے۔ بعض کا قول ہے کہ والد ماجد سے پہلے ایمان لائے، مگر یہ صحیح نہیں، البتہ ان کی ہجرت والد ماجد سے پہلے ہوئی۔ اس لئے بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ وہ ان سے پہلے ایمان لائے۔ اس پر اتفاق ہے کہ بدر میں حاضر نہیں ہوئے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں چھوٹا پا کر واپس کر دیا تھا (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

تشریح اس حدیث میں اسلام کو ایک عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح عمارت کی بناوٹ وسجاوٹ میں بے شمار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(بقیہ گزشتہ صفحہ) غزوۂ اُحد میں اُن کی حاضری میں اختلاف ہے، بعض نے کہا حاضر ہوئے اور بعض کہتے ہیں کہ صغر سنی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں نابالغوں کے ساتھ واپس فرمادیا تھا۔ صحیح یہ ہے کہ پہلے پہل یہ غزوۂ خندق میں حاضر ہوئے اور غزوۂ موتہ میں جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حاضری دی۔ یرموک، فتح مصر اور افریقہ میں بھی حاضر ہوئے۔ آثار رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کثیر الاتباع تھے، یہاں تک کہ جہاں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اُترتے، یہ بھی وہیں اترا کرتے اور جس جگہ آپ نے نماز پڑھی، وہیں نماز پڑھتے، یہاں تک کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے اترے تھے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو پانی دیا کرتے تھے کہ سوکھ نہ جائے۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔ ایام حج کے علاوہ دیگر ایام میں بھی لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے تھے فتویٰ بڑی احتیاط سے دیتے۔ مسلمانوں کی باہمی لڑائیوں میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا، مگر بعد میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مل کر اُن کے مخالفوں سے جنگ نہ کرنے پر ندامت کا اظہار کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ جب اُن کی موت کا وقت قریب آیا تو فرمایا مجھے دُنیا میں کوئی رنج نہیں، مگر یہ کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمایت میں جنگ نہیں کی۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا کرتے تھے کہ ہم میں کوئی ایسا نہیں رہا سوائے حضرت عمر اور اُن کے بیٹے حضرت عبد اللہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے کہ دُنیا کی طرف مائل نہ ہوا ہو۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بہت سے حج کیے، کثیر الخیرات تھے۔ بعض اوقات ایک ہی مجلس میں تیس ہزار خیرات کردیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کثیر الروایۃ ہیں، اصحاب ثلثہ اور ابوذر، معاذ بن جبل، رافع بن خدیج، ابوہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے بھی روایت کی ہے، ان سے ابن عباس، جابر، ماعز مزنی (علیہم الرضوان) جیسے صحابہ نے روایت کی ہے اور بہت سے تابعین نے بھی۔ ۸۹ سال عمر پائی۔ بعض نے ۸۴ سال بتائی ہے۔ ۷۴ھ میں وفات پائی (اسد الغابہ ص ۲۲۷ ج ۳)

لیکن اس کی بنیاد میں چند چیزیں ہوتی ہیں۔ اگر عمارت کو اوپر سے خوب مضبوط اور مستحکم کر دیا جائے، لیکن جب تک بنیاد مضبوط نہ ہو عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح اسلام کی عمارت کو مختلف اعمالِ صالحہ سے سجایا جا سکتا ہے، لیکن اس کی بنیاد ان پانچ چیزوں پر ہے یعنی کلمۂ شہادت[۱]، نماز[۲]، زکوٰۃ[۳]، حج[۴]، روزہ[۵]۔ یہ امورِ اسلام میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور اِس میں کلمۂ شہادت ایک عظیم بنیادی رُکن ہے جس پر باقی تمام ارکان کی بنا ہے۔ اُس کی مثال اس طرح سمجھو جیسے ایک خیمہ پانچ ستونوں پر قائم ہو، جس کا بنیادی ستون درمیان میں ہو اور اس کے گوشوں میں باقی چار ستون ہوں۔ اگر درمیان والا ستون قائم نہ ہو گا، تو خیمہ قائم نہ رہے گا، اور اگر درمیان والا ستون قائم ہو اور کسی گوشہ کا ستون قائم نہ ہو تو خیمہ اُس طرف سے گرا ہو گا، لیکن درمیان والے ستون کی وجہ سے قائم رہے گا۔ کلمۂ شہادت کے بغیر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کچھ کام نہیں آئیں گے اور جس نے کلمہ پڑھ لیا ہے، اُس کو سوچنا چاہیے کہ کہیں کسی طرف کا کوئی ستون گرا ہوا تو نہیں ؟ ورنہ عمارتِ اسلام میں کمزوری ہو گی۔ اس حدیث میں بنیادی ارکان کا بیان کیا گیا ہے۔

کلمۂ شہادت

یہ عظیم رُکن ہے اس کے بغیر اعمالِ صالحہ کارآمد نہیں ہیں، جیسے جڑ کے بغیر درخت ہرا بھرا نہیں رہ سکتا۔

بنیاد کے بغیر عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی ایمان کے بغیر کوئی عملِ صالح آخرت میں فائدہ نہ دے گا۔ مثلاً کوئی غیر مسلم، مریضوں کے لئے ہسپتال کھول دے یا تعلیم کے اسکول، کالج قائم کر دے یا مسافروں کے لئے راستہ بنا دے یا غریبوں کی امداد کر دے۔ اسی طرح کوئی بدمذہب جس کی بدعت کفر تک پہنچ گئی ہو اُس کی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، وعظ و تبلیغ، درس و تدریس آخرت میں کچھ کام نہیں آئے گی۔ مولیٰ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کفر و شرک کی بخشش نہ ہو گی۔ اس کے علاوہ دوسرے گناہوں

کی بخشش خداوندِ قدوس کی مشیئت پر موقوف ہے۔ آج کل جس طرح مال کے لیٹرے بہت ہیں، اسی طرح ایمان کے ڈاکو مختلف صورتوں میں نظر آرہے ہیں۔ مولا تعالیٰ تمام مسلمانوں کے ایمان واسلام کی حفاظت فرمائے۔

نماز یہ اسلام کا دوسرا اور بہت ہی اہم رکن ہے۔ نبوت کے بارہویں سال شبِ معراج میں نماز فرض ہوئی۔ نابالغ، مجنون، حیض و نفاس والی عورت کے سوا ہر مسلمان پر فرضِ عین اور کسی حال میں معاف نہیں ہے۔ اگر کھڑا نہیں ہو سکتا تو بیٹھ کر، اور اگر بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتا، تو لیٹ کر اشارہ سے پڑھے۔ اگر لیٹ کر بھی اشارہ سے نہیں پڑھ سکتا، تو نماز مؤخر ہوگی، یعنی تندرست ہونے کے بعد قضا کرے گا ہاں اگر اسی بیماری میں فوت ہو جائے، تو خداوند کریم کے فضل و کرم پر امید ہے کہ معاف فرما دے گا۔ نماز کی فرضیت کا انکار کرنے والا کافر، اور جو قصدًا ترک کرے، اگرچہ ایک ہی وقت کی ہو، وہ فاسق ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا فتویٰ یہ ہے کہ تارکِ نماز کو بادشاہِ اسلام قید کر دے، حتیٰ کہ وہ توبہ کرے اور نماز پڑھنے لگے۔

فضیلتِ نماز ایمان کے بعد سب عبادات و اعمال سے بہترین عبادت اور عمل نماز ہے۔ نماز کا ہر قول و فعل اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، تسبیح و تعظیم پر مشتمل ہے اور مولیٰ تعالیٰ کو سب عبادتوں سے نماز بہت پیاری اور محبوب ہے، اسی لئے ہر امیر و غریب، شاہ و گدا، بوڑھے جوان پر نماز فرض ہے۔ بخلاف زکوٰۃ و حج کہ وہ صرف مالداروں پر فرض ہے، فقراء پر فرض نہیں اور نماز سردی، گرمی، سفر و حضر میں فرض ہے بخلاف روزہ کے مسافر کے لئے روزہ ترک کرنے میں رخصت ہے، بعد میں قضا کرے گا، تمام احکام اللہ تعالیٰ نے زمین پر نازل فرمائے بخلاف نماز کے رب کریم نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عرشِ عظیم پر نماز کا تحفہ عطا فرمایا، اسی لئے حدیث شریف میں وارد ہے: اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ "نماز مومنوں کی معراج ہے۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: "نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔" حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ارشاد فرمایا:

اَرِحْنَا بِالصَّلٰوۃِ اَوْکَمَا قَالَ۔" ہم کو نماز سے راحت پہنچا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم، اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟" تو آپ نے فرمایا: "اپنے وقت میں نماز پڑھنا۔" (بخاری مسلم) ربّ کریم نے ارشاد فرمایا:

"نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔" (القرآن الکریم)

نماز کی برکت سے ہم گناہ گاروں سیہ کاروں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ نبی پاک صاحبِ لولاک علیہ الصلوٰۃ والسلام سردیوں کے زمانے میں نکلے اور پتے جھڑ رہے تھے۔ آپ نے درخت کی دو ٹہنیاں پکڑیں (راوی فرماتے ہیں) ان ٹہنیوں سے پتے جھڑنا شروع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا: "اے ابوذر!" میں نے کہا لبیک یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم) آپ نے فرمایا: "بے شک مسلمان بندہ جب نماز پڑھتا ہے اور اس کا ارادہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے (یعنی اخلاص کے ساتھ پڑھتا ہے) تو اُس کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، جیسے اس درخت سے پتے جھڑ رہے ہیں۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا "بتاؤ کہ اگر تمہارے کسی کے دروازہ پر نہر جاری ہو اور وہ اس سے ہر روز پانچ دفعہ نہائے، کیا اس کی میل سے کچھ باقی رہے گا؟" انہوں نے عرض کیا: "اُس کی میل سے کچھ باقی نہیں رہے گا۔" فرمایا: یہی مثال پانچ نمازوں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے گناہ مٹا دیتا ہے۔ (متفق علیہ مشکوٰۃ شریف)

اور حدیث شریف میں ہے: "قیامت میں سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا جیسا کہ

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

روزِ محشر کہ جاں گداز بود — اوّلیں پرسشِ نماز بود

نماز نہ پڑھنے کی بُرائی

سُورت مریم میں ہے: (ترجمہ) اور اُن کے بعد ان کی جگہ وہ ناخلف آئے، جنہوں نے نمازوں کو ضائع کیا، اور اپنی خواہشات کی پیروی کی، عنقریب وہ دوزخ کی وادئ غیّ میں ڈالے جائیں گے۔ غیّ جہنّم میں ایک وادی ہے جس کی گرمی اور گہرائی سب سے زیادہ ہے۔

اور ایک جگہ فرمایا بے وقت نماز پڑھنے والوں کے لئے ویل ہے (یعنی بلا وجہ قضا کرنے والے) ویل جہنّم کی اس وادی کا نام ہے، جس کی سختی سے جہنّم بھی پناہ مانگتا ہے۔ مقامِ غور ہے کہ جو بے وقت نماز پڑھنے والے ہیں، اُن کا یہ حال ہے، تو جو بالکل ہی تارکِ نماز ہیں اُن کا کیا حال ہوگا؟ مولیٰ تعالیٰ وقت پر با جماعت نماز پڑھنے کی ہر مسلمان کی توفیق عطا فرمائے۔

نماز کے بارے میں ایک اہم ارشاد

نماز پڑھنے میں ہماری نجات ہے اور اس کو چھوڑنا مصیبت، جس سے نجات اور چھٹکارا مشکل ہے۔ حضور نبی اکرم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا، (ترجمہ) "جس نے نماز پر محافظت کی، وہ اُس کے لئے نُور، نجات، اور بُرہان ہوگی، اور جس نے نماز پر محافظت نہ کی، وہ اُس کے لئے نور نہ بُرہان نہ نجات ہوگی، اُس کا حشر بروزِ قیامت قارون، فرعون، ہامان اور اُبی بن خلف کے ساتھ ہوگا (مشکوٰۃ صہ ۵۹)

فائدہ: قارون، بنی اسرائیل میں ایک بڑا مالدار شخص ہوا ہے حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اُس کو زکوٰۃ کا حکم دیا، تو اُس نے انکار کر دیا، اس کی پاداش میں اُس کو مع اموال و خزائن کے زمین میں دھنسا دیا گیا اور فرعون، یہ ایک کافر بادشاہ ہوا ہے جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور ہامان اس کا وزیر و مصاحب ہوا ہے، اور اُبی بن خلف، یہ کفّارِ مکہ میں

سے تھا اور اسلام کا بدترین دشمن تھا اور بہت بڑا تاجر تھا۔ ابنِ حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے "زواجر" میں بیان کیا ہے کہ تارکِ نماز کا حشر ان چار کے ساتھ کیوں ہوگا؟ فرماتے ہیں نماز چھوڑنے کی اکثر وجہ یا تو مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے، اسی لئے اکثر مالدار نماز کے تارک ہوتے ہیں یا حکومت وسلطنت ہوتی ہے، اس کے نشہ میں بدمست ہوتے ہیں اور غرور و تکبر دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے، تو نماز کی پرواہ نہیں کرتے یا وزارت و ملازمت ہوتی ہے یا تجارت ہوتی ہے۔ اگر حکومت وسلطنت کی وجہ سے تارکِ نماز ہوا تو اس کا حشر فرعون کے ساتھ اور اگر مال و دولت وجہ ہوگی، تو اُس کا حشر قارون کے ساتھ اور اگر وزارت و ملازمت وجہ ہوگی، تو اُس کا حشر ہامان کے ساتھ اور اگر تجارت میں مشغولیت کی وجہ سے تارکِ نماز ہوا، تو اُس کا حشر اُبی بن خلف کے ساتھ ہوگا والعیاذ باللہ!

مقامِ غور ہے کہ ترکِ نماز کتنی بڑی مصیبت اور معصیت ہے اور کیسے کیسے کفار کے ساتھ حشر کی وعید حدیث پاک میں وارد ہوئی۔ اسلام کے بعد تمام ارکان سے اہم رُکن نماز ہے۔ مسلمان کو ہر حال میں اس پر پابندی کرنی چاہیے۔

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رُکن زکوٰۃ ۲ھ کو زکوٰۃ فرض ہوئی۔ نماز کی طرح اس کی فرضیت بھی قطعی ہے، اِس کی فرضیت کا منکر بھی کافر ہے اور فرض ہونے کے بعد ادا نہ کرنے والا فاسق و گنہ گار ہوگا۔

مسئلہ: ہر عاقل و بالغ آزاد مسلمان مرد ہو یا عورت، جب حاجاتِ اصلیہ سے زائد نصاب کا مالک ہو جائے اور اس پر سال گزر جائے، تو زکوٰۃ ادا کرنا اس پر فرض ہو جاتی ہے۔ (مکمل تفصیل بہارِ شریعت حصۂ پنجم میں ملاحظہ فرمائیں)

وجوبِ زکوٰۃ کی حکمت خداوندِ قدوس نے قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا ہے:۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا یعنی زیرِ آسمان جو بھی زمین پر چلنے والا ہے اُس کا رزق مولیٰ تعالیٰ نے اپنے ذمۂ کرم پر لیا ہے۔

ہر قسم کے جانوروں کو رزق مِل رہا ہے اور اکثر ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ پتھر میں کیڑے کو بھی رزق مِلتا ہے۔ انسانوں کے رِزق کا اس طرح انتظام فرمایا کہ ان میں دو گروہ بنا دیئے ایک گروہ مالداروں کا اور دوسرا گروہ فقراء و مساکین کا۔ مالداروں کو تو مال عطا فرما کر رِزق عطا فرمایا اور فقراء و مساکین کا حق مالداروں کے مال میں رکھ کر فقراء اور مساکین کے رزق کا انتظام فرما دیا، یہ اُس کی مشیت ہے جیسے چاہے انتظام فرمائے، وہ مالک و خالق ہے، اس کا ہر کام عدل و انصاف پر مبنی ہے، وہ کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کرتا۔

زکوٰۃ کی فضیلت اور فوائد

زکوٰۃ کے لغوی معنیٰ بڑھنا ہے، یا پاک ہونا اور زکوٰۃ ادا کرنے سے مال بڑھتا اور برکت ہوتی ہے اور بقایا مال پاک ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے ایک کے بدلے میں سات سو گنا کا ثواب ملے گا اور جس کے لئے اللہ تعالیٰ چاہے گا، دو گنا فرما دے گا۔

فائدہ نمبر ۱: زکوٰۃ ادا کرنے سے اپنی قوم کے نادار، مفلس اور غریب رشتہ داروں کی امداد و اعانت ہو جاتی ہے اور وہ آسانی سے اپنا پیٹ پال سکتے ہیں، جس سے مالدار کی عزت و آبرو محفوظ رہے گی، کوئی طعنہ نہ دے گا کہ فلاں کا رشتہ دار بھوکا مر رہا ہے اور وہ عیش و عشرت میں زندگی گزار رہا ہے۔

فائدہ نمبر ۲: مالدار مسلمان جب فقراء و مساکین کو صدقہ و زکوٰۃ دے گا، وہ اُس کے لئے دعائیں کریں گے اور اُس کو مسلمانوں کی غائبانہ دُعائیں حاصل ہوں گی اور اُن کی دُعاؤں کی برکت سے اس سے مصیبتیں ٹل جائیں گی۔

فائدہ نمبر ۳: جس مال سے زکوٰۃ ادا ہو جائے، وہ چوری، ڈاکہ، جلنے اور ضائع ہونے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ فائدہ نمبر ۴: جب زکوٰۃ ادا کرتا رہے گا تو بخل کی بیماری سے محفوظ ہو جائے گا اور مولیٰ کریم کے کرم سے اس کا شمار سخیوں میں ہو گا اور اَلسَّخِیُّ حَبِیْبُ اللہِ کا مصداق ہو گا۔

زکوٰۃ نہ دینے کی بُرائی قرآن پاک میں ہے (جس کا مفہوم یہ ہے) جو لوگ دنیا میں سونا، چاندی اور خزانہ جمع کرتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں، کل قیامت کو اس سونے چاندی کے پترے بنا کر جہنّم میں گرم کرکے اس کے ساتھ اس کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا (العیاذ باللہ) حدیثِ پاک میں ہے: جس مال سے زکوٰۃ ادا نہ کی جائے گی، وہ مال گنجے سانپ کی شکل میں نمودار ہو کر اُس کو ڈنگ مارے گا۔ گنجا سانپ، بہت زہریلا سانپ ہوتا ہے۔

ثعلبہ بن حاطب کا واقعہ نبی پاک صاحب لولاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے کا ایک شخص ثعلبہ بہت مسکین و نادار تھا۔ اُس نے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی "یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) میں بہت نادار و مسکین ہوں، میرے لئے دُعا فرمائیں کہ میں مالدار ہو جاؤں"۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "ثعلبہ! وہ تھوڑا مال جس کا تو شکر ادا کر سکے، اس زیادہ مال سے بہتر ہے جس کا شکر ادا نہ ہو۔" اس نے دوبارہ عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) اس خدا کی قسم (جس نے آپ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو نبی بنا کر بھیجا ہے، اگر وہ مجھ کو مال عطا فرمائے گا، تو ہر حقدار کا حق ادا کروں گا، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیارے پیارے مبارک ہاتھ اُٹھائے اور اس کے لئے دُعا فرمادی۔ اللہ تعالیٰ نے ثعلبہ کی بکریوں میں برکت عطا فرمائی، وہ اتنی بڑھیں کہ مدینہ منورہ میں اُن کی گنجائش نہ رہی اور وہ اُن کو جنگل میں لے گیا اور وہیں اُن کی خبر گیری میں مصروف رہتا اور مسجد میں جماعت اور جمعہ کی حاضری سے بھی محروم ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ثعلبہ کے متعلق دریافت فرمایا تو صحابہ کرام نے عرض کیا: "اس کا مال بہت بڑھ گیا ہے اور وہ جنگل میں چلا گیا ہے اور اس کی خبر گیری میں جماعت و جمعہ کی حاضری سے محروم ہو گیا ہے" آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "ثعلبہ پہ افسوس"! کچھ مدت کے بعد حضور اکرم

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے مختلف علاقوں میں زکوٰۃ جمع کرنے کے لئے بھیجے جن جن کے پاس عامل گئے، انہوں نے بخوشی زکوٰۃ جمع کروادی۔ جب ثعلبہ کے پاس عامل گیا، تو اُس نے کہا یہ تو ٹیکس (جزیہ) ہوا۔ (جیسا کہ آج کل کے مسلمان بھی زکوٰۃ کو بوجھ خیال کرتے ہیں) تم جاؤ، میں سوچوں گا۔ جب عامل واپس آئے تو سرکارِ مدینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن کے عرض کرنے سے پہلے ہی دو مرتبہ فرمایا کہ ثعلبہ پر افسوس! ثعلبہ پر افسوس! پھر انہوں نے ثعلبہ کا قصہ سنایا تو اس کے متعلق قرآن کریم میں یہ آیت وَمِنْهُم مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ۔ الآیۃ) نازل ہوئی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ سے معاہدہ کرتے ہیں کہ "جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا تو ہم ضرور خیرات کریں گے" اور نیک آدمیوں میں سے ہوں گے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو مال عطا فرمادیا تو وہ بخیل ہو گئے اور منہ پھیر گئے۔ جب ثعلبہ کو معلوم ہوا، تو ڈر گیا کہ بڑا بدنام ہوں۔ زکوٰۃ لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے تیری زکوٰۃ قبول کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ ثعلبہ یہ سُن کر سر پر مٹی ڈالتا ہوا واپس چلا گیا۔ پھر جب خلافتِ صدیقی کا زمانہ آیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی وہ زکوٰۃ قبول کرنے سے انکار کردیا۔ پھر ثعلبہ نے عہدِ فاروقی میں بھی زکوٰۃ پیش کی، لیکن حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی قبول نہ کی پھر آخر کار حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں خائب و خاسر ہو کر ہلاک ہو گیا۔

مقامِ عبرت ہے کہ اِن مالداروں کے لیے جو اپنے مال سے زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور زکوٰۃ کو بوجھ سمجھتے ہیں اور فقراء و مساکین کا حق ادا نہیں کرتے اور راہِ خدا میں مال خرچ نہیں کرتے اور مال کا شکر ادا نہیں کرتے، کیا انہیں قبر کی وحشت اور تنگی یاد نہیں؟ اور کل قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے رُسوا ہونے کا خطرہ نہیں --؟

مولیٰ تعالیٰ تمام مالداروں کو صدقہ و زکوٰۃ کی توفیق عطا فرمائے۔

روزہ

یہ اسلام کا چوتھا رُکن ہے۔ ماہِ شعبان ۲ھ میں فرض ہوا۔ اس کی فرضیت کا منکر کافر۔ اس کی فرضیت بھی قطعی ہے۔ بلا عذر روزہ چھوڑنے والا گنہ گار اور فاسق ہے۔

روزہ کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "صابرین کو اُن کا ثواب بھرپور اور بغیر حساب کے دیا جائے گا۔" (القرآن)

صبر کا معنیٰ مصیبت کو برداشت کرنا، روزہ میں بھوک اور پیاس کی شدت ہوتی ہے اور اس کو غروبِ آفتاب تک مولیٰ تعالیٰ کی رضا کے لئے برداشت کرنا ہوتا ہے۔ حضرتِ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: "صابرین سے مُراد روزہ دار ہیں۔" تو آیتِ کریمہ کا مطلب ہوا کہ روزہ داروں کو مولیٰ تعالیٰ بغیر حساب کے اجر و ثواب عطا فرمائے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں بھی ہے کہ مولیٰ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ۔ "روزہ میرے لئے ہے اور اس کی جزا بھی میں خود ہی عطا فرماؤں گا۔" معلوم ہوا کہ روزہ بہت بڑی عبادت ہے کہ جس کے ثواب کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ حدیث شریف میں ہے:

لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَۃٌ عِنْدَ فِطْرِہٖ وَ فَرْحَۃٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّہٖ۔ "روزہ دار کو دو خوشیاں ہوتی ہیں ایک افطاری کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملنے کے وقت۔"

افطار کے وقت کی خوشی تو ظاہر ہے کہ بھوک اور پیاس کا غلبہ تھا، کھانے سے بھوک گئی اور پینے سے پیاس گئی، دوسری خوشی بہت زیادہ ہوگی کہ جنت میں داخل ہوگا اور طرح طرح کی نعمتوں کے علاوہ ربِّ کریم کا دیدار حاصل ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے: روزہ دار کے مُنہ کی بُو اللہ تعالیٰ کے نزدیک کستوری کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ ہے اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ روزہ دار کی بُو کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُس کو ایسی خوشبو عطا فرمائے گا جو کستوری سے بڑھ کر ہوگی یا روزہ دار جب قبر سے اُٹھیں گے تو اُن کے منہ سے ایسی خوشبو نکلے گی جو کستوری سے بڑھ کر ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب!

ترکِ روزہ کی بُرائی

ماہِ رمضان کا روزہ بہت بڑی عبادت ہے اس کو بغیر عذرِ شرعی کے چھوڑنا بہت بڑا گناہ اور بہت بڑی محرومی ہے۔

حدیث شریف میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے رمضان کا ایک روزہ بغیر رخصت اور بغیر بیماری کے چھوڑ دیا، اب اس کے متبادل اگر ساری زندگی بھی روزے رکھے، وہ اس ایک روزے کا بدل نہ ہوں گے۔ (ترمذی شریف جلد اوّل) یعنی اگرچہ فقہاً ایک روزہ کی قضا ایک ہی روزہ ہے، لیکن برکت و ثواب کے اعتبار سے رمضان شریف کا ایک روزہ ترک کرنے پر ساری عمر کے روزے اس کا بدل نہیں بن سکتے۔ ہاں اگر بیماری یا سفر وغیرہ عذرِ شرعی سے روزہ ترک کیا، تو اس کی قضا ایک ہی روزہ اور وہ قضا کا روزہ برکت و ثواب میں بھی اس کا بدل ہوگا۔

روزہ کی حقیقت

روزہ عربی لفظ صوم کا اردو ترجمہ ہے۔ لفظ صوم کا لغوی معنیٰ رُکنا ہے، لیکن شریعتِ مطہرہ میں صبحِ صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک نیت کے ساتھ کھانے پینے، جماع سے رُکنا شرعی روزہ ہے اور عوام کا روزہ تو اتنا ہی ہے، لیکن خواص کا روزہ اس کے ساتھ ساتھ اعضاء سبعہ یعنی ہاتھ، پاؤں، آنکھ۔ کان۔ زبان۔ پیٹ۔ شرمگاہ کو ناجائز اور ممنوع امور سے روکنا، مثلاً ہاتھ سے کسی پر ظلم نہ کرنا، پاؤں سے کسی غلط کام کی طرف نہ چلنا، آنکھ سے کسی غیر محرم کی جانب اور فحش مناظر کی جانب نہ دیکھنا، کان سے چغلی، غیبت وغیرہ نہ سننا، پیٹ کو حرام لقمہ سے بچانا، شرمگاہ کو زنا وغیرہ سے محفوظ رکھنا اور زبان کو جھوٹ، جھوٹی قسم اور چغلی، غیبت، گالی گلوچ وغیرہ سے بچانا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ "اگر کوئی تم سے جھگڑے، یا گالی دے، تو تم کہہ دو کہ میں روزہ دار ہوں" (مشکوٰۃ شریف) اور ایک حدیث میں ہے "جس نے روزہ رکھ کر جھوٹ کو نہ چھوڑا اور حرام کاموں سے نہ بچا تو اس کے کھانے پینے کے چھوڑنے کی اللہ تعالیٰ کو کوئی حاجت (پرواہ) نہیں ہے۔" (مشکوٰۃ)

اخص الخاص کا روزہ یہ ہے کہ ہر ماسوی اللہ سے تعلقات منقطع کرے صرف مولیٰ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ مضبوط و مستحکم کرے "اللہ بس باقی ہوس" کا مظہر ہو۔ جو چیز بھی مولیٰ تعالیٰ کی محبت میں رکاوٹ ہو اُس کو چھوڑ دے، اور جو رب کریم کی محبت کا ذریعہ ہو، اُس کو اختیار کرے۔ یہ روزہ کے درجات، بہارِ شریعت حصّہ پنجم میں مذکور ہیں۔

حج

یہ اسلام کا پانچواں رُکن ہے، اس کا لغوی معنی ہے قصد کرنا اور شرعی معنی ہے وقت مخصوص میں مکانِ مخصوص کا قصد کرنا۔ (عمدۃ القاری)

حج سنہ ۹ ھ کو فرض ہوا۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سنہ ۱۰ ھ کو حج فرض ادا فرمایا، جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے، اس کی فرضیت کا منکر کافر ہے، اور استطاعت ہونے کے بعد حج کا تارک گنہ گار ہوگا، چاہیے تو یہ کہ جب حج فرض ہو جائے تو اسی سال حج ادا کرے اور اصح قول پر تاخیر کرنا گناہ ہے۔ اگرچہ حج عمر میں ایک ہی بار فرض ہوتا ہے لیکن اس کو کیا اعتماد کہ وہ آئندہ سال تک زندہ رہے گا؟ یا اسباب میسّر رہیں گے؟ لہٰذا جس سال حج فرض ہو جائے، اسی سال حج ادا کرنا چاہیے۔ اس میں لیت و لعل اور ٹال مٹول حیلے بہانے سے کام نہیں لینا چاہیے کہ اس سال بچوں وغیرہ کی شادی کر لیتے ہیں پھر حج بھی کر لیں گے، بلکہ فوراً پہلے حج کرے، اس کی برکت سے باقی تمام کام بھی آسان ہو جائیں گے۔

حج کی فضیلت

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ صاحبِ استطاعت پر حج کرنا فرض ہے۔ اگر اخلاص سے حج کرے گا، تو اللہ جل شانہ، اور اُس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی کر کے دونوں جہان کی فلاح و بہبود حاصل کرے گا اور اُس کے پہلے گناہ بخش دیئے جائیں گے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے:

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی
قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ یَرْفُثْ وَلَمْ یَفْسُقْ رَجَعَ کَیَوْمِ وَلَدَتْہُ اُمُّہٗ۔ (مشکوٰۃ ص ۲۲۱)

جس نے اللہ کیلئے حج کیا اور فحش کلامی اور گناہ نہ کیا، جب واپس ہوگا تو اس دن کی طرح ہوگا جس دن کہ اس کی والدہ نے اس کو جنا ہوگا۔ یعنی پہلے گناہوں سے پاک صاف ہو جائے گا۔

ایک اور حدیث شریف میں اس طرح وارد ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْحَجُّ یَغْسِلُ الذُّنُوْبَ کَمَا یَغْسِلُ الْمَآءُ الدَّرَنَ۔ (کشف الغمہ ص ۱۶۶ ج ۱)

حضور نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حج گناہوں کو ایسے دھو ڈالتا ہے، جیسے پانی میل کو۔

ایک اور حدیث میں وارد ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ تک ان کے درمیان کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور حجِ مبرور کی جزا صرف جنت ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

حج نہ کرنا سخت گناہ ہے

جس صاحبِ استطاعت پر حج فرض ہوگیا، اور اس نے اپنی کوتاہی سے فریضۂ حج کو ادا نہ کیا، وہ سخت گنہ گار ہوگا اور فاسق و مردود الشہادۃ ہوگا، مولیٰ تعالیٰ اس پر سخت ناراض ہوگا۔ نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے لئے بہت سخت وعید بیان فرمائی ہے۔

عَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَلَکَ زَادًا وَّرَاحِلَۃً اِلٰی بَیْتِ اللّٰہِ وَلَمْ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو زادِ راہ اور بیت اللہ تک پہنچانے والی سواری

يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ اَنْ يَّمُوْتَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا (مشکوٰۃ ص۲۲۲) کا مالک ہوا اور اُس نے حج نہ کیا تو اس پر اس بات میں کوئی فرق نہیں وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

کتنی سخت وعید ہے تارکِ حج کے لئے، خطرہ ہے کہ کہیں اس کا خاتمہ کفر پر نہ ہو؟

حضرت سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "میرا تمام شہروں میں ایک ایک افسر بھیجنے کا ارادہ ہے جو وہاں جا کر تحقیق کریں کہ جو صاحبِ استطاعت ہو کر حج نہیں کرتا اس پر جزیہ[1] مقرر کر دے، کیونکہ وہ مسلمان کے حکم میں نہیں ہے۔" (زواجر)

آپ کا یہ ارشادِ مبارک تارکِ حج پر تغلیظ (سختی) کا حکم ہے، اگرچہ مسئلہ یہ ہے کہ جب تک فرضیت کا انکار نہیں کرے گا، وہ مسلمان ہی رہے گا، لیکن فرض ہونے کے بعد حج نہ کرنا کافروں والا کام ہے۔ آج کل بہت سے مسلمان اس مسئلہ سے غافل اور بے پرواہ ہیں کہ حیلے بہانے کرتے ہیں اور باوجود صاحبِ استطاعت ہونے کے حج نہیں کرتے۔ مولیٰ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس فریضہ اور دیگر ارکانِ اسلام ادا کرنے کی توفیق بخشے۔

مظلوم کی بددعا سے بچنا

(۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ[2] رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُعَاذًا اِلَى الْيَمَنِ فَقَالَ اِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهَا لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ۔

حلّ لغات: بَعَثَ: بھیجا۔ اِتَّقِ: بچ تو (امر حاضر معلوم) حِجَاب: پردہ، رکاوٹ۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ نبی پاک

---

[2] (حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ کریں)

[1] جزیہ اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو اسلامی حکومت میں غیر مسلم اقلیت پر لگایا جاتا ہے۔

صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ارشاد فرمایا کہ "مظلوم کی دعا سے بچنا کہ اس کی دعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب (رکاوٹ) نہیں ہوتا۔

(حاشیہ گزشتہ صفحہ) عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم القرشی الہاشمی: یہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بڑے لڑکے تھے۔ وسعتِ علم کی بنا پر بحر اور حبر الامۃ کہلائے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت شعب ابی طالب میں محصور تھے، مکہ میں پیدا ہوئے حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے گئے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے لعابِ دہن مبارک سے تحنیک فرمائی۔ یہ ہجرت سے تین سال قبل کا واقعہ ہے بعض نے کچھ اور لکھا ہے۔ انہوں نے جبرائیل علیہ السلام کو حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس دوبار دیکھا اور آپ نے ان کے لئے دوبار دعا فرمائی۔ چنانچہ وہ خود راوی ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور فرمایا: "اے اللہ! ان کو حکمت کی تعلیم دے۔" آپ فرماتے ہیں: ہم اہل بیت ہیں شجرۂ نبوت اور ملائکہ کے مہبط ہیں۔ اہل بیتِ رسالت، اہلِ بیت رحمت اور معدنِ علم ہیں عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں مشکل مقدمات آتے تو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہتے کہ ہمارے پاس مشکل مقدمات آئے ہیں اور ان کے حل کیلئے آپ ہی ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے سوا حلِ مشکلات کے لئے اور کسی کو نہیں بلاتے تھے۔ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قضایائے اصحابِ ثلٰثہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ مغازی، ایام العرب، فقہ، شعر، عربیت، تفسیر قرآن، علمِ حساب اور علم الفرائض میں یکتا تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ۱۳ سال کے تھے۔ بعض نے پندرہ سال کہا ہے۔ بہتر اور بعض کے قول پر اکہتر سال عمر پائی۔ بعض نے کہا مہندی لگاتے تھے، خوبصورت، گورے چٹے، قد آور زرد خضاب کیا کرتے زردی مائل جسیم صبیح الوجہ اور فصیح تھے۔ سنہ ۶۸ھ میں وفات پائی۔ (اسد الغابہ ج ۳، صفحہ ۱۹۳، ۱۹۵)

لہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سو ستاون احادیث روایت کی ہیں اور آپ کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ماہِ ربیع الآخر سنہ ۹ھ میں یمن کا حاکم بنا کر بھیجا۔ ۱۲ سعیدی

تشریح یہ حدیث طویل ہے، حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے عنوان کے مطابق آخری جملہ ذکر فرمایا ہے۔ اس حدیث کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ سیدنا معاذ[1] بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۹ھ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا، تو آپ نے ارشاد فرمایا: "اے معاذ! تو اہل کتاب کی ایک قوم کے پاس جائے گا، سب سے پہلے اُس کو کلمۂ شہادت کی دعوت دینا۔ اگر وہ اطاعت کرلیں، تو پھر اُن کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اس میں بھی اطاعت کرلیں، تو پھر اُن کو بتانا کہ مولیٰ تعالیٰ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے جو اُن کے مالداروں سے لیا جائے گا اور ان کے نادار لوگوں پر تقسیم کردیا جائے گا۔ اگر وہ یہ بھی مان جائیں، تو صدقہ میں اُن کے اچھے اور نفیس مال کو ہرگز نہ لینا، کیونکہ یہ اُن پر ظلم ہوگا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیونکہ مظلوم کی دُعا خداوند قدوس کی بارگاہ میں قبول ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی ہے" عمدۃ القاری ج ۸ ص۲۳۸ میں ہے:

دَعْوَۃُ الْمَظْلُوْمِ لَا تُرَدُّ وَلَوْ کَانَ فِیْہِ مَا یَقْتَضِیْ اَنْ لَّا یُسْتَجَابَ لِمِثْلِہٖ مِنْ کَوْنِ مَطْعَمِہٖ حَرَامًا وَّنَحْوِ ذَالِکَ۔	مظلوم کی دُعا ردّ نہیں ہوتی، اگرچہ اس میں وہ خصلت ہو جس کا تقاضا ہو کہ ایسے کی دُعا قبول نہ ہو، مثلاً اس کا کھانا پینا وغیرہ حرام ہو۔

جیسا کہ ایک اور حدیث میں وارد ہے کہ اس شخص کی دُعا کس طرح قبول ہوسکتی ہے جس کا کھانا پینا، رہنا حرام ہو اور ناجائز کمائی سے ہو۔ معلوم ہوا کہ اکلِ حلال کو قبولیتِ دُعا میں بڑا دخل ہے، اسی طرح صدقِ مقال (سچ بولنا) یہ بھی دُعا کی قبولیت کی شرائط سے ہے لیکن مظلوم کی بددُعا ہر حال میں قبول ہوجاتی ہے، چاہے اس میں یہ خرابیاں موجود ہوں، کیونکہ یہ جرم اُس کے اپنے ہیں، ظالم کے حق میں اس کی دُعا قبول ہوجائے گی،

---

[1] آپ اہل بدر اور عشرہ مبشرہ سے ہیں اور علم و فضل اور ورع و پرہیزگاری میں ممتاز تھے، ۱۲ عینی۔

جیساکہ حدیث شریف میں وارد ہے:۔

دَعْوَۃُ الْمَظْلُوْمِ مُسْتَجَابَۃٌ وَ اِنْ کَانَ فَاجِرًا فَفُجُوْرُہٗ عَلٰی نَفْسِہٖ
مظلوم کی دُعا مقبول ہے اگرچہ وہ فاسق و فاجر ہو کہ اس کا فجور اپنے آپ پہ ہے۔

(فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۲۸۵)

اس لئے آپ نے فرمایا ہے کہ مظلوم کی بدعا سے بچا جائے۔ صاحب فتح الباری نے ابنِ عربی کے حوالہ سے لکھا ہے اگرچہ حدیث میں مطلق ہے، لیکن دُوسری حدیث کے پیشِ نظر مقید ہے کہ مقبول دُعا میں یا تو وہ چیز بہت جلد حاصل ہوجاتی ہے جو اس کا مطلوب ہو یا وہ اُس کے لئے وہ دُعا ذخیرۂ آخرت ہوجاتی ہے اور اس سے افضل حاصل ہوگا۔ یا اس کی دُعا سے اس جیسی تکلیف اس سے مدفوع ہوجاتی ہے، اس میں اس وہم کا ازالہ بھی ہوگیا کہ مشاہدہ ہے کہ داعی کئی دفعہ مانگتا ہے اور بظاہر اس کی دعا کا ثمرہ نظر نہیں آتا۔ عمدۃ القاری شرح بخاری میں ہے: اس حدیث میں امام کو نصیحت اور ظلم سے ڈرانا ہے، جیساکہ قرآن پاک میں بھی ہے:

لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ۝ "سُن لو! اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر"۔

ظلم ہر شریعت میں حرام ہے اور حرام رہا ہے اور یہ بھی روایت ہے:

اَنَّ دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ لَا تُرَدُّ وَلَوْ کَانَتْ مِنْ کَافِرٍ۔ عینی شرح بخاری ج ۹ صفحہ ۹۴
یعنی مظلوم کی دُعا ردّ نہیں ہوتی اگرچہ کافر ہی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ مولیٰ تعالیٰ جس طرح مومن پر ظلم سے راضی نہیں ہوتا ایسے ہی کافر پر بھی ظلم کرنا اُس کو پسند نہیں ہے۔

ظلم کیا ہے؟ ظلم کا لغوی معنی وضع الشیئ فی غیر محلہ۔ یعنی کسی چیز کو اُس کے محل کے غیر میں رکھنا اور اصطلاحِ شرع میں خلافِ شرع کام کرنا۔ اس اعتبار سے ہر گناہ ظلم ہے، اِسی لئے قرآن نے

فرمایا ہے، اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۔"بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے"
ظلم دو طرح کا ہوتا ہے، ایک اپنے آپ پر اور کسی دوسرے کو ناحق تکلیف و اذیت دینا اور ناحق اس پر زیادتی کرنا۔ اس جگہ دُوسری قسم کا بیان ہے جس پر ناحق زیادتی کی جائے گی، وہ مظلوم ہوگا اور زیادتی کرنے والا ظالم اور اس کو ڈرایا جا رہا ہے کہ مظلوم کی بد دعا سے ڈرو کہ وہ بہت جلد قبول ہو جاتی ہے۔

آج کل ہمارے معاشرہ میں ہر طرف ظلم ہی ظلم نظر آ رہا ہے، کسی کی ناجائز جائیداد قبضہ میں کی جا رہی ہے اور کسی کو رشوت وغیرہ سے جھوٹے مقدمات میں پھنسایا جا رہا ہے اور کسی کو ناحق قتل کیا جا رہا ہے اور کسی کو مال و اسباب چوری ڈاکہ سے چھینا جا رہا ہے اور کسی کی عزت و آبرو لُوٹی جا رہی ہے۔ غرضیکہ ہر طرف ظلم ہی ظلم ہے، ہر بڑا چھوٹے پر ظلم کر رہا ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ خطرہ ہے کہ کہیں عذاب نازل نہ ہو جائے۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں کو ظلم کرنے سے بچائے اور عذاب سے محفوظ و مامون فرمائے۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کریما میں فرمایا ہے:

ستمکش گر آہے بر آرد ز دِل   زند سوز او شعلہ در آب و گِل

"مظلوم اگر ایک آہ دل سے نکالے، اُس کی جلن پانی اور مٹی کو آگ لگا دے"
یعنی خشکی، تری میں تباہی مچا دے۔ ناصحانہ انداز میں فرماتے ہیں ؎

مکن بر ضعیفانِ بیچارہ زور   بیندیش آخر ز تنگیِ گور

"کمزور بیچاروں پر زور نہ آزما،   آخرِ قبر کی تنگی کا کچھ فکر کر"
یعنی اپنی قبر کو یاد کر کہ وہ وحشت و تنگی کا گھر ہے، کہیں کمزوروں پر ظلم کی وجہ سے عذابِ قبر میں گرفتار نہ ہو جانا، لیکن، افسوس صد افسوس! آج مسلمان کو نہ اپنا مرنا یاد ہے، اور نہ عذاب قبر کا خوف، جنازہ کے ساتھ چلیں یا قبرستان جائیں، ہنسی مذاق میں مشغول رہتے ہیں، مولیٰ تعالیٰ ظلم و زیادتی اور گناہوں سے محفوظ فرمائے۔

حیا ایمان سے ہے

(۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَ[1] رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ وَھُوَ یَعِظُ اَخَاہُ فِی الْحَیَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَعْہُ فَاِنَّ الْحَیَاءَ مِنَ الْاِیْمَانِ۔ (بخاری شریف ج ۱، ص۸، مسلم شریف ج ۱، ص۳۷)

حلِّ لغات: مَرَّ: گزرے۔ یَعِظُ: نصیحت کر رہا ہے۔ دَعْہُ: اس کو چھوڑ۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک انصاری کے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو حیاء کے بارے میں نصیحت کر رہا ہے، یعنی حیاء سے منع کر رہا ہے، تو آپ نے فرمایا، اس کو چھوڑ دے، بے شک حیا ایمان سے ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں مذکور ہے کہ آپ کا گزر ایک انصاری صحابی[2] پر ہوا، جو اپنے بھائی حقیقی یا اسلامی بھائی کو حیا کرنے سے روک رہا تھا، کیونکہ وہ حیا کی وجہ سے اپنے حقوق اچھی طرح حاصل نہ کر سکتا تھا، تو آپ نے اس

---

[1] راوی حدیث کے حالات حدیث نمبر ا کے حاشیہ میں درج ہیں۔ ۱۲ منہ

[2] نبی پاک صاحب لولاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کے دو گروہ تھے، ایک مہاجرین کا گروہ اور دوسرا انصارِ مدینہ کا دونوں کی عظیم شانیں ہیں اور دونوں مینارۂ نور ہیں۔ انصار کے بارے میں یہ بھی فرمایا ہے کہ انصار کی محبت ایمان سے ہے۔ انصار سے مراد وہ صحابہ کرام ہیں جو مدینہ شریف میں پہلے رہتے تھے اور جنہوں نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حمایت اور نصرت کی اور مہاجرین کی خدمت اور رہائش کا بندوبست کیا یہاں تک کہ مہاجرین کو اپنے باغات اور جائیدادیں شریک کر لیا۔ ۲ منہ

انصاری صحابی کو فرمایا، اس کو حیاء سے منع نہ کر کیونکہ حیاء ایمان سے ہے، بلکہ ایک حدیث میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا ایمان کی ساٹھ یا ستر سے زائد شاخیں ہیں ان میں افضل کلمہ طیبہ کا اعتقاد ہے اور سب سے ادنیٰ راستہ میں سے تکلیف دہ چیز کو دور کر دینا اور حیا بھی ایمان کی ایک عظیم شاخ ہے اور عمدۃ القاری میں ہے کہ حیا خیر ہی لاتی ہے اور فرماتے ہیں، ایک روایت میں وارد ہے کہ حیاء سب کی سب خیر ہے۔

حکیم الامت مولانا مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ حیا سے مراد ایمانی غیرت ہے، جو گناہوں سے روک دے کہ بندہ اللہ کریم کی مخلوق اور اس کے رسول اور فرشتوں سے اور اللہ تعالیٰ سے شرم کرے، گناہ نہ کرے یعنی نہ چھپ کر کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اور فرشتے دیکھتے ہیں اور نہ علانیہ گناہ کرے کہ مسلمان بھی دیکھ رہے ہیں۔ نفسانی یا شیطانی غیرت مراد نہیں ہے جیسے نماز یا غسل سے شرمانا۔ (شرح مشکوٰۃ کتاب الایمان)

حیا کیا ہے؟

علامہ تیمی نے کہا ہے حیاء کا معنی یہ ہے کہ کسی متوقع خوف و ہراس کی وجہ سے کسی شیئ کو ترک کرنا۔ (تفہیم البخاری)

عمدۃ القاری شرح بخاری میں ہے، حیا کی حقیقت وہ قوت ہے، جو برائیوں سے بچنے پر ابھارے اور حق والے کے حق کو ادا کرنے میں کوتاہی سے روکے، یعنی جو قوت کسی معیوب کام کے ارتکاب اور نیک کام میں کوتاہی سے روکتی ہے اس کو حیا کہتے ہیں۔ حیاء کا اعلیٰ درجہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنا ہے، یعنی وہ تجھے اس کام میں نہ دیکھے، جس سے اس نے تجھ کو منع فرمایا ہے اور یہ مقام حاصل ہوتا ہے اس کی معرفت اور مراقبہ سے، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔ (مشکوٰۃ شریف ص۱۱)	اللہ تعالیٰ کی تو عبادت اس طرح کر جیسے تو اس کو دیکھ رہا ہے، پس اگر تو اس طرح نہ کر سکے تو یہ خیال کر کہ بے شک وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے

جب انسان اِس طرح عبادت کرے گا، تو اس عبادت میں خشوع وخضوع پیدا ہوگا اور لذّت وسُرور پیدا ہوگا اور معرفت حاصل ہوگی۔ جب یہ مقام حاصل ہوگا کہ انسان اپنے آپ کو اُس کی بارگاہ میں حاضر سمجھے گا، تو یقیناً گناہوں اور بداعمالیوں سے باز رہے گا، جب کسی مجازی بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو تو اس کے حکم کا خلاف نہیں کرتا اور اس کی خلاف ورزی سے حیا کرتا ہے۔ تو مقامِ غور ہے کہ احکم الحاکمین جلّ شانہٗ کی بارگاہ میں ہر وقت حاضر ہوتا ہے، لیکن پھر اس کے احکام کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے، لیکن جس کو مقامِ مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور مراقب ہوتا ہے، وہ اس کے احکام کی خلاف ورزی سے حیا کرتا ہے اور گناہوں سے پرہیز کرتا ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضور سیّدِ دو عالم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے حدیث کی تخریج کی ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس طرح حیا کرو جیسا کہ حیا کرنے کا حق ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا، ہم بحمدہٖ تعالیٰ حیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ نہیں۔

لٰكِنَّ الْاِسْتِحْيَاۤءَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى حَقَّ الْحَيَاۤءِ اَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا حَوٰى وَالْبَطْنَ وَمَا وَعٰى وَ تَذْكُرَ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى فَمَنْ فَعَلَ ذٰالِكَ فَقَدِ اسْتَحْيٰى مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاۤءِ۔ (عمدۃ القاری ۱ ص۱۲۹)	لیکن اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ تو سر اور جو اس میں جمع ہے اس کی حفاظت کرے اور پیٹ اور جو اس میں محفوظ ہے اس کی حفاظت کرے، اور موت اور بوسیدگی کو یاد کرے پس جس نے یہ کیا، اُس نے اللہ تعالیٰ سے حیا کی، جیسا کہ حیا کرنے کا حق ہے۔

حضرت جنید بغدادی[۱] رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اپنی کوتاہی کو دیکھنے سے جو حالت پیدا ہوتی ہے، اس کا نام حیاء ہے۔

شیخ الحدیث[۲] حضرت علامہ عبدالمصطفےٰ اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بحوالہ بیضاوی شریف

---

[۱] عمدۃ القاری ج ۱، ص۱۲۹ [۲] منتخب حدیثیں ص۵۶

فرمایا: مذمت کا خوف کرتے ہوئے بُرے کاموں سے نفس کا سکڑ جانا اس کیفیت کا نام حیا ہے۔ یہ درحقیقت وقاحت اور خجالت کے درمیان کی ایک صفت ہے۔ وقاحت یہ ہے کہ انسان اس قدر بے شرم اور بے غیرت ہو جائے کہ اس کو بُرے سے بُرے کام کرنے سے بھی جھجک ہی نہ رہے، اور خجالت یہ ہے کہ انسان اتنا شرمیلا ہو جائے کہ اچھے اور بُرے کام سے شرمانے لگ جائے اور حیا یہ ہے کہ بُرے کاموں سے خیال کرکے جھجک ہو کہ لوگ مذمت کریں گے اور اچھے کاموں سے کوئی جھجک نہ ہو۔ وقاحت اور خجالت یہ دونوں انسان کی مذموم بُری خصلتیں ہیں، اور حیا اس کی انتہائی محمود اور پسندیدہ صفت ہے۔

سوال: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حیا ایمان کا ایک حصہ اور اس کی جز ہے اور جز کا نہ رہنا کُل کے نہ رہنے کو مستلزم ہوتا ہے، تو معلوم ہوا کہ جس میں حیا نہ ہوگی، وہ مومن ہی نہ ہوگا۔؟

جواب: حدیث شریف میں جس ایمان کو حیا کہا گیا ہے، اس سے مراد ایمانِ کامل ہے، لہٰذا جس میں حیا نہ ہوگی، اس کا ایمان کامل نہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ وہ کافر ہو جائے گا، جس میں جتنی صفتِ حیا کامل ہوگی، اُس کا اتنا ہی ایمان ہوگا۔ کیا مقام ہے سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کہ جن کو حیا کی کان کہا جاتا ہے اور جن کے بارے میں حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرا عثمان وہ ہے جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ سرکارِ دو عالم رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کاشانۂ اقدس میں آرام فرما تھے اور پنڈلی مبارک یا ران مبارک سے ذرا کپڑا ہٹا ہوا تھا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ داخل ہوئے، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی حال میں تشریف فرما رہے اور جب حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ داخل ہوئے تو آپ نے کپڑے کو درست فرما لیا اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

کے استفسار فرمانے پر آپ نے ارشاد فرمایا: کیا میں ایسے شخص سے حیا نہ کروں، جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں، او کما قال (یہ حدیث کا مفہوم لکھا گیا ہے) (مشکوٰۃ صفحہ ۵۶۰)

مجاہد دولہا اور جنتی براتی

ایمانی غیرت اور حیا کے متعلق نہایت عبرت آموز واقعہ ملاحظہ فرمائیں:

ملکِ شام کے تین بھائی بہت اعلیٰ درجہ کے مجاہد تھے، کفار سے جہاد کرتے تھے رُوم کے عیسائیوں نے اُن کو گرفتار کر لیا۔ قیصرِ روم نے ان تینوں کی جوانی اور خوبصورتی سے متاثر ہو کر کہا کہ اگر تم عیسائیت قبول کر لو تو اپنی شہزادیوں کا تم سے نکاح کر دیا جائے گا، اور تم کو شریکِ اقتدار بھی کر لیا جائے گا، لیکن اِن مجاہدینِ اسلام نے صاف صاف انکار کر دیا کیونکہ کامل مسلمان کا اسلام لالچ سے نہیں خریدا جا سکتا۔ پھر جیسا کہ کفار کا طریقہ ہے کہ جب لالچ سے ان کا مطلب پورا نہ ہوا تو وہ دھمکیاں دیتے ہیں، ان کو بھی دھمکی دی کہ اگر تم نے عیسائیت کو قبول نہ کیا، تو تم کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا جائے گا، ان پر دھمکی بھی اثر انداز نہ ہوئی۔ انہوں نے کہہ دیا کہ ہم ہرگز ہرگز اسلام نہ چھوڑیں گے۔ تین دیگوں میں بادشاہ نے روغنِ زیتون گرم کرنے کا حکم دیا۔ تین دن تک تیل کھولتا رہا، روزانہ ان تینوں کو دکھایا جا رہا تھا کہ یا تو عیسائیت کو قبول کر لو، ورنہ اس کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیئے جاؤ گے، مگر یہ ایمان کے مجسّمے پہاڑوں کی طرح ایمان پر مستقیم رہے۔ پہلے بڑے بھائی کو ظالموں نے تیل میں ڈالا، پھر درمیان والے بھائی کو بھی کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا اور دونوں شہید ہو گئے۔ تیل میں غوطہ لگاتے وقت دونوں نے یا محمداہُ کا نعرہ لگایا۔ جب چھوٹے بھائی کو دیگ کے قریب لایا گیا، تو بادشاہ کے ایک درباری کو رحم آ گیا اور اُس نے کہا کہ اے بادشاہ! اس کو چالیس دن کی مہلت دی جائے، میں اس کو بہلا پھسلا کر نصرانی بنا لوں گا۔ وہ درباری اس مجاہد کو اپنے گھر لے آیا اور اپنی خوبصورت لڑکی کو اس کے پاس کر دیا تاکہ وہ لڑکی اِس مجاہد کو اپنے حسن پر فریفتہ کر کے اس کو

عیسائی بنا دے، مگروہ حیا کا مجسمہ اور ایمانی غیرت رکھنے والا مجاہد سارا دن روزہ رکھتا اور ساری رات نوافل پڑھتا، کسی وقت بھی اس حسین وجمیل لڑکی کی جانب نہ دیکھتا، یہ ہے کامل حیا جس کو آپ نے ایمان کا حصّہ فرمایا ہے۔ اس باغیرت اور باحیا کا کردار دیکھ کر وہ لڑکی خود اس پر عاشق و فریفتہ ہو کر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئی، اور اس مجاہد کے ساتھ پروگرام بنایا کہ رات کو بھاگ جائیں گے۔ رات کو دو گھوڑے لا کر مجاہد سے کہا کہ چلو ہم دونوں اس شہر سے دُور بھاگ جائیں اور وہاں ہم نکاح کر لیں گے، چنانچہ وہ رات کو سفر کرتے اور دن کو چھُپ رہتے۔ یہاں تک کہ یہ دونوں ایک رات چلے جا رہے تھے کہ چند سواروں کے گھوڑا دوڑانے کی آواز آئی۔ پہلے تو ڈرے، پھر جب مجاہد نے قریب پہنچ کر دیکھا، تو وہ اس کے دونوں بھائی تھے، جو تیل میں ڈالے گئے تھے، اور اُن کے ساتھ چند فرشتوں کی جماعت تھی۔ مجاہد نے دونوں بھائیوں کو سلام کیا، اور حال دریافت کیا، تو انہوں نے بتایا کہ صرف ایک لمحہ کے لئے تکلیف ہوئی، شہید ہوتے ہی ہم جنّت میں پہنچ گئے اور اب ہم اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے یہاں آئے ہیں تاکہ اس نیک لڑکی کے ساتھ تمہارے نکاح میں شرکت کریں، دونوں شہید بھائیوں نے فرشتوں کے ساتھ ان کے نکاح میں شرکت کی اور روانہ ہو گئے۔ (شرح الصدور)

یہ تو تھا ہمارے اسلاف کا دَور اور اُن کا کردار کہ مردِ مومن مردِ مجاہد کا تقویٰ و پرہیزگاری اور ایمانی غیرت اور حیا کو دیکھ کر غیر مسلم عورت مسلمان ہو گئی۔

ہمارا دَور

ایک یہ ہمارا دور اور کردار کہ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ مسلم معاشرہ میں صِفتِ حیا مفقود ہو گئی ہے۔ بے حیائی، عریانی اور فحاشی عروج پر ہے۔ ٹی وی اور وی سی آر کے ذریعہ سے فحش مناظر دیکھے جا رہے ہیں۔ نہ والدین میں غیرت اور نہ بھائیوں میں حیا نہ خاوندوں کو شرم کہ اُن کی عورتیں بن ٹھن کر بازاروں کی زینت بن رہی ہیں اور اپنے حُسن کا برسرِ عام اظہار کر رہی ہیں اور دعوتِ نظارہ دے رہی ہیں اور اوباش لڑکے جو راہ گو

میں کھڑے ہو کر طرح طرح کی شرارتیں کرتے ہیں اور فقرہ بازی کرنے سے نہیں چوکتے، انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ اُن کی اپنی مائیں بہنیں بھی اس کی زد میں آسکتی ہیں؟ نہ مردوں میں غیرت ہے نہ عورتوں میں حیاء، بے پردگی اور بے حیائی عام ہو گئی ہے منگنی، شادی، سالگرہ اور اس طرح کی خوشی کے مواقع پر جو بے حیائی اور بے حجابی کا مظاہرہ ہوتا ہے الامان والحفیظ! مزید برآں ظلم یہ کہ وہ تمام فحش مناظر ویڈیو کے ذریعے محفوظ کیے جاتے ہیں اور عرصہ دراز تک گھروں میں دیکھے جاتے ہیں۔" یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود" کچھ دُور پیچھے جائیں تو اُس وقت بڑوں کی حیاء کی جاتی تھی اور عورتیں بڑوں کو دیکھ کر پردہ کر لیا کرتی تھیں، اور حیا کیا کرتیں، لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہو گیا ہے، کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، باپ ہو یا بھائی، بوڑھا ہو یا جوان، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ حیا کریں، جبکہ اس حدیث سے اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے کہ حیا مومن کی بڑی انمول اور نہایت ہی گراں قدر صفت ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس مومن میں حیا نہ ہو وہ سمجھ لے کہ ایمان کی ایک عظیم صفت سے محروم ہو گیا اور حد درجے کا اس کا ایمان ناقص ہو گیا، اِسی لئے عرب کی ایک بہت پُرانی کہاوت ہے:

اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ۔ جس کا فارسی ترجمہ یہ ہے:

"بے حیا باش ہرچہ خواہی کُن" یعنی "جب تمہارے اندر حیا اور غیرت نہیں رہی، تو پھر جو چاہو سو کرو۔"

مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں کو چشم بصیرت عطا فرمائے اور ایمانی غیرت اور شرم و حیا نصیب فرمائے۔

مسلمان عورت سے خطاب!

ے تو اپنے آپ کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا
نظر اُٹھنے سے پہلے ہی جھکا لیتی تو اچھا تھا

کھانا کھِلانا اور ہر ایک کو سلام کرنا

(۴) عَنِ ابْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَءُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ۔

(بخاری شریف جلد اول ص۶ ـ مسلم شریف جلد اوّل ص۴۸)

حلِّ لغات: اَیُّ: کونسا۔ تُطْعِمُ: کھلائے تو۔
عَرَفْتَ: پہچانے تو

ترجمہ: "حضرت عبد اللہ[1] بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا: کون سا اسلام بہتر ہے۔؟ آپ نے ارشاد فرمایا: کھانا کھلانا اور ہر مسلمان کو سلام کہنا، چاہے تو اس کو پہچانے یا نہ پہچانے۔"

---

[1] ابو محمد عبد اللہ بن عمرو بن عاص بن وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہما: باپ سے پہلے اسلام لائے، عالم و فاضل تھے۔ قرآن کریم اور کتب سابقہ کو پڑھا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے رضا اور غضب میں کتابتِ حدیث کی اجازت طلب کی، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اجازت فرمائی اور فرمایا، میں ہر حالت میں سچ (حق) ہی کہتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سوائے عبد اللہ بن عمرو بن عاص کے اور کوئی مجھ سے زیادہ حافظ الحدیث نہ تھے، کیونکہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے۔ باپ کے ساتھ فتحِ شام میں حاضر رہے۔ یرموک کے دن اپنے باپ کا جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھا۔ صفین میں بھی باپ کے ساتھ تھے، مگر بعد میں نادم ہوئے۔ ۶۳ھ میں وفات پائی۔ آپ کے سنِ وفات میں بہت اختلاف ہے۔ ۷۲ سال عمر پائی اور بقولِ بعض ۹۲ سال زندہ رہے۔ ابن بکیر نے ۹۰ اور ۷۰ میں شک کیا ہے (اسد الغابہ ۳ ص۲۵۶)

تشریح: اس حدیث میں سائل نے اسلام کی بہتر اور نفع بخش خصلتوں کے متعلق سوال کیا ہے، کیونکہ اُس نے کہا کہ اَیُّ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ۔

”فتح الباری“ والے فرماتے ہیں اس کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی کونسی خصلت بہتر ہے۔ خیر کا معنی نفع بخش ہے، اس کے مقابلہ میں شر یعنی نقصان دہ۔ آپ نے سائل کے جواب میں دو بہت ہی بہتر اور نفع بخش خصلتوں کا ذکر فرمایا۔ ایک حاجت مند کو کھانا کھلانا اور دوسرا ہر مسلمان کو سلام کہنا چاہیے، اس کو چاہے جانتا پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان دو خصلتوں کی تخصیص کیا ہے اور وجہ کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اچھے اخلاق کی دو قسمیں ہیں: ایک بدنیہ، ایک مالیہ۔ کھانا کھلانا مالیہ کی جانب اشارہ کرتا ہے، اور اور سلام کہنا بدنیہ کی طرف اشارہ ہے اور ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت ان دونوں کی حاجت زیادہ تھی کیونکہ مشقت کا وقت اور تالیفِ قلوب کی مصلحت تھی۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ جب آپ مدینہ منورہ (زادھا اللہ شرفاً وکرامۃً) میں تشریف فرما ہوئے تو اوّلاً آپ نے اِن دونوں پر اہلِ مدینہ کو اُبھارا جیسا کہ امام ترمذی علیہ الرحمہ نے حضرت عبداللہ بن سلام[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

---

[1] آپ یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے، سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چہرۂ انور دیکھ کر مسلمان ہوگئے۔ جب اہلِ کتاب کے بارے میں قرآنِ کریم میں یہ نازل ہوا کہ اہلِ کتاب آپ کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو، تو آپ نے دیکھتے ہی فرمایا بیٹے میں تو پھر بھی شک ہو سکتا ہے لیکن آپ کے رسول اور نبی ہونے میں ذرّہ برابر شک نہیں ہے، آپ ہی کے متعلق یہ آیت کریمہ (ترجمہ) ”اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔“ نازل ہوئی ہے جبکہ آپ نے یہودیت کی طرف قدرے میلان کی وجہ سے اونٹ کا گوشت ترک فرمایا کہ اسلام میں کب فرض ہے اور یہودیت میں تو منع ہے، تو اُن کو متنبہ فرمایا گیا کہ یہودیت کی طرف ذرہ برابر بھی میلان نہ کرو اور اسلام میں مکمل داخل ہو جاؤ، تو آپ نے توبہ فرمائی۔ آپ کے بہت سے فضائل ہیں۔ ۱۲ منہ

روایت فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب میں نے سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرۂ انور کی زیارت کی تو پہچان گیا : اِنَّ وَجْہَہٗ لَیْسَ بِوَجْہِ کَذَّابٍ۔
"یعنی آپ کا چہرہ ایسا روشن اور منور ہے، کسی جھوٹے کا چہرہ ایسا نہیں ہو سکتا"
اور پہلی کلام جو میں نے آپ سے سُنی، وہ یہ تھی۔ آپ نے ارشاد فرمایا :

اَیُّھَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ	اے لوگو سلام کرنا عام کرو اور کھانا کھلاؤ
وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصَلُّوا بِاللَّیْلِ	اور نماز پڑھو رات کے وقت، جب کہ لوگ
وَالنَّاسُ نِیَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ	سوئے ہوئے ہوں، داخل ہو جاؤ گے جنت
بِسَلَامٍ۔ (عینی جلد اول ص۱۳۹)	میں سلامتی کے ساتھ۔

اطعام الطعام

اس حدیث میں پہلی جس خصلت کو خیر فرمایا گیا ہے وہ ہے کھانا کھلانا۔ اس میں مفعول کا ذکر نہیں یعنی کس کو کھلانا، جس میں مفعول کی تعمیم کی طرف اشارہ ہے، یعنی ہر حاجت مند کو چاہے اپنا ہو یا بیگانہ چاہے اقارب سے ہو یا اجانب سے، یہاں تک کہ چاہے انسان ہو یا حیوان، اس پر دلیل یہ بھی ہے کہ ایک شخص کی بخشش اس وجہ سے ہو گئی کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلایا۔ کھانا کھلانے کی کئی صورتیں ہیں، کم سے کم مستحب، اور اعلیٰ درجے فرض کا ہے جیسا کہ روزہ اور ظہار کے کفارہ میں کبھی کھانا کھلانے سے کفارہ ادا ہونا اور کفارہ ادا کرنا لازم ہوتا، کفارۂ قسم میں بھی کھانا کھلانے کا ذکر موجود ہے۔ عقیقہ، قربانی میں کھلانا اور گوشت تقسیم مسنون و مندوب ہے، اور ولیمہ میں کھانا کھلانا مسنون ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ نام و نمود اور داد و دہش کے لئے نہ ہو، کیونکہ ریاکاری، تصنع سے بڑے سے بڑے نیک عمل کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے، جیسا کہ آجکل مروجہ ولیمہ کی تقریب سے ظاہر ہوتا ہے، اہل و عیال کا نان و نفقہ بھی لازم ہوتا ہے اور والدین، بہن بھائی اگر حاجت مند ہوں، تو ان کو کھانا کھلانے کا اور خدمت کرنے کا دوسرا اجر ہوتا ہے

صلہ رحمی اور صدقہ کا ثواب ملتا ہے، حاجتمندوں، ناداروں اور مفلسوں کو کھلانا صدقہ ہے اور جتنی روایات صدقہ کے فضائل میں وارد ہیں، وہ کھانا کھلانے کو بھی شامل ہیں، کیونکہ خاص میں عام پایا جاتا ہے۔ مطلق صدقہ عام اور اطعام الطعام خاص جو عام کی فضیلت، وہی خاص کی فضیلت ہے، اقارب پر صدقہ میں دوگنا اجر صدقہ اور صلہ رحمی کا ثواب، جیسا کہ مقولہ ہے کہ پہلے خویش پھر درویش۔ اب چند روایات مزید لکھی جاتی ہیں، جو صدقہ کے فضائل میں وارد ہیں؛

فضائل صدقہ

سیدِ عالم نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے صدقہ کے بارے میں ارشاد فرمایا:۔

اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ — مسکین پر صدقہ کرنے کا ایک صدقہ کا ثواب

وَهِيَ عَلٰى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ — ہے اور رشتہ دار پر صدقہ کرنے کا دوہرا

صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ۔ (مشکوٰۃ ص۱۷۱) — ثواب ہے، ایک صدقہ کا اور ایک صلہ رحمی کا۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ اپنے رشتہ داروں کو جو غریب و مسکین ہوں، ان کو صدقہ دینا اور اُن پر خرچ کرنا اور اُن کو کھلانا دوہرا ثواب ہے، مگر اکثر لوگوں کے خاندان میں ہم نے دیکھا ہے کہ غریب و نادار اور حقدار لوگ موجود ہوتے ہیں اور وہ مبتلائے فقر و فاقہ اور بھوکے مرتے ہیں اور رشتہ دار اغنیاء ان کی طرف خیال نہیں کرتے اور دوسروں پر خرچ کرتے ہیں، اوروں پر خرچ کرنے سے بڑے سخی خیال کئے جاتے ہیں، لوگ ان کی تعریف کرتے ہیں، اخباروں میں ان کی تصویریں چھپتی ہیں، جس پر وہ زیادہ خوش ہو کر مختلف انجمنوں، اداروں، ویلفیئر سوسائٹیوں اور احباب کو دل کھول کر امداد دیتے ہیں اور قرابت داروں کا خیال کبھی بھول کر بھی نہیں کرتے۔ مولیٰ تعالیٰ اُن کو ہدایت دے کہ وہ پہلے اپنے قرابت داروں پر خرچ کریں تاکہ دوہرے ثواب کے مستحق ٹھہریں اللہ تعالیٰ انہیں ریاکاری اور تصنع و بناوٹ سے محفوظ فرمائے۔

خُداتعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے رزق بڑھتا ہے

ہمیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے مال میں کمی ہوجائے گی، اور ہم فقیر ہوجائیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیبِ مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ راہ خدا میں خرچ کرنے سے مال میں برکت ہوتی اور مال بڑھتا ہے، اس میں کمی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَھُوَ یُخْلِفُہٗ وَھُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ۝ (پ ۲۲) — اور جو چیز تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو، وہ اس کے بدلے میں اور دے گا اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

حضور سیّدِ عالم شفیعِ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنْفِقُوْا یَا ابْنَ اٰدَمَ اُنْفِقْ عَلَیْکَ (مشکوٰۃ ص۱۶۴) — رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابنِ آدم! خرچ کر، میں بھی خرچ کروں گا۔

خداوند قدوس جلّ شانہٗ نے ارشاد فرمایا:

یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ط (الآیۃ) — اللہ تعالیٰ سُود کو ہلاک کرتا ہے، اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

صدقہ سے مصیبتیں ٹلتی ہیں

حضرت سیدنا امیر المومنین علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بَادِرُوْا بِالصَّدَقَۃِ فَاِنَّ الْبَلَاءَ لَا یَتَخَطَّاھَا (مشکوٰۃ) — صدقہ کرنے میں جلدی کرو، بیشک اس سے بلائیں تجاوز نہیں کرتیں۔

اِن روایات سے معلوم ہوا کہ صدقہ کرنے والے اور کھانا کھلانے والوں کا اپنا ہی

فائدہ ہے، مال میں برکت ہوتی ہے مصیبتیں ٹلتی ہیں اور ثواب ملتا ہے۔

حکایت: ایک شخص جنگل میں جا رہا تھا اُس نے ایک بدلی میں سے یہ آواز سُنی کہ فلاں شخص کے باغ کو سیراب کر، پس وہ بادل وہاں سے چلا اور ایک سنگستان میں برسا، وہاں سے ایک نالی پانی سے بھری ہوئی چلی۔ یہ شخص اس پانی کے ساتھ ساتھ روانہ ہوا، چلتے چلتے دیکھا کہ ایک شخص اپنے باغ میں کھڑا ہے جو اپنے بیلچے سے پانی باغ کو لگا رہا ہے۔ اُس شخص نے باغ والے سے نام پوچھا تو اس نے وہی نام بتایا جو اُس نے بادل سے سنا تھا۔ باغ والے نے پوچھا تو میرا نام کیوں پوچھ رہا ہے، اُس نے کہا میں نے تیرا نام بادل میں سے سُنا تھا، جس کا یہ پانی ہے کہ اس کو حکم دیا گیا کہ تیرے باغ کو سیراب کرے۔ اچھا بتاؤ کہ تم باغ میں کیا کرتے ہو۔ اُس نے کہا کہ اس باغ کی آمدنی کا تہائی حصہ صدقہ کر دیتا ہوں اور ایک تہائی سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالتا ہوں اور ایک تہائی پھر اس باغ کی آبادی میں خرچ کرتا ہوں۔

یہ ہے صدقہ کی برکات اور اس کے فوائد۔

(یہ واقعہ مسلم شریف میں مذکور ہے، بحوالہ مشکوٰۃ شریف ص۱۶۸)

میّت کی طرف سے صدقہ کرنا فائدہ مند ہے: جس طرح صدقہ کرنے کا ثواب صدقہ کرنے والے کو ہوتا ہے اگر اس کا ثواب مُردوں کو ایصال کر دیا جائے، تو وہ ثواب مُردوں کو پہنچتا ہے اور ان کو نفع اور فائدہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب و سُنّت سے ثابت ہے، یہاں صِرف ایک حدیث درج کی جاتی ہے:

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا

یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ اُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ فَاَیُّ الصَّدَقَۃِ اَفْضَلُ قَالَ اَلْمَاءُ فَحَفَرَ بِئْرًا وَقَالَ ھٰذِہٖ لِاُمِّ سَعْدٍ۔ (مشکوٰۃ)	یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بے شک سعد کی والدہ فوت ہو گئی (اُس کیلئے) کونسا صدقہ افضل ہے۔ آپ نے فرمایا پانی پس انہوں نے ایک کنواں کھدوایا اور کہا کہ یہ ام سعد کے لئے ہے

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میّت کی طرف صدقہ کرنا اور اس کو ایصالِ ثواب کرنا جائز اور امرِ مستحسن و مندوب ہے اور اموات کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اہل سنّت و جماعت کے معمولات ختم قل شریف۔ دسواں اور چالیسواں وغیرہ کا بھی ثبوت مِل جاتا ہے کہ ان سب میں ایصالِ ثواب ہی ہوتا ہے۔

فائدہ: مندرجہ بالا حدیث سے ایک یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اس میں کھانا کھلانے کی ترغیب دلائی ہے، جو جُود و سخاوت کی علامت ہے اور اچھے اخلاق کی نشانی ہے اور اس میں محتاجوں کا نفع اور اُن کی دُعا کا حصول اور اُن کی بھوک کا سدِّ باب ہے، جس بھوک سے رسُولِ خدا صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے پناہ مانگی ہے۔

سَلام کہنا اس حدیث میں دوسری عظیم خصلت، جس کو آپ نے خیر فرمایا ہے، وہ ہر مسلمان کو سلام کہنا چاہیئے، چاہے اس کو جانتا ہو، چاہے نہ جانتا ہو، اس میں سلام کو پھیلانے پر ابھارنا ہے جو محبت و مودّت کی علامت اور تواضع و انکسار کی نشانی ہے اور ایک دُوسرے کے لیئے سلامتی کی دُعا اور تعمیمِ سلام سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ متکبرین کی طرح سلام کو بعض کے ساتھ خاص نہ کرے کہ بعض کو سلام کہتا ہے اور بعض کو نہیں کہتا بلکہ بلا تمیز ہر مسلمان کو سلام کہے، کیونکہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور اخوتِ اسلامی میں سب برابر ہیں، جیسا کہ قرآن پاک میں بھی ہے:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ﴿ ﴾	جب تم کو سلام کہا جائے، تو تم اُن سے بہتر لفظ میں جواب دو، یا وہی کلمہ کہہ دو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام کا جواب کہنا لازم ہے، بلکہ سلام کہنے والے کے سلام کے جواب میں اس سے اچھے سے اچھے الفاظ سے جواب دے، مثلاً اس نے کہا

السّلام علیکم تو جواب میں کہے وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ، علیٰ ہذا القیاس!

سوال: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کو سلام کہے، تو کیا کافر و منافق کو بھی سلام کہا جائے گا؟

جواب: دیگر دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رعایت کافروں سے نہیں برتی جائے گی، لہٰذا کافر کو پہلے سلام کہنا منع ہے۔ سرکارِ دو عالم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے فرمایا: یہود و نصاریٰ کو پہلے سلام نہ کہو؛ جب اُن میں سے کوئی راستہ میں مِل جائے تو اُس کے لئے راہ خالی نہ کرو، بلکہ اسے تنگ راستہ میں چلنے پر مجبور کرو۔

(بخاری شریف بحوالہ عمدۃ القاری)

تاہم اگر کسی مجبوری سے اُن کو سلام کہنا یا جواب دینا ہی پڑ جائے تو اُس کے ساتھ جو فرشتے ہوتے ہیں، اُن کی نیّت کرے، بلکہ ان الفاظ سے سلام کہے اور لکھے:

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔

سلام کہنے کے فضائل

سلام کہنے کی ابتدا حضرت سیّدنا ابو البشر آدم علیہ السّلام سے ہوئی، جیسا کہ حدیث میں ہے:

"جب آپ کو پیدا فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو فرمایا فرشتوں کے پاس جا کر اُن کو سلام کرو اور سنو وہ کیا جواب دیتے ہیں؟ جو کچھ وہ تحیت کریں وہی تمہاری اور تمہاری اولاد کی تحیت ہے۔ آپ نے اُن کے پاس جا کر السلام علیکم! تو انہوں نے جواب میں السّلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے ارشاد فرمایا ایک مومن کے دوسرے مومن پر چھ حق ہیں، جب[1] وہ بیمار پڑ جائے تو اُس کی عیادت کرے اور جب[2] مر جائے، تو اُس کے جنازے میں حاضر ہو اور جب[3] وہ بُلائے تو اُس کی دعوت قبول کرے اور جب[4] اس سے ملاقات ہو سلام کرے اور جب[5] چھینکے، تو جواب دے اور حاضر و غائب میں اُس کی خیر خواہی کرے۔ (نسائی شریف بحوالہ بہارِ شریعت)

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں تم نہیں جاؤ گے، جب تک تم ایمان نہ لاؤ گے، تم مومن (کامل) نہیں بن سکتے، جب تک تم آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں کہ جب تم اسے کرو گے تو آپس میں محبت کرنے لگو گے، وہ یہ ہے کہ آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔ (بحوالہ بہار شریعت)

ایک روایت میں ہے کہ رسولِ خدا حبیبِ کبریا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اے بیٹے! جب گھر والوں کے پاس جاؤ تو انہیں سلام کرو، تم پر اور تمہارے گھر والوں پر اس کی برکت ہو گی۔ (ترمذی شریف)

افسوس اس زمانہ میں کتنے لوگ ہیں جو اپنے گھروں میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے اہل و عیال کو سلام کہتے ہیں؟ بلکہ سلام کہنے میں خیر و برکت حاصل کرنے کی بجائے عار محسوس کرتے ہیں، اور آپس میں ملاقات کے وقت نصاریٰ کے طریقہ پر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں اور زبان سے سلام پیش نہیں کرتے، جبکہ سلام کہنا سنّت بھی ہے اور دعا بھی ہے، وہ دعا سے محروم رہتے ہیں۔

سلام کہنے کے مسائل

سلام کہنے میں یہ نیّت ہو کہ اس کی عزت و آبرو اور مال سب کچھ اس کی حفاظت میں ہے۔ ان چیزوں سے تعرض کرنا حرام ہے۔ (ردّ المحتار)

مسئلہ: صرف اسی کو ہی سلام نہ کرے، جس کو جانتا پہچانتا ہو، بلکہ ہر مسلمان کو سلام کرے، چاہے پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو (جیسا کہ اوپر والی حدیث میں صراحتًہ مذکور ہے) بلکہ بعض صحابہ کرام اسی لئے بازار جاتے تھے کہ کثرت سے لوگ ملیں گے اور زیادہ سلام کرنے کا موقع ملے گا۔

مسئلہ: سلام کرنا سُنّت ہے اور اس کا جواب دینا واجب ہے۔ اسی لیے فقہاء

کا اختلاف ہے۔ بعض سلام کا جواب دینا افضل سمجھتے ہیں کہ وہ واجب ہے اور بعض سلام کرنا افضل کہتے ہیں کہ اس میں تواضع ہے۔ جواب تو سب دے دیتے ہیں، مگر سلام کرنے میں بعض مرتبہ بعض لوگ کسرِ شان سمجھتے ہیں اور سلام نہیں کرتے۔ (عالمگیری)

مسئلہ: ایک شخص کو سلام کرے، تو اس کے لئے بھی جمع کا لفظ ہونا چاہیے، یعنی السّلام علیکم؛ اور جواب دینے والا بھی وعلیکم السّلام کہے صرف علیکم یا علیک نہ کہے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ سلام کہنے والا بھی السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کہے اور جواب دینے والا بھی کہے وعلیکم السّلام وبرکاتہ۔ اس سے زائد الفاظ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (عالمگیری)

مسئلہ: جن لوگوں کو اُس نے سلام کیا، ان میں سے کسی نے جواب نہ دیا، بلکہ کسی شخص نے جواب دیا، جو ان مجلس والوں سے نہ تھا، تو وہ لوگ بری الذمہ نہ ہوں گے۔ (ردالمحتار)

مسئلہ: ایک شخص بیٹھا ہے اور دُوسرا یہاں سے گزر رہا ہے، تو یہ گزرنے والا بیٹھے کو سلام کرے اور چھوٹا بڑے کو اور سوار پیدل کو سلام کرے اور تھوڑے زیادہ کو سلام کریں۔ ایک شخص پیچھے سے آیا یہ آگے والے کو سلام کرے۔ (بزازیہ)

مسئلہ: مرد کی اپنی عورت (یا محرم عورت) سے ملاقات ہو تو مرد عورت کو سلام کرے۔ اگر عورت اجنبیہ نے مرد کو سلام کیا اور وہ بوڑھی ہو تو اس طرح جواب دے کہ وہ بھی سُنے اور اگر جوان ہو تو اس طرح جواب دے کہ وہ نہ سُنے۔ (خانیہ)

مسئلہ: کفّار کو سلام نہ کرے اگر وہ سلام کریں، تو جواب میں علیکم کہے۔ اگر ایسی جگہ سے گزرے کہ کفّار اور مسلمان دونوں ہوں، تو مسلمانوں کی نیت سے سلام کرے یا اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی کہے۔ اگر کافر کو سلام کرنے میں کسی شے کا اندیشہ ہو تو اس کو سلام کہنے میں کوئی حرج نہیں، (مگر فرشتوں کی نیت کرے) اور

بقصدِ تعظیم کافر کو سلام ہرگز ہرگز نہ کرے، کیونکہ کافر کی تعظیم کفر ہے۔ (درِ مختار)

مسئلہ: سلام اس لیئے ہے کہ ملاقات کرنے کو جو شخص آئے، وہ سلام کرے کہ یہ ملاقات کرنے والے کی تحیت ہے، لہٰذا جو مسجد میں آیا اور حاضرینِ مسجد تلاوتِ قرآن و تسبیح و درود میں مشغول ہیں یا انتظارِ نماز میں بیٹھے ہیں، اُن کو سلام نہ کرے کہ یہ سلام کا وقت نہیں اور ان کو جواب دینا لازم نہیں ہے۔ (عالمگیری)

سلام کب نہ کہا جائے

اذان و اقامت کے وقت، خطبہ جمعہ اور عیدین کے وقت، جو تلاوت یا درس و تدریس یا علمی گفتگو، یا سبق کے تکرار میں مشغول ہو یا ایک شخص وعظ و تقریر کر رہا ہے اور باقی لوگ سُن رہے ہیں، یا عالمِ دین تعلیم میں مشغول ہے اور طالبِ علم آیا۔ اسی طرح قاضی صاحب کے پاس جب لوگ مقدمات لے کر جائیں، تو اُن کو سلام نہ کہا جائے۔ جو شخص پیشاب یا خانہ کر رہا ہے یا کبوتر اڑا رہا ہے یا گانا گا رہا ہے یا حمام یا غسل خانہ میں ننگا نہا رہا ہے، پیشاب کرنے کے بعد ڈھیلا لے کر استنجا کرنے والا، ان سب کو سلام نہ کہا جائے (بہارِ شریعت)

مسئلہ: کسی سے کہا کہ میرا سلام فلاں شخص کو پہنچا دینا، جب اس نے التزام کر لیا تو پہنچانا واجب ہے اور جب اس کو سلام پہنچایا جائے، تو وہ اس طرح جواب دے:

وعلیک و علیہ السلام!

مسئلہ: خط میں سلام لکھا ہو تو اس کا جواب دینا بھی واجب ہے، چاہے زبان سے اور چاہے جواب لکھ کر، لیکن عموماً جواب دیر میں لکھا جاتا ہے، اس لیئے زبان سے فوراً جواب کہہ دے۔ سیدنا اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طریقہ یہ تھا کہ خط میں جب سلام کا لفظ پڑھتے، تو اسی وقت جواب کہتے، باقی مضمون بعد میں پڑھتے۔

مسئلہ: انگلی یا ہتھیلی سے سلام کرنا ممنوع ہے۔ بعض لوگ سلام کا جواب ہاتھ یا سر سے یا آنکھوں کے اشارہ سے دیتے ہیں، اِس طرح جواب نہیں ہوتا، بلکہ منہ

سے جواب دینا لازم ہے۔ بعض لوگ سلام کرتے جھک بھی جاتے ہیں۔ یہ جھکنا اگر حد رکوع[1] تک ہو تو حرام، ورنہ مکروہ۔

مسئلہ: کسی شخص کے نام کے ساتھ علیہ السلام کہنا درست نہیں۔ یہ انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے۔ نبی اور فرشتہ کے سوا کسی دوسرے کے نام کے ساتھ علیہ السلام نہ کہا جائے۔

مسئلہ: سلام کی میم کو ساکن پڑھا جائے، جیسا کہ اکثر جاہل کرتے ہیں۔ میم کو پیش کے ساتھ کہا جائے۔ سلامُ علیکم، تو یہ سلام مسنون نہیں، اور نہ اس کا جواب لازم۔ یا سلامٌ علیکم کہے یا السلام علیکم کہے (اور یہ بہتر ہے) اور اتنی آواز سے کہے کہ جس کو سلام کیا جائے، وہ سُن لے اور جواب دینے والا بھی اتنی آواز سے جواب دے کہ سلام کرنے والا سُن لے۔ ہاں اگر وہ بہرہ ہو تو اس کے سامنے ہونٹوں کو اس طرح جنبش دے کہ وہ جواب سمجھ جائے۔

(یہ تمام مسائل اور حوالہ جات بہارِ شریعت سے لیے گئے ہیں)

کون مسلمان افضل ہے؟

حدیث ۵: عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ۔ (بخاری جلد اول ص۶ مسلم جلد اول ص۴۸)

ترجمہ: "حضرت ابو موسیٰ اشعری[2] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) کونسا اسلام افضل ہے؟ تو ارشاد فرمایا اس شخص کا اسلام، جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان رہیں۔"

---

[1] اگر ہاتھ سیدھے کرے، تو زانو تک پہنچ جائیں - ۱۲ منہ [2] حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

تشریح اس حدیث پاک کو مسلم اور نسائی نے کتاب الایمان میں، ترمذی نے کتاب الزہد میں ذکر کیا ہے۔ مسلم نے اس حدیث سے قبل اسی مضمون کی روایت کی ہے، جس میں اَیُّ الْمُسْلِمِیْنَ خَیْرًا کے الفاظ ہیں۔ اسی روایت کے پیشِ نظر فتح الباری میں درج ہے کہ اس حدیث میں بھی ای الاسلام کے لفظ میں مضاف محذوف ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہوگی ای ذوی الاسلام افضل۔ اب ترجمہ یہ ہوگا کہ "کون سا مسلمان افضل ہے؟" اب جواب کی مطابقت بھی ظاہر ہو جائے گی۔ بہرحال اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں افضل وہ مسلمان ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے تمام مسلمان سلامت رہیں۔ نہ وہ کسی مسلمان کو اپنی زبان سے تکلیف دے اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کسی مسلمان کو تکلیف پہنچائے۔

لے (حاشیہ گزشتہ صفحہ) حضرت ابو موسیٰ عبداللہ بن قیس الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ: واقدی نے لکھا ہے کہ ابو موسیٰ مکہ مکرمہ حاضر ہوئے۔ سعید بن عاص بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حلیف بنے۔ اشعریوں کی جماعت میں اپنے بھائیوں سمیت مکہ مکرمہ آئے، پھر اسلام لائے اور حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ بعض علماء سیر کہتے ہیں کہ ابو موسیٰ جب مکہ مکرمہ میں آئے اور سعید بن عاص کے حلیف ہوئے، اپنے وطن چلے گئے اور حبشہ کی جانب ہجرت نہیں کی۔ پھر اپنے بھائیوں کے ساتھ واپس آرہے تھے کہ مہاجرین حبشہ سے ملاقات ہوئی اور اُن کے ساتھ آگئے۔ صحیح یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ مکہ آنے اور حلیف ہونے کے بعد واپس آگئے کچھ عرصہ بعد پچاس اشعریوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر مکہ آرہے تھے کہ بادِ مخالف نے انہیں حبشہ پہنچا دیا۔ وہاں سے مہاجرین حبشہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ مکہ آئے۔ اشعریوں اور مہاجرین حبشہ کی دو کشتیاں آئیں، جبکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فتح خیبر کر چکے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ اشعریوں کو بادِ مخالف نے حبشہ پہنچا دیا۔ کچھ عرصہ حبشہ میں رہ پڑے۔ پھر مہاجرین حبشہ کے ساتھ آئے، اسی لئے ابن اسحٰق نے مہاجرین حبشہ میں ان کا ذکر کیا ہے واللہ اعلم! (باقی آئندہ صفحہ پر)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث نمبر ۴ میں ہے کہ بہتر مسلمان وہ ہے جو کھانا کھلائے اور سلام کو پھیلائے اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "افضل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کی شر سے مسلمان محفوظ رہیں۔" بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، تو ان میں تطبیق کس طرح ہوگی؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ سوال کرنے والے اور سامعین کے اعتبار سے جوابات مختلف ہیں یعنی جن اہل مجلس میں مال خرچ کرنے اور سلام کرنے میں کمی تھی، ان کو اس حدیث ۴ والا جواب دیا گیا اور جن کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ نہ تھے، اُن کے حال کے مطابق اس حدیث میں جواب دیا گیا۔ دُوسرا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن کو زبید اور عدن کا عامل بنایا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُن کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر شام میں حاضر ہوئے۔ سنہ ۱۹ھ میں تصیبین فتح کیا، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم پر اہواز کو فتح کیا۔ سنہ ۲۳ھ میں اصبہان فتح کیا اور ابو موسیٰ بصرہ کے عامل تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابتداءً ان کو بصرہ کا حاکم رہنے دیا۔ پھر انہوں نے ان کو معزول کر دیا اور اُن کو معزول کر دیا اور ابن عامر کو بصرہ کا عامل بنا دیا۔ ابو موسیٰ کوفہ چلے آئے، یہاں تک کہ اہل کوفہ نے سعید بن العاص عامل کو نکال دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ابو موسیٰ کے عامل بنانے کا مطالبہ کیا، تو انہوں نے انہیں عامل بنا دیا۔ یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے ان کو معزول کر دیا۔ تحکیم کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی طرف سے ابن عباس کو حکم بنانا چاہتے تھے، مگر اہل یمن نے زور دے کر ابو موسیٰ کو حکم بنوایا۔ ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کوفہ میں ہوئی اور بعض نے کہا ہے کہ مکہ میں، سنہ ۴۲ھ اور بقول بعض سنہ ۴۴ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ بعض نے سن وفات سنہ ۴۹ھ اور بعض نے سنہ ۵۰ھ اور بعض نے سنہ ۵۲ھ اور بعض نے سنہ ۵۳ھ کہا ہے۔ (اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۴۵)

ایک دوسرے کو لازم ہیں کہ کھانا کھلاتے کو ہاتھ کی ایذا رسانی سے سلامتی لازم ہے۔ جب ناداروں کو کھلا رہا ہے تو تکلیف کس طرح دے گا اور سلام کہنے کو زبان کی شر سے سلامتی لازم ہے۔ جب زبان سے سلامتی کی دُعا کر رہا ہے تو زبان سے تکلیف کس طرح پہنچائے گا۔ یہ جواب "فتح الباری" میں بحوالہ کرمانی درج ہے۔[1]

اور ایک جواب یہ ہے کہ اعمال دو قسم پر ہیں: ایک مثبت اور دوسرے منفی۔ مثبت اعمال میں کھلانا پلانا اور سلام کہنا افضل ہے۔ اور منفی اعمال میں افضل یہ ہے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ (سعیدی)

بظاہر تو دو اعضا یعنی زبان اور ہاتھ کا ذکر کیا گیا، کیونکہ عام طور پر ان دونوں سے ایذا دی جاتی ہے، لیکن آپ کی مراد یہ ہے کہ افضل مسلمان وہ ہے جو کسی طرح بھی دوسرے مسلمان کو ایذا اور تکلیف نہ پہنچائے۔

پھر آپ نے زبان کا ذکر پہلے فرمایا، کیونکہ زبان سے ایذا زیادہ ہوتی ہے۔ پہلے زبان سے گالی گلوچ ہوتا ہے، پھر ہاتھ سے ایذا دی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زبان سے ایذا قریب و بعید کو دی جاسکتی ہے، جبکہ ہاتھ پاؤں سے قریب ہی کو تکلیف دی جاسکتی ہے، جو وقت پر مندمل ہو جاتی ہے۔ جبکہ زبان کی ایذا اور تکلیف زیادہ دیر تک رہتی ہے جیسا کہ عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ
وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

"یعنی نیزوں اور بھالوں کے زخم مندمل (درست) ہو جاتے ہیں اور زبان کے زخم کبھی نہیں بھرتے، بلکہ وہ ہمیشہ تازہ ہی رہتے ہیں۔"

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے یعنی اس کے مختصر الفاظ میں مضامین اور احکام

[1] لیکن مناسب ہے اس لزوم سے مراد غالب لیا جائے، یعنی اکثر اس طرح ہوتا ہے۔ ۱۲ عینی

کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اگر تمام مسلمان صرف اس ایک حدیث پر عمل کر لیں تو پھر حقوق العباد کے تمام جزئیات پر عمل کرنے کی سعادت نصیب ہو جائے گی۔

آجکل ہر طرف کی خیانت، چوری، ڈاکہ زنی، بدکاری، چور بازاری، سود خوری، غیبت، چغلی، گالیاں، قتل وغیرہ ہزاروں خرابیاں مسلم معاشرہ میں داخل ہو کر مسلمانوں کی ایذا رسانی کا سبب بنی ہوئی ہیں جس سے ملتِ اسلامیہ کا نظامِ عمل تہس نہس ہو کر تباہ و برباد ہو گیا ہے کوئی فردِ مسلم ایسا نہیں ہے جو مسلمانوں ہی سے دکھ اور تکلیف نہ پا رہا ہو۔ اگر اس فرمانِ مصطفےٰ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) کو مسلمان اپنے لیے حرزِ جان اور اپنے اعمال و افعال کا راہنما نشان بنالیں، تو خدا تعالیٰ کی قسم یہ ایک حدیث پوری ملتِ اسلامیہ کے امن و سکون کی ضامن ہے، کیونکہ جب ہر مسلمان اپنی زندگی کا یہ دستور بنائے گا کہ میری کسی حرکت سے کسی مسلمان کو دکھ اور تکلیف نہ پہنچے، تو ظاہر ہے کہ مسلم معاشرہ امن و امان اور راحت و عافیت کا گہوارہ بن جائے گا، نہ تھانہ پولیس کی ضرورت رہے گی اور نہ کچہریوں میں داد رسی اور فریاد رسی کی کوئی حاجت باقی رہے گی۔

زبان کی حفاظت

احکم الحاکمین رب العالمین نے انسان کو زبان اس لئے عطا فرمائی کہ اس کے ساتھ اس کا کثرت سے ذکر کرے اور قرآن پاک کی تلاوت اور درود شریف تسبیح و تہلیل زیادہ کرے، اس لئے نہیں عطا فرمائی کہ بیہودہ گوئی اور فحش کلامی کرے اور بکواس بکے۔

رب العالمین جل شانہٗ ارشاد فرماتا ہے:

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ (القرآن)	بہت سی پوشیدہ باتوں میں بھلائی نہیں سوائے حکم دینے صدقہ کا، یا بھلائی کا، یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا۔

اگر کوئی انسان اپنی زبان سے اچھی بات نہیں کر سکتا، تو اس کے لئے خاموشی ہزار درجہ بہتر ہے۔ آپ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

مَنْ سَکَتَ نَجَا۔ "جس نے خاموشی اختیار کی، وہ نجات پا گیا۔"

ایک دفعہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور پُرنور شافع یوم النشور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا، تمام اعمال میں سے کونسا عمل افضل ہے، تو آپ نے اپنی زبانِ مُبارک باہر نکالی اور اس پہ انگلی رکھ کر اشارہ فرمایا کہ خاموشی۔ (کیمیائے سعادت)

زبان سے عموماً کون سے گناہ ہوتے ہیں؟

انسان عام طور پر زبان سے یہ غلطیاں کرتا ہے، جن سے زبان کو بچانا ضروری ہے، لایعنی گفتگو، فحش کلامی، لعنت کرنا، چغلی اور غیبت، جھوٹ اور جھوٹی قسمیں وغیرہ یہ وہ کوتاہیاں ہیں، جن کے متعلق احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہیں۔

لایعنی گفتگو

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَا یَعْنِیْهِ۔

"غیر ضروری بات کا ترک کرنا حُسنِ اسلام میں داخل ہے۔"

افسوس کہ ہم لوگ اپنا عزیز ترین وقت لایعنی باتوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے ایک نوجوان غزوۂ اُحد میں شہید ہو گیا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ بھوک کی وجہ سے اُس کے پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے تھے، اُس کی والدہ نے اُس کے چہرے سے خاک جھاڑ کر کہا: هَنِيْئًا لَّكَ الْجَنَّةُ "تجھے جنت مبارک ہو۔" تو حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اے اس شخص کی ماں! تجھے کیا خبر! ممکن ہے کہ وہ لایعنی باتیں کرتا ہو۔" (کیمیائے سعادت)

حالانکہ شہادت سبب ہے حصولِ جنت کا، پھر بھی آپ نے فرمایا تو جنت کی مبارک نہ دے، ہو سکتا ہے وہ غیر ضروری باتوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتا ہو؟

فحش کلامی یہ وہ گناہ ہے جس سے انسان کا منہ گندا ہو جاتا ہے۔ نبی اکرم سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"فحش کلامی کرنے والے پر جنت حرام ہے اور دوزخ میں کچھ ایسے لوگ جائیں گے، جن کے منہ سے پلیدی نکلے گی اور تمام اہل دوزخ فریاد کہیں گے اور کہیں گے یہ کون ہیں؟ تو ان سے کہا جائے گا: یہ وہ لوگ ہیں جو فحش کلامی کرتے تھے، اور فحش کلامی کو محبوب رکھتے تھے۔ (کیمیائے سعادت)

لعنت کرنا لعنت کرنے سے ہر مسلمان اپنی زبان بچائے۔ سیدِ دو عالم رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے کہ مومن کسی پر لعنت نہیں کرتا (نہ انسان پر نہ حیوان پر) جو شخص کسی پر لعنت کرے گا اگر وہ لعنت کا حقدار ہے تو اس پر لعنت واقع ہو گی، ورنہ لعنت کرنے والے کی جانب، لعنت لوٹے گی، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم رحمتِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّہٗ مَنْ لَعَنَ شَیْئًا لَیْسَ لَہٗ بِاَھْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَۃُ عَلَیْہِ (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

بے شک جس نے کسی ایسی چیز پر لعنت کی جو اس کی اہل نہ ہو تو وہ لعنت اُس پر لوٹ آئے گی۔

مسئلہ: کسی معین شخص پر لعنت کرنا جائز نہیں، البتہ وہ جس کی موت کفر پر یقینی ہو، جیسے فرعون، ابوجہل، ابولہب، شداد، ہامان، قارون وغیرہ، تو ان پر شخصی لعنت جائز ہے۔ ہاں کلی طور پر لعنت جائز ہے، مثلاً یوں کہے: ظالموں پر لعنت، جھوٹوں پر لعنت، کافروں پر لعنت، فاسقوں پر لعنت۔

چغلی و غیبت چغلی یہ ہے کہ کسی کی بات، جو شر انگیز ہو، وہ دوسرے تک پہنچانا اور دوسرے کی پہلے تک پہنچا کر فتنہ ابھارنا اور

اُن کو آپس میں لڑانا، بلکہ عام عادت یہ ہے کہ تھوڑی سی بات کو بڑھا چڑھا کر ایک دوسرے تک پہنچا دی جاتی ہے، یہ سخت منع ہے۔ ربّ کریم جلّ وعلا کا ارشاد ہے:

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ۔ "خرابی ہے چغلخور کے لئے۔"

دُوسرے مقام پر یہ ہے: اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ "فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔" اس لئے زبان کو چغلی سے بچانا بھی ازحد ضروری ہے اور غیبت یہ ہے کہ کسی کی عدم موجودگی میں وہ بات کہی جائے جو اسے ناگوار ہو اور اس کو تکلیف دہ ہو، اگرچہ وہ عیب اور کوتاہی اس میں سچ مچ ہی ہو، کیونکہ اگر اس پر جھوٹ کہے گا، تو وہ غیبت سے بڑھ کر بہتان ہوگا اور الزام ہوگا۔ غیبت کرنا بہت بُری بات ہے، قرآن کریم نے اس کی مثال اس طرح بیان کی ہے جیسے مُردہ بھائی کا گوشت کھاتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور سیّدِ دو عالم نبیِّ رحمت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بارگاہ میں حاضر تھا کہ ایک شخص آ کر چلا گیا، تو دوسرے شخص نے اس کی غیبت کی، تو حضور نبی اکرم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اس کو فرمایا: "خلال کر۔" اُس نے عرض کی: "میں نے گوشت کھایا تو نہیں، خلال کس وجہ سے کروں؟" تو آپ نے فرمایا: "تو نے اُس کی غیبت کر کے اپنے بھائی کا گوشت کھایا ہے، لٰہذا خلال کر۔"

مقامِ غور ہے کہ یہ کتنا بڑا عیب ہے اور ہم بات بات پر اپنے بھائیوں کی غیبت کرتے ہیں۔ غیبت کرنے میں اللہ جلّ وعلا اور اُس کے رسُولِ مکرّم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے حکم کی خلاف ورزی بھی ہے، اور اس شخص کی حق تلفی بھی ہے، اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ توبہ بھی کرے اور اس سے معافی مانگے اور اگر وہ شخص فوت ہو گیا ہو تو اُس کے لئے استغفار کرے اور دُعا مانگے۔

حضور سیّدِ عالم شفیعِ اعظم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم، چند صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ساتھ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ نے فرمایا: ان دونوں قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے

اور ارشاد فرمایا: وَمَا یُعَذَّبَانِ فِیْ کَبِیْرٍ کسی بڑی بات کی وجہ سے ان کو عذاب نہیں ہو رہا (یعنی جس بات کو تم معمولی سمجھتے ہو) فرمایا: ایک تو پیشاب کے چھینٹوں سے نہ بچتا تھا، اور غیبت کرتا تھا۔ پھر آپ نے ایک ہری (سبز) ٹہنی منگوائی اور دو ٹکڑے فرما کر ایک کی قبر پر اور دوسرا دوسرے کی قبر پر نصب فرما دیا اور ارشاد فرمایا جب تک یہ خشک نہ ہوں گے، ان کے عذاب میں تخفیف رہے گی۔ (زواجر۔ کیمیائے سعادت)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قبر پر پھول ڈالنا اور اس کے پاس تلاوت کرنا اور ذکر کرنا، عذاب میں تخفیف کا باعث ہیں اور لوگوں کی غیبت کرتے پھرنا، عذاب قبر کا سبب ہے، تاہم کسی کا عیب اس لئے بیان کرنا تاکہ دوسروں کو اس کے شر سے بچایا جائے یا حدیث کے راوی پر جرح کرنا تاکہ حدیث کا درجۂ صحت معلوم ہو یا گواہوں پر جرح کرنا تاکہ اُن کی گواہی کی تحقیق ہو یا وہ شخص اتنا بے باک ہے کہ علانیہ گناہ کرتا ہے اور اس سے عار بھی محسوس نہیں کرتا، ایسے اشخاص کی غیبت کرنا جائز ہے یا اُس کے بڑے کو اُس کے عیب اس غرض سے بتانا کہ وہ اس کی اصلاح کرے تو بھی جائز ہے۔ محض تکلیف دینے اور اُس کو رُسوا کرنے کے لئے اس کے عیوب بیان کرنا منع اور ناجائز ہے، اور اُس سے بھی اپنی زبان کو بچانا لازم ہے۔

جھوٹ اور جھوٹی قسمیں

آجکل ہمارے معاشرے میں یہ رواج ہے کہ بات بات پر جھوٹ بولا جاتا ہے اور جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں اور جھجک محسوس نہیں کرتے۔ جھوٹ کے ذریعے سے کاروبار کو فروغ دیا جاتا ہے، بلکہ اس حرکت کو جائز سمجھا جاتا ہے کہ جھوٹ کے بغیر کاروبار ہو ہی نہیں سکتا، حالانکہ ربِّ کریم جل وعلا کا ارشادِ گرامی ہے:

لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ "جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت"

سرکارِ دوعالم نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جھوٹ بولنے کو منافقت کی علامت

قرار دیا ہے، جیسا کہ حدیث ۸ میں آرہا ہے اور فرمایا کہ جھوٹ رزق کو کم کردیتا ہے ایک دفعہ رسولِ اکرم نبیٔ محتشم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تاجر فاجر ہیں صحابہ کرام نے عرض کیا، وہ کیوں، کیا بیع حلال نہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: تاجر اس لئے فاجر ہیں کہ وہ خرید و فروخت کے وقت جھوٹی قسمیں بہت کھاتے ہیں، اور جب بات کرتے ہیں، تو جھوٹی کرتے ہیں۔" (کیمیائے سعادت امام غزالی) مولیٰ تعالیٰ ہر مسلمان کو زبان کی حفاظت کی توفیق نصیب فرمائے (آمین)

ہاتھ کی حفاظت

ہاتھ خداوند کریم جل و علا کی عطا کردہ عظیم نعمت ہیں اور اسی لئے عطا فرماتے ہیں کہ اپنی جائز ضرورت کے وقت ان کو استعمال کیا جائے اور ہاتھ میں قرآن پاک لیا جائے اور حدیث و فقہ کی کتب پکڑی جائیں اور پڑھی جائیں اور ان ہاتھوں سے دوسرے مسلمانوں کی مدد کی جائے، نہ کہ اس لئے کہ دوسرے مسلمانوں کو تکلیف دی جائے، اور چوری و ڈاکہ ڈالا جائے اور ناحق کسی کو مارا جائے، قتل کیا جائے، کسی کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالا جائے اور کسی پر سختی و زبردستی کی جائے اور نہ ہی ناپ تول میں کمی جائے۔ الغرض اپنے ہاتھ کی حفاظت اس طرح کی جائے کہ اِن ہاتھوں سے ہرگز ہرگز کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

اس حدیث پاک میں اصل حکم یہ ہے کہ کامل مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے کسی بھی مسلمان اور کسی بھی جاندار کو کسی طرح کی اذیت و تکلیف نہ پہنچے۔ مولیٰ تعالیٰ ہم کو کامل مسلمان بنائے۔

ایمان کی مٹھاس

حدیث ۲۶: عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ مَّنْ کُنَّ فِیْہِ وَجَدَ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ اَنْ یَّکُوْنَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا وَاَنْ یُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا یُحِبُّہٗ اِلَّا لِلّٰہِ وَاَنْ یَّکْرَہَ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْکُفْرِ کَمَا یَکْرَہُ اَنْ یُّقْذَفَ فِی النَّارِ۔

(بخاری شریف جلد اوّل ص۷ مسلم شریف جلد اوّل ص۴۹)

حلِّ لغات: وَجَدَ: پائے گا۔ حَلَاوَۃَ: مٹھاس۔ اَنْ یُّقْذَفَ: پھینکا جائے۔

ترجمہ: "حضرت انس[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس شخص میں تین خصلتیں پائی جائیں گی، وہ ایمان کی حلاوت (مٹھاس) پالے گا۔ (۱) اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہو (۲) جس شخص سے بھی اس کو محبت ہو تو محض اور صرف اللہ تعالیٰ کی وجہ سے اُس کے ساتھ محبت ہو (۳) اور وہ کفر میں لوٹنا ایسا ہی ناپسند کرے جیسا کہ آگ میں پھینکا جانا ناپسند کرتا ہے۔

---

[1] انس بن مالک بن نضر انصاری خزرجی البخاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ: حضور سیّدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خادم زرد خضاب کرتے تھے۔ بعض نے حنا اور بعض نے ورس کا قول کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن کی کنیت ابو حمزہ رکھی۔ بدر میں حاضر تھے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت کرتے تھے۔ جب حضرت نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی، اُن کی عمر دس برس کی تھی۔ بعض نے نو اور بعض نے آٹھ سال بتائی ہے۔

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

تشریح اس حدیث کو ترمذی اور نسائی نے بھی اپنی کتابوں میں درج فرمایا ہے اور ایمان کی مٹھاس سے مراد، جیساکہ محی الدین نووی علیہ الرحمہ نے ذکر فرمایا، طاعات کو لذیذ جاننا اور دین میں تکلیفوں کو برداشت کرنا، یعنی ہر قسم کی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا اور اس کے راستوں میں کانٹوں کو پھولوں کی

(بقیہ حاشیہ) امام زہری حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ طیبہ آئے۔ تو میں دس برس کا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت بیس برس کا تھا۔ بعض نے کہا کہ دس برس، بعض نے کہا کہ آٹھ برس، اور بعض کے قول پر سات سال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت کی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لئے دعا فرمائی۔ اُن کا ایک باغ تھا جو سال میں دو بار پھل لاتا تھا اور اس میں ناز بو تھی جو کستوری کی خوشبو دیتی تھی۔ ان کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا تھا۔ جب وفات پائی، تو وصیت کی کہ میرے ساتھ اس کو دفن کیا جائے۔ حسب وصیت ان کے قمیص اور پہلو کے درمیان دفن کیا گیا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نو سال خدمت کی۔ اس دوران میں نے جو کچھ بھی کیا حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی کچھ نہ کہا کہ تو نے کیا کیا؟ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے کثرت مال اور اولاد کے لئے دعا فرمائی۔ اُن کی پشت سے ۸۰ لڑکے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ اُن کی وفات کے وقت اُن کی جمیع اولاد کی تعداد ایک سو بیس ۱۲۰ تھی۔ بعض نے ننو کا قول کیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے بہادر اور بے خطا تیرانداز تھے۔ آپ کے سن وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے ان کی وفات ۹۱ھ، بعض نے ۹۲ھ، بعض نے ۹۳ھ اور بعض نے ۹۰ھ بیان کی ہے۔ ان کی عمر میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے سو ۱۰۰ سال، بعض نے ۹۹ سال، بعض نے ۱۱۰ سال، بعض نے ۱۰۷ سال بتائی ہے۔ بصرہ میں وفات پانے والے صحابہ کرام میں یہ سب سے آخری صحابی ہیں۔ ان کی رحلت طف میں اپنے مکان پر ہوئی، جو بصرہ سے ۶ میل دور ہے اور وہیں دفن ہوئے۔ (اسد الغابہ ج ۱، ص ۱۲۷)

یسج معلوم ہو۔ ہر مشکل سے مشکل اور دشوار سے دشوار کام اللہ جلّ وعلا اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے اس کو آسان معلوم ہو۔
اس حدیث کا حاصلِ مطلب یہ ہے کہ جس طرح شکر اور چیز ہے اور شکر کی مٹھاس اور چیز ہے، اسی طرح ایمان اور چیز ہے اور اس کی لذّت اور چیز ہے، اس میں ایمان کو مثلاً: شہد وغیرہ میٹھی چیز سے تشبیہ دی گئی اور میٹھی چیز کی مٹھاس کو ایمان کے لئے بطورِ استعارہ تخیلیہ کے ثابت کیا گیا، جس شخص کے منہ کا ذائقہ بالکل درست ہوگا۔ اگر وہ شکر یا شہد کھائے گا، تو اس کی مٹھاس اور لذّت کا لطف اور مزہ بھی محسوس ہوگا، لیکن اگر کوئی صفراوی بخار کا مریض ہوگا، جس کے منہ کا ذائقہ بگڑ کر تلخ ہو چکا ہو۔ وہ اگر میٹھی چیز کھائے، تو اس کو اس کی مٹھاس محسوس نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ پہلا شخص میٹھی چیز کھانے والا بھی ہوگا اور اس کی لذّت پانے والا بھی اور دوسرا شخص میٹھی چیز کھانے والا تو کہلائے گا، لیکن مٹھاس کی لذّت سے محروم ہوگا۔ ایسے ہی ایمان کی مثال ہے جو شخص کلمہ پڑھ کر مومن ہو گیا اور اس میں تین خصلتیں پیدا ہوں گی، وہ مومن بھی ہوگا اور ایمان کی لذّت بھی پائے گا اور جس مومن میں یہ تین خصلتیں نہ ہوں گی، وہ مومن تو ہوگا، لیکن ایمانی لذّت اور مٹھاس سے محروم ہوگا۔ معلوم ہوا کہ یہ تینوں چیزیں کمالِ ایمان کی علامت ہیں۔

شارحِ مسلم امام نووی علیہ الرحمہ نے فرمایا: یہ حدیث اصولِ اسلام سے عظیم اصل ہے، اور یہ عظیم اصل کس طرح نہ ہو، اس میں بیان ہے اللہ (عزّ وجلّ) اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبّت کا جو اصلِ ایمان ہے، بلکہ عینِ ایمان ہے، اور مولیٰ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حقیقی محبّت اور کفر میں رجوع کی کراہت نہ حاصل ہوگی سوائے اس شخص کے جس کا ایمان قوی ہوگا اور اس کے لئے شرح صدر ہوگا، اور ایمان اس کے خون اور گوشت میں ملا ہوگا، یہ ہی حلاوتِ ایمان ہے، اور

اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ مِنْ ثَمَرَاتِ الْحُبِّ لِلّٰہِ (عمدۃ القاری ص ۱۴۸ ج ۱)

"اللہ تعالیٰ میں محبت، اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کے ثمرات سے ہے۔"

اس جگہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث میں تثنیہ کی ضمیر مما سواھما میں ہے، جو اللہ اور رسولہ کی جانب راجع ہے، جبکہ آپ نے ایک خطیب کو جس نے مَنْ یَّعْصِہِمَا میں دونوں کی ایک ضمیر کو راجع کیا، تو آپ نے منع فرمایا اور فرمایا: بِئْسَ الْخَطِیْبُ اَنْتَ۔ تو اس کے علامہ عینی نے مختلف جواب نقل کئے ہیں، احسن جواب یہ ہے کہ مسئلہ محبت میں دونوں کے لئے ایک ضمیر اس لئے لائی گئی کہ دونوں سے محبت ہو گی تو ایمان اور صراطِ مستقیم حاصل ہو گا، صرف ایک سے محبت کافی نہ ہو گی اور معصیت اور نافرمانی ایک کی بھی گمراہی اور شقاوت کو مستلزم ہوتی ہے، اسی لئے اس خطیب کو منع فرمایا کہ دونوں کا ذکر ایک ضمیر میں نہ کرنا چاہیے، بلکہ اس طرح کہا جائے: مَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ غَوٰی

(تین خصلتوں کی قدرے تفصیل)

اللہ (عزوجل) اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت

اللہ تعالیٰ جل وعلا کی محبت سے مراد اُس کی اطاعت اور جن امور سے اُس نے منع فرمایا ہے، اُن سے رکنا، بعض نے کہا قلب کا اس بات پر موافقت کرنا، جس میں اس کی رضا ہو، لہٰذا اس کو پسند کرے جو اس کو محبوب ہو اور اس کو ناپسند کرے، جو اس کو ناپسند ہو۔ فتح الباری میں ہے کہ علامہ بیضاوی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ اللہ و رسول کی محبت سے اس جگہ عقلی محبت مراد ہے، یعنی اس چیز کو اختیار کرے، جس کو عقلِ سلیم راجح جانے، اگرچہ وہ خواہشِ نفس کے خلاف ہے، جیسے مریض کو کڑوی دوا عقل کے تقاضا سے اچھی طرح جانتا ہے، اگرچہ طبعاً وہ اس کو پسند نہیں ہوتی، پس اس کو کھانے کی طرف میلان کرے گا۔

جب انسان غور کرے گا شارع اس چیز کا حکم دیتا ہے اور اسی چیز سے روکتا ہے جس میں اس کی دنیاوی بہتری اور آخرت میں نجات ہوتی ہے تو اس کے احکام کے امتثال کا عادی ہو جائے گا اور اس کی خواہش اس کے تابع ہو جائے گی اور عقلی طور پر لذت محسوس کرے گا اور یہی کمال ایمان سے تعبیر کیا۔ جب یہ مقام اس کو حاصل ہوگا تو وہ شارع کے تمام مواعید اور وعیدوں کو مستحضر اور مشاہد کو محسوس کرے گا۔ مولیٰ تعالیٰ کے ذکر کی مجالس کو جنّت کے باغات اور مالِ یتیم اور سُود کھانے کو جہنّم کی آگ پھانکنا محسوس کرے گا اور کفر میں لوٹنے کو آگ میں ڈالا جائے گا۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ سے محبت کی دو قسمیں ہیں: ایک فرض اور ایک مستحب۔ فرض تو یہ ہے، جو اس کے اوامر کے امتثال اور اس کی نافرمانیوں سے رُکنے اور اُس کی رضا پر راضی ہونے پر اُبھارے، لہٰذا جو کسی حرام یا معصیت میں واقع ہوا تو وہ محبت میں کوتاہی کی وجہ سے واقع ہوگا اور ایسی کوتاہی کبھی انسان کو غفلت میں ڈال دیتی ہے اور وہ گناہوں پر دلیر ہو جاتا ہے۔ مستحب محبت یہ ہے کہ نوافل پر ہمیشگی کرے اور مشتبہات سے مکمّل پرہیز کرے اور محبت سے موصوف کوئی خوش قسمت ہی ہوتا ہے۔ محبت الرّسول سے مراد یہ ہے کہ تمام جہان سے آپ کے ساتھ زیادہ محبت کرے اور آپ کو وسیلۂ عظمیٰ جانے اور تمام آباؤ اجداد، ازواج و اولاد، مکان و دکان، مال و سامان، جسم و جان سے آپ کی ذات اور مولیٰ تعالیٰ کی ذات زیادہ محبوب ہو، کیونکہ لکھا جا چکا ہے کہ صرف ایک کی محبت ناکافی ہے۔ اللہ (جلّ وعلا) اور اُس کے رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبت سارے جہان سے زیادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اس طرح گھر کر جائے کہ اس کی رضا کے لئے اپنا تن من دھن، جسم و جان سب کچھ قربان کر دینا اپنے لئے سعادت سمجھے، اگرچہ اکراہ یعنی مجبوری اور جان کے خطرہ کے وقت کلمۂ کفر زبان پر جاری کرنا مباح ہے، لیکن نہ جاری کرنا

اور اپنی جان قربان کر دینا امرِ مستحسن اور حصولِ شہادت ہے، جیسا کہ حدیث ؎ کی شرح میں تین مجاہدوں کا واقعہ درج ہے، اسی لئے سرکارِ مدینہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی محبت میں امامِ اہلِ سنّت اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ یُوں عرض کر رہے ہیں:

؎ کروں تیرے نام پہ جاں فدا نہ بس ایک جاں دو جہاں فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا، کروں کیا کروڑوں جہاں نہیں

دوسری شرطِ ایمان کی حلاوت حاصل کرنے کے لیے یہ ہے کہ **الحُبّ فِی اللہ** کسی شخص سے محبت کرے، تو محض اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے محبت کرے۔ صوفیاءِ کرام ارشاد فرماتے ہیں اَلْحُبُّ فِی اللہِ اور اَلْبُغْضُ لِلّٰہِ کا مطلب یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے لئے ہی دوستی اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہی دشمنی"۔ اور یہ تصوّف کی اساس ہے، اور ایک مؤمن کامل کے ایمان کی عظیم علامت اور نشانی یہ ہے کہ وہ اگر کسی سے دوستی کرتا ہے، تو اپنی کسی غرض اور نفسانی خواہش کے لئے نہیں کرتا، بلکہ خالص مولیٰ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے دوستی کرتا ہے اور اگر کسی سے عداوت و دشمنی رکھتا ہے، تو اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ وہ بھی خداوندِ کریم ذوالجلال والاکرام کی رضا اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے نہ اس کی کوئی ذاتی دوستی ہوتی ہے اور نہ ہی کسی سے ذاتی بغض اور عداوت ہوتی ہے۔ ہم انبیاءِ کرام اور اولیاءِ کرام اور صالحین و شہداءِ عظام سے جو محبت اور دوستی رکھتے ہیں، تو اس لئے کہ وہ اللہ عزّ وجلّ کے محبوب اور پیارے بندے ہیں، نہ اس لئے کہ ان سے ہماری کوئی رشتہ داری ہے اور نہ یہ وجہ کہ انہوں نے ہماری مالی امداد کی ہے، (اگرچہ ان کے ہم پر احسانات بے شمار ہیں) آج لوگ خواجہ اجمیری، داتا ہجویری، خواجہ فریدالدین گنج شکر، سُلطان العارفین سلطان باہو، سرکارِ غوثِ اعظم رحمہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہوں میں اسی لئے حاضری دیتے ہیں کہ وہ مولیٰ تعالیٰ کے خاص اور پیارے بندے ہیں،

اور یہی الحب فی اللہ ہے اور ہم ابو جہل، ابو لہب، شداد، فرعون، نمرود اور کافروں اور بد مذہبوں سے اسی لئے عداوت اور دشمنی رکھتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے گستاخ اور دشمن ہیں، نہ اس لئے کہ انہوں نے ہم کو مارا پیٹا ہے یا انہوں نے ہمارا مال چھینا ہے۔ یہی حکم قرآن میں بھی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی مومن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) کے دشمنوں سے محبت نہیں رکھ سکتا، چاہے وہ اس کے ماں باپ، بھائی بہن اور قبیلہ و برادری ہو۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (الآیۃ) بایں وجہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہل سنت علیہ الرحمہ کے قلم میں بد مذہبوں اور دشمنانِ خدا و رسول کے بارے میں بہت شدت تھی۔ کسی نے عرض کیا کہ حضور ذرا نرمی فرمائیں؟ تو آپ نے جواب دیا کہ میرے ہاتھ میں تو قلم ہی ہے، دل تو چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ میں تلوار ہو اور دشمنانِ خدا و رسول کے سر قلم کر دوں۔ اسی لئے فرماتے ہیں:

کلکِ رضا ہے خنجرِ خونخوار، برق بار ؎
اعداء سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

ان مسلمانوں کو غور کرنا چاہیے جو صلح کلی کے جذبہ میں ہر ایک سے محبت اور تعلقات رکھنے اور ہمنوا اور ہم پیالہ ہونے میں کوشش کر رہے ہیں، صلح کلی ہونا بھی بہت بڑا فتنہ ہے اور یہ بھی بد مذہبی ہے۔ کامل مومن کے دل میں کبھی بھی دشمن رسول اور گستاخ کی محبت نہیں آسکتی اور نہ ہی وہ بد مذہبوں کو پیار کر سکتا ہے۔ حیرانگی ہے جو اپنے آپ کو اہل سنت بھی کہلاتے ہیں اور معمولات بھی اہل سنت و جماعت ہی کے ہیں اور بد مذہبوں سے رشتہ اور ناطہ بھی جوڑتے ہیں، ان کو کیا فائدہ ہوتا ہے ــ؟ بد مذہب تو ان کو اپنا نہیں سمجھتے اور اہل سنت کے نزدیک بھی وہ معتوب اور ناپسندیدہ

ہو جاتے ہیں، نہ اِدھر کے رہے اور نہ اُدھر کے رہے، اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَ اَلْبُغْضُ لِلّٰہِ یہی بنیاد اخلاص ہے۔ مومن کے لئے ہر عمل میں اخلاص اور للّٰہیت کا جذبہ رکھنا یہ ایمان کی لذّت پالینے کی دوسری شرط ہے اور اخلاص یہ عظیم طاقت ہے کہ اس کی روحانی توانائیوں کے مقابلے میں شیطانی طاغوتی طاقتیں بے بس ہو جاتی ہیں، اسی لئے شیطان نے خود اقرار کیا: اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ۔ یعنی "اے اللہ کریم! قیامت تک اولادِ آدم کو گمراہ کرتا رہوں گا، مگر تیرے اخلاص والے بندوں پر میرا داؤ نہیں چلے گا" اخلاص کی طاقت کا کیا کہنا! بزرگوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ

حکایت ایک عابد اور اللہ والے کو پتہ چلا کہ فلاں جنگل میں ایک درخت کی لوگ پوجا کر رہے ہیں (کسی غیر اللہ کی عبادت اور پوجا کرنا اور اس کو لائق عبادت جاننا شرک اور کفر ہے، لیکن کسی کو اللہ تعالیٰ کا پیارا جان کر تعظیم و تکریم کرنا اور کسی متبرک مقام سے برکت حاصل کرنا نہ شرک ہے نہ کفر، بلکہ ایمان کا تقاضا ہے) تو اس عابد کو ان لوگوں پر بہت جلال اور غصہ آیا کہ شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جوشِ جہاد سے سرشار ہو کر ایک کلہاڑا پکڑا اور درخت کو کاٹنے کے لئے چل پڑا۔ راستہ میں شیطان انسانی شکل میں ظاہر ہوا اور درخت کاٹنے سے منع کرنے لگا، یہاں تک عابد اور شیطان گتھم گتھا ہو گئے۔ عابد نے شیطان کو کئی بار زمین پر گرا دیا تو شیطان نے کہا: حضرت! آپ کو درخت کاٹنے کی کیا ضرورت؟ آپ واپس اپنی عبادت گاہ میں چلے جائیے، ہر روز آپ کے مصلّیٰ کے نیچے سے ایک اشرفی مل جایا کرے گی، آپ اپنی ضرورتوں میں استعمال کر لیا کریں۔ عابد اِس لالچ میں آگیا اور واپس چلا گیا۔ چند دن تو اشرفی نکلتی رہی پھر بند ہو گئی۔ اشرفی بند ہوتے ہی پھر درخت کاٹنے کے لئے نکل پڑا، تو پھر شیطان سے آمنا سامنا ہو گیا، اب کی بار شیطان نے عابد کو زمین پر دے مارا کہ اُس کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ شیطان نے کہا اب اسی میں خیر ہے کہ

واپس چلے جاؤ، ورنہ جان سے مار دیئے جاؤ گے، پہلے تم اخلاص کے ساتھ آئے تھے اور اخلاص کا مقابلہ نہیں ہوسکتا تھا اور اب تم اشرفیوں کے لالچ میں آئے ہو۔ سُن لو جب تک تمہارے اندر اخلاص کی طاقت فرما تھی، میں تم سے عاجز تھا اب جبکہ اخلاص کی طاقت سے تم محروم ہو گئے، تو اب تم مجھ پر غلبہ نہ پاسکو گے۔

کفر آگ میں جانے کے برابر

تیسری چیز جو ایمان کی لذت و حلاوت کے لیے شرط ہے، وہ یہ ہے کہ کفر سے بندہ اتنا ہی بیزار اور متنفر ہو، جتنا کہ آگ کے شعلوں میں ڈالے جانے سے بیزار اور متنفر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی انسان کبھی کسی حالت میں یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کو جلتی ہوئی آگ کے شعلوں میں جھونک دیا جائے ــــ اسی طرح کسی حالت میں بھی ایک سچا مومن کُفر کرنے کو کبھی ہرگز ہرگز پسند نہیں کرسکتا۔ جس طرح پہلے لکھا جاچکا ہے کہ جب مواعید اور وعیدوں کو مستحضر جانے گا، تو مولیٰ تعالیٰ جل شانہ، کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، ایسا ہی جب شرک و کفر کو آگ سمجھے گا اور وہ دوزخ میں داخل ہوتا جائے گا، تو کبھی بھی شرک و کفر کے قریب نہیں جائے گا۔ اس کے نزدیک کفر کرنا اور آگ میں داخل ہونا، برابر ہوگا اور جب یہ مقام پالے گا اور یہ تینوں خصلتیں اس میں پائی جائیں گی، تو وہ حلاوتِ ایمان اور لذتِ ایمان پالے گا۔ مولیٰ تعالیٰ ہر مسلمان کو حلاوتِ ایمان کی لذت سے لُطف اندوز فرمائے اور کامل مومن بنائے۔ (آمین!)

سب سے زیادہ محبوب

حدیث ۱۰: عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔

(بخاری شریف جلد اوّل ص۷، مسلم شریف جلد اوّل ص۴۹)

ترجمہ: حضرت انس[لہ] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص (اُس وقت تک) کامل مومن نہیں ہوسکتا، جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد اور اس کی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

تشریح اس مضمون کی حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی باب میں امام بخاری نے اس سے پہلے تخریج کی ہے اور نسائی نے بھی روایت کی ہے اور اسی مضمون کے مطابق قرآن حکیم میں یہ حکم ہے:-

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝	آپ فرما دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، اور تمہارا قبیلہ اور تمہارے مال، جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس میں نقصان سے تم ڈرتے ہو اور تمہارے پسندیدہ مکان زیادہ محبوب ہوں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے تو انتظار کرو اللہ کے عذاب کا اور اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

[لہ] آپ کے حالات حدیث ۶ کے حاشیہ پر مذکور ہیں۔ ۱۲ منہ

اس حدیث اور اس آیت کی رُو سے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت فرض ہوئی۔ جب تک تمام جہان آباؤ اجداد مال و اولاد، ساز و سامان، دکان و مکان سے زیادہ آپ سے محبت نہ ہو گی۔ ایمانِ کامل حاصل نہ ہو گا۔ ایک ہے اصلِ ایمان اور ایک ہے کمالِ ایمان۔ اسی طرح ایک ہے اصلِ محبت اور ایک ہے کمالِ محبت، اصلِ محبت جس قلب میں نہ ہو گی، وہ مومن ہی نہ ہو گا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے، لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا مَحَبَّۃَ لَہٗ۔ اور کمالِ ایمان کے لیے کمالِ محبت شرط ہے قاضی عیاض علیہ الرحمہ فرماتے ہیں "حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت یہ ہے کہ آپ کی سُنت کی اتباع اور آپ کی شریعت سے موافقت، آپ کی بارگاہ میں حاضری کی آرزو اور اپنا مال و منال اور دولت اور اپنی جان آپ پر قربان کرے۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ حقیقتِ ایمان اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، اور جب تک حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کو سب سے زیادہ یعنی آپ کی قدر ماں، باپ، اولاد ہر محسن و مہربان سے زیادہ نہ جانے، اُس کو ایمان نصیب نہیں ہوتا ہے[۱]
اسی مضمون کو حضور اعلیٰ حضرت عظیم البرکت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان اشعار میں بیان فرمایا:

اللہ کی سرتا بقدم شان ہیں یہ ۔۔۔ ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں ۔۔۔ ایمان یہ کہتا ہے کہ میری جان ہیں یہ

ابنِ بطال نے کہا: محبت کی تین اقسام ہیں، (۱) عظمت و اجلال کی وجہ سے محبت جیسے والدین سے (۲) محبت شفقت و رحمت جیسے اولاد سے (۳) مشاکلت اور استحسان کی وجہ سے محبت، جیسے بعض لوگوں کی بعض سے محبت۔ یہ حدیث جوامع الکلم سے ہے کہ جن وجوہ سے بھی کسی سے محبت ہو سکتی ہے، وہ تمام وجوہ آپ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، لہٰذا آپ سے محبت سب سے زیادہ ہونا کمالِ ایمان کے لیے لازم و ضروری ہے۔[۲]

---

[۱] عمدۃ القاری جلد اول صفحہ ۱۴۴ [۲] تفہیم البخاری جلد اول صفحہ ۱۰۱

محبت کا لغوی معنی ہے محب کا موافق شئے کی طرف میلان۔ اس **محبت** لغوی معنیٰ کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف محبت کی نسبت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ میلان کرنے اور اس کی جانب میلان کے لئے جانے سے ارفع و اعلیٰ اور منزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت سے مراد ثمراتِ محبت ہیں۔ ہاں! اس معنیٰ میں آپ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی جانب نسبت ہو سکتی ہے کہ آپ کی طرف میلان تقاضائے ایمان ہے۱۔

محبت کی دو قسمیں ہیں، ایک طبعی اور ایک عقلی۔ طبعی یہ ہے کہ بندہ طبعاً کسی سے محبت کرے جیسے کہ ماں۔ باپ۔ اولاد اور اعزہ و اقارب سے محبت ہوتی ہے۔ دوسری عقلی محبت یہ ہے کہ عقلاً محبوب کو دوسری چیزوں پر ترجیح دے۔ طبعی محبت بندہ کے اختیار میں نہیں ہوتی اور نہ ہی بندہ کو اس کا مکلف کیا گیا ہے اور نہ ہی مدارِ ایمان ہے، اسی لئے ابوطالب مومن نہیں ہیں، کیونکہ ان کو آپ سے محبت طبعی بھتیجا ہونے کی وجہ سے تھی، اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلمہ پڑھ کر ایمان نصیب نہیں ہوا۲۔ اس مسئلہ کی مکمل بحث اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے رسالہ ایمان ابوطالب میں مذکور ہے۔ ہاں عقلی محبت بعض دفعہ ایسی غالب ہو جاتی ہے کہ وہ طبعی محبت سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس حدیث سے یہی مراد ہے کہ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے محبت اس قدر غالب ہو کہ ہر اس سے محبت ہو جو آپ کا ہو اور اس کی محبت سے دل خالی ہو جو آپ کا دشمن ہو، چاہے وہ طبعاً اپنا کتنا ہی عزیز ہو، یہی وجہ ہے کہ جنگِ بدر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بیٹے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باپ کے خلاف تلوار کھینچ کر نکل کر آئے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ماموں کو قتل کر دیا۔ حضور نبی کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی خاطر صحابہ کرام نے اپنے وطن، اقربا، مکان اور مال و دولت

---

۱ عمدۃ القاری جلد اوّل ص۱۴۹، ۲ تفہیم البخاری جلد اوّل ص۱۰۱

کو چھوڑ کر بے سروسامانی کے عالم میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئے غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام مال حتیٰ کہ بدن کے کپڑے بھی آپ کے قدموں میں لا کر رکھ دیئے اور خود ٹاٹ کے کپڑے پہن لیئے۔ اس حدیث میں والد کا ذکر بطورِ مثال ہے، مراد ماں باپ، آباؤ اجداد ہے اور ولد سے مراد بیٹے، بیٹیاں ہیں۔ ان کا ذکر اس لئے فرمایا، طبعی طور پر انسان کو ان سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ جب آپ سے محبت ان سے بھی زیادہ ہوگی، تو باقی دوسروں سے بطریقِ اُولیٰ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ محبت زیادہ ہوگی۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث میں جان کا ذکر نہیں آیا، حالانکہ جان سے بھی زیادہ آپ سے محبت کرنا لازم ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں صراحت بھی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کے سامنے اقرار کیا کہ مجھے آپ سے اپنی جان کے علاوہ تمام چیزوں سے زیادہ محبت ہے، تو آپ نے فرمایا: جب تو اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرے گا، تب مومن کامل ہوگا۔ آپ نے اسی وقت عرض کیا کہ "اب آپ مجھے جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں"۔ ارشاد فرمایا: "اب تم کامل مومن ہو"۔ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ انسان ماں باپ، اولاد پر اپنی جان کو بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہوتا، تو جب آپ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سے محبت ماں باپ اور اولاد سے زیادہ کرے گا، تو جان سے بھی زیادہ کرے گا۔ اور ایک جواب یہ ہے کہ جان کا ذکر والناس اجمعین میں ہے کہ بندہ خود بھی والناس میں داخل ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا جب تک بندہ کے قلب میں آپ کی محبت اِس طرح گھر نہ کر جائے کہ اپنی جان، ماں باپ، اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ آپ سے محبت نہ ہوگی، وہ کامل مومن نہ ہوگا، اِسی لئے مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کو کلمۂ کفر اور آپ کی بے ادبی پر اس طرح اکراہ کیا جائے کہ جان جانے کا خطرہ ہو تو اگرچہ جان بچانے کے لئے زبان پر کلمۂ کفر جاری کر لینا،

بشرطیکہ دل میں تصدیق موجود ہو، اجازت ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔ لیکن پھر بھی اگر کسی نے کلمۂ کفر جاری نہ کیا اور جان قربان کر دی، وہ عند اللہ ماجور اور شہید ہوگا، جیسا کہ پچھلے اوراق میں ان مجاہدین کا ذکر کیا جا چکا ہے، جنہوں نے کھولتے ہوئے تیل میں جلنا پسند کر لیا، لیکن عیسائیت اور کفر کو پسند اور قبول نہ کیا۔

اسبابِ محبّت

شرح مسلم جلد اوّل صـ۱۴۱ میں مولانا غلام رسول سعیدی صاحب فرماتے ہیں: محبت چند وجوہ سے ہوتی ہے بعض لوگ حسن و جمال کی وجہ سے محبت کرتے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے کوئی حسین پیدا نہیں فرمایا۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْسَنَ النَّاسِ وَجْهًا "حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا چہرہ سب سے زیادہ حسین تھا۔" بعض لوگ علم و حکمت کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے زیادہ کائنات میں کسی کو علم نہیں دیا، کیونکہ تمام مخلوق کو جو علم دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ "تم کو جو علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا سا ہے" اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جو علم عطا کیا گیا تو فرمایا: وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۔ "اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ سب کچھ بتلا دیا جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا فضل عظیم ہے۔" غور کیجیے جس کے سامنے مخلوقات کا علم قلیل ہو وہ جس کے علم کو عظیم کہا گیا اُس کی عظمتوں کا کیا عالم ہوگا؟ بعض لوگ جود و سخاوت کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی سخاوت کی کہ اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا: وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ۔ "پیارے بہت دیتے ہو، ذرا کم خرچ کیا کرو۔"

بعض لوگ زہد و تقویٰ کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اتنی عبادت کی کہ معبودِ برحق نے بھی کہا: يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ "پیارے نماز میں بہت قیام کرتے ہو، ذرا کم کیا کرو۔"

الغرض کسی شخص کو چاہے جانے کی جتنی وجوہ ہوسکتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے وہ سب حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں جمع فرما دیں اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو کائنات کا محبوب بنا دیا۔ عمدۃ القاری جلد اول ص۱۴۴ میں ہے،

ثُمَّ الْمَيْلُ قَدْ يَكُوْنُ بِمَا يَسْتَلِذُّهٗ بِحَوَاسِّهٖ كَحُسْنِ الصُّوْرَةِ وَلِمَا يَسْتَلِذُّهٗ بِعَقْلِهٖ كَمُحَبَّةِ الْفَضْلِ وَالْجَمَالِ وَقَدْ يَكُوْنُ لِاِحْسَانِهٖ اِلَيْهِ وَدَفْعِ الْمَضَادِعَنْهُ وَلَا يَخْفٰى اَنَّ الْمَعَانِيَ الثَّلَاثَةَ كُلَّهَا مَوْجُوْدَةٌ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

پھر میلان کبھی ہوتا ہے اُس کی جانب جس کو اپنے حواسِ ظاہرہ میں پسند کرے جیسا کہ صورت کا حسین ہونا اور کبھی میلان ہوتا ہے اُس کی جانب جس کو اپنی عقل کے اعتبار سے پسند کرے جیسا فضل و جمال اور کبھی محبت ہوتی ہے احسان اور تکلیف دہ چیز کو دور کرنے کی وجہ سے اور کسی پر پوشیدہ نہیں ہے یہ تینوں وجوہِ محبت آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود ہیں

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام جمالِ ظاہر اور حسنِ باطن اور فضائل کی تمام انواع کے کامل جامع ہیں اور آپ کا احسان تمام مسلمانوں کی جانب ہے کہ آپ نے سب کو صراطِ مستقیم اور دائمی نعیم کی جانب ہدایت دی۔

علاماتِ محبت اگرچہ نفسِ ایمان کے لئے حُبِّ عقلِ اختیاری کافی ہے، لیکن کمالِ ایمان یہ ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت میں طبع عقل کے تابع ہو کر طبعی محبت دوسری تمام محبتوں پر غالب آجائے۔

ہر چیز کی کوئی نہ کوئی علامت ہوتی ہے محبۃ الرسول کی بھی علامات ہیں جیسا کہ "المعتقد المنتقد" (ص۱۴۲ تا ص۱۴۵) میں مولانا علامہ شاہ فضلِ رسول بدایونی علیہ الرحمہ نے بیان فرمائی ہیں: (۱) علاماتِ محبت سے ہے کہ اپنی جان پر آپ کو ترجیح دینا"

اور آپ کی موافقت کو پسند کرنا اور آپ کی پیروی کرنا اور آپ کی سُنّت پر عمل کرنا، آپ کے احکام کی اطاعت اور منہیات سے اجتناب، آپ کے اخلاق سے تمام احوال میں متخلق ہونا تنگی اور فراخی اور خوشی و غمی میں، جو تمام صفات سے موصوف ہوگا، وہ کامل المحبت ہوگا۔ جس میں بعض صفات نہ ہوں گی، وہ ناقص المحبت ہوگا، اگرچہ نفس محبت اس سے زائل نہ ہوگی، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ کے زمانہ میں، ایک شخص پر شربِ خمر کی حد جاری کی گئی، تو بعض نے اس پر لعنت کی، تو آپ نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا: اس کے دل میں اللہ (جل وعلا) اور اس کے پیارے رسُول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی محبت ہے۔ حضرت ارشاد فرماتے ہیں، اس حدیث میں گناہ گاروں، مجرموں کے لیے بشارتِ عظیمہ ہے کہ جب تک بندہ اپنے گناہوں کوتاہیوں کا معترف اور نادم رہے گا۔ اس سے اسمِ محبت زائل نہ ہوگا اور وہ مومن ہی رہے گا، اگرچہ کمالِ ایمان کا حصول کمالِ محبت اور کمالِ اتباع پر موقوف ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔

؎ ہوں مسلماں گرچہ ناقص ہی سہی اے کاملو!
ماہیتِ پانی کی آخر یم[۱] سے نم میں کم نہیں

(۲) اور علاماتِ محبت آپ کا کثرت سے ذکر کرنا ہے، کیونکہ قاعدہ ہے جس کو کسی سے محبت ہوتی ہے، وہ اُس کا کثرت سے ذکر کرتا ہے۔ ایک دفعہ کسی نے مجنوں کو دیکھا کہ اُس نے اپنی اُنگلی کو قلم بنایا ہے اور زمین پر کچھ لکھ رہا ہے، تو اُس نے پوچھا کیا لکھ رہا ہے اور یہ خط کون لے جائے گا؟ تو اُس نے جواب دیا:

؎ گفت مشقِ نامِ لیلیٰ مے کنم　　خاطرِ خود را تسلّی مے دہم
"کہا کہ اپنے محبوب کا نام لکھ رہا ہوں اور اپنے دِل کو تسلی دے رہا ہوں۔"
(مثنوی شریف)

---

[۱] بمعنیٰ دریا۔

لہٰذا محبت کا تقاضا ہے محبوب کا کثرت سے ذکر کرنا اور آپ کی ذات پر کثرت سے درود شریف پڑھنا، فضائلِ درود شریف میں لکھی ہوئی کتاب کا مطالعہ کرنا بے حد مفید ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا پاؤں سو گیا، تو اُن کو کسی نے کہا۔ اُذْکُرْ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَیْکَ۔" اس کا ذکر کرو جو آپ کا سب سے زیادہ محبوب ہے۔" تو آپ نے فوراً کہا: یَا مُحَمَّدَاہُ آپ نے اس میں اظہار کیا آپ کی محبت کا اور آپ کی ذات سے مدد طلب کی، تو آپ کا پاؤں ٹھیک ہو گیا۔ اس روایت میں مشکل وقت میں آپ کو پکارنے اور بعید سے ندا کرنے اور یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم کہنے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ صحابی کا قول و فعل بھی حجت ہوتا ہے۔

(۳) آپ نے ذکر کے وقت آپ کی تعظیم و توقیر، عجز و انکسار کا اظہار آپ کا نامِ مبارک سُن کر درود شریف پڑھنا اور انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر لگانا بھی علاماتِ محبت سے ہے۔

(۴) ہر اُس سے محبت کرنا، جس کے ساتھ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم محبت فرماتے ہوں اور جو آپ کی طرف منسوب ہو، آپ کی اہل بیت سے، اور آپ کے صحابہ کرام سے، مہاجرین و انصار سے اور جس کے قلب میں ان کی عداوت ہو، اس کے ساتھ دشمنی کرنا اور بغض کرنا بھی علاماتِ محبت سے ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں ——

(ترجمہ) "اے اللہ! مجھے ان دونوں سے محبت ہے، تو بھی ان سے محبت فرما۔" اور دوسرے مقام پر فرمایا، "جس نے ان سے محبت کی، اُس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی، اُس نے خدا تعالیٰ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض کیا تو اُس نے مجھ سے بغض کیا اور جس کے قلب میں میرا بغض ہوگا، اُس پر اُس کا خدا ناراض ہوگا۔

مجھ سے بُغض کرنا گویا خدا تعالیٰ سے بُغض کرنا ہے" اور جملہ صحابہ کرام کے بارے میں ارشاد فرمایا: "میرے صحابہ کو میرے بعد اعتراضات کا نشانہ نہ بنانا، جس نے ان سے محبت کی، وہ میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرے گا اور جو اُن کا دشمن ہوا، وہ میری دشمنی کی وجہ سے اُن کا دشمن ہو گا۔" الخ

اِسی طرح کثیر روایات سے معلوم ہوتا ہے، آپ کے ساتھ محبت کا تقاضا ہے کہ ہر اُس سے محبت کی جائے، جس کا آپ کے ساتھ تعلق ہے اور ہر اس سے دشمنی رکھی جائے جو آپ کے متعلقین کا دشمن ہو گا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت قاضی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سامنے خلیفہ کی موجودگی میں ذکر ہوا کہ آپ (صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم) کو کدّو شریف سے محبت تھی۔ تو ایک شخص نے کہا: "مجھ کو تو کدّو سے کوئی محبت نہیں ہے" تو قاضی ابو یوسف علیہ الرحمہ نے حکم فرمایا: کہ کوڑا اور تلوار کو لایا جائے تاکہ ایسے بے ادب کی گردن اُڑا دی جائے، تو اُس شخص نے توبہ و استغفار کی اور کلمہ شہادت پڑھ کر تجدیدِ اسلام کی، تو آپ نے اُس کو چھوڑ دیا اور قتل نہ فرمایا۔

(۵) جو آپ کا بے ادب اور گستاخ ہوا ور اُس کے دل میں آپ کی کدورت ہو، تو ایسے شخص سے عداوت اور بغض رکھنا بھی علاماتِ محبت سے ہے، لہٰذا مرزائیوں، وہابیہ، دیابنہ، روافض و خوارج سے میل جول رکھنا اور ان کے ساتھ تعلقات قائم کرنا اور اُن کی مجلسوں میں جانا اور اُن کی محافل کو رونق بخشنا اور صلح کلی ہونا محبت میں نقصان کی علامت ہے، ہرگز ہرگز محب کے دل میں محبوب کے بے ادب اور گستاخ دشمن کے لئے نرم گوشہ نہیں ہو سکتا، اسی لئے سرکارِ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت الشاہ احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ میرے پاس تو قلم ہی ہے گر تلوار ہوتی تو میں دشمنانِ رسول کی گردنوں کو اُڑا دیتا۔

کلکِ[1] رضاؔ ہے خنجرِ خونخوار برق بار
اَعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

ایسے ہی آپ کی تعظیم و توقیر، ظاہر و باطن اور تمام احوال میں واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا۔ "آپ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو اس طرح نہ بلاؤ، جس طرح تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو" یعنی آپ کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو، اور نہ ہی آپ کے پاس اونچی آواز کرو، اور نہ ہی آپ کو نام سے ندا کرو، بلکہ القاب کے ساتھ آپ کی بارگاہِ اقدس میں عرض کرو، اِس طرح کہو: یَا نَبِیَّ اللّٰہ - یَارَسُوْلَ اللّٰہ - یَا حَبِیْبَ اللّٰہ- دیکھیے اللہ تعالیٰ نے سارے قرآن پاک میں آپ کو نام کے ساتھ ندا نہ فرمائی، جبکہ دیگر انبیا کرام علیہم السلام کو ان کے ناموں کے ساتھ ندا فرمائی۔ علامہ ابن حجر مکی علیہ الرحمہ نے فرمایا: جس طرح حکم تھا کہ آپ کی حیاتِ مبارکہ میں نام کے ساتھ ندا نہ کی جائے، ایسے ہی آپ کے وصال کے بعد بھی اب یہی حکم ہے کہ آپ کو القاب کے ساتھ ندا کی جائے یعنی یارسول اللہ، یا حبیب اللہ، یا رحمۃ للعالمین، یا ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، جیسے القاب سے ذکر کیا جائے۔ حضرت شاہ فضلِ رسول بدایونی علیہ الرحمہ نے فرمایا جس طرح یہ آداب، آپ کی زندگی میں، آپ کی بارگاہ کے تھے، اب بھی آپ کی مسجد اور بالخصوص آپ کے روضۂ اقدس کے پاس اسی طرح آداب لازم ہیں، ہرگز ہرگز اونچی آواز نہ کی جائے اور نام سے ندا کی جائے۔ نہایت ادب و احترام اور آہستہ آواز کے ساتھ آپ کی بارگاہ میں عرض و معروض کیا جائے، کیونکہ آپ آج بھی اپنی قبر مبارک میں اسی طرح زندہ ہیں جیسا کہ حیاتِ ظاہری میں ؎

تو زندہ ہے، واللہ، تو زندہ ہے واللہ
میری چشمِ عالم سے چھپ جانے والے (اعلیٰحضرت)

[1] قلم

آپ کی تعظیم سے ہے کہ آپ کی آل و اصحاب کی عزت کرنا اور اُن کی ثنا کرنا اور ان تمام مقاماتِ مقدسہ کا احترام کرنا جو آپ کے ساتھ منسوب ہیں، جیسا کہ مولد النبی، بیتِ خدیجہ۔ مہبطِ وحی۔ غارِ حرا۔ غارِ ثور۔ مسجدِ نبوی۔ آپ کے حجراتِ مبارکہ، مسجدِ قبا وغیرہ۔ حضرت امام مالک نے اس شخص کے بارے میں فرمایا: جس نے مدینہ پاک کی مٹی کو ردّی کہا: اُس کو تیس دُرّے مارے جائیں اور اُس کو قید کرنے کا حکم دیا اور جب خلیفہ ابو جعفر منصور مسجدِ نبوی میں آیا اور اونچی آواز کر رہا تھا تو آپ نے فرمایا: اے امیر المومنین! آپ کی بارگاہ میں اپنی آواز بلند نہ کر، آپ کی آج بھی اسی طرح تعظیم و توقیر ہوگی، جس طرح حیاتِ ظاہری میں کی جاتی تھی اور جب خلیفہ دُعا مانگنے لگا، تو اُس نے پوچھا: دُعا کعبہ کی طرف منہ کر کے مانگی جائے یا آپ کی جانب منہ کر کے دُعا مانگی جائے، تو آپ نے ارشاد فرمایا:

لِمَ تَصْرِفُ وَجْهَكَ عَنْهُ	آپ سے اپنا چہرہ کیوں پھیرے گا، حالانکہ
فَهُوَ وَسِيلَتُكَ وَوَسِيلَةُ أَبِيكَ	آپ تیرے وسیلہ ہیں اور تیرے باپ
عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ۔	آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلہ ہیں

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ

ترجمہ: "اور جب تم اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھو تو محبوب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس جاؤ۔"

اس جگہ سے آلِ سعود کو غور کرنا چاہیئے، جو آپ کی طرف منہ کر کے آج دُعا مانگنے نہیں دیتے۔ جب زائر دُعا مانگنے لگتا ہے تو اُس کا منہ آپ سے پھیر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کعبہ معظمہ کی طرف منہ کر کے دُعا مانگو۔

ثمرۂ محبت سیدِ دو عالم نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کے بے شمار فوائد و ثمرات ہیں اور عظیم برکات کے حصول کا سبب ہے۔

حضرت شاہ فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: اس کے ثمرہ اور فائدہ

کے لیے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہی ارشادِ مبارک کافی ہے:

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ "بندہ کل قیامت کو اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اُس کو محبت ہوگی" معلوم ہوا کہ آپ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) کی معیت وسنگت حاصل ہوگی۔ غلام آقا کی بارگاہ میں حاضر ہوگا، آپ کی زیارت نصیب ہوگی، آپ کے دیدار کی لذت جنت کی نعمتوں سے بھی زیادہ ہوگی۔ مولیٰ تعالیٰ جنت میں آپ کی مرافقت نصیب فرمائے۔ یہ حدیث کا آخری جملہ ہے، مکمل حدیث سیدنا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص بارگاہِ رسالتمآب میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کی:

یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ وَسَلَّمَ کَیْفَ تَقُوْلُ فِیْ رَجُلٍ اَحَبَّ قَوْمًا وَلَمْ یَلْحَقْ بِھِمْ۔

یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم، اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، جو کسی قوم سے محبت کرے اور ان کے ساتھ لاحق نہ ہوا۔

یعنی جس کے دل میں اولیاء صلحاء اور علماء کی محبت ہو اور وہ علم وعمل میں ان کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکا، تو اس کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا:

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ شریف ص ۴۲۶)

"آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اُس کی محبت ہوگی"

حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ العزیز اس حدیث مبارکہ کی شرح میں ارشاد فرماتے ہیں:

ایں بشارت است مردوستداران صلحا علماء و اولیاء را کہ امید است کہ فردا در زمرۂ ایشاں برخیزند و با ایشاں باشند انشاء اللہ تعالیٰ۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۱۳۳)

یہ خوشخبری ہے اُن کے لیے جو صالحین، اور علماء واولیاء سے محبت رکھتے ہیں امید ہے کل انشاء اللہ تعالیٰ ان کا حشر اُن کے گروہ میں ہوگا اور اُن کے ساتھ رہیں گے۔

اِسی لئے کسی عربی شاعر نے کہا ہے ؎

اُحِبُّ الصَّالِحِیْنَ وَلَسْتُ مِنْھُمْ

لَعَلَّ اللّٰہُ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا

"یعنی مجھے نیکیوں سے محبت ہے اور میں ان میں سے نہیں ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی صلاح (نیکی) نصیب فرمادے گا۔"

مولیٰ تعالیٰ سرکار ابد قرار علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی کامل واکمل محبت، اتباع نصیب فرمائے اور کامل الایمان بنائے اور قیامت میں آپ کی مرافقت نصیب فرمائے۔ (آمین!)

مومن کامل

حدیث ۸: عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ۔ (بخاری جلد اول ص۶، مسلم جلد اول ص۵۰)

ترجمہ: حضرت انس[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی مومن (کامل) نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ اپنے بھائی (مومن) کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لئے پسند کرتا ہے۔"

تشریح یہ حدیث مختلف روایات سے مروی ہے۔ بعض میں یہی الفاظ درج ہیں اور بعض میں لَایُؤْمِنُ عبدٌ ہے اور مسلم کی روایت میں وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ الخ ہے اور نسائی کی روایت میں، آخر میں لِنَفْسِہٖ

---

[1] آپ کے حالات ص۶ پر مذکور ہیں۔ ۱۲ منہ

کے بعد مِنَ الْخَیْر بھی ہے۔

تمام شارحین حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ اس حدیث میں کمالِ ایمان کی نفی ہے یا تو ایماناً کاملاً مقدر ہے کذا فی العینی یا کسی شیئ کی نفی سے کمال کی نفی مراد ہونا کلامِ عرب میں مشہور و معروف ہے جیسا کہ محاورہ ہے فُلَانٌ لَیْسَ بِاِنْسَانٍ۔ یعنی وہ کامل انسان نہیں ہے۔ کذا فی فتح الباری۔ اِس حدیث میں جو یہ ارشاد ہے کہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اِس سے مراد یہ ہے کہ اس کی مثل بھائی کے لئے پسند کرے نہ یہ کہ وہ صفت اپنے سے ملنسوب ہوجائے یا وہی صفت دونوں کے ساتھ قائم ہوجائے، کیونکہ ایک عرض کا دو محلوں کے ساتھ قائم ہونا محال ہے، لہٰذا جب اس حدیث سے مراد کمال ایمان ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ بندہ اس وقت تک کامل مومن نہ ہوگا، جب تک اپنے بھائی مسلمان کے لئے اس کی مثل پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کسی میں یہ صفت نہ پائی جائے گی، وہ ہرگز مومن نہ ہوگا یعنی نفسِ ایمان کی نفی نہیں، بلکہ کمالِ ایمان کی نفی ہے۔ پچھلے صفحات میں وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں فرمایا گیا ہے "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذاء سے مسلمان محفوظ ہوں۔" یہ حقوق العباد کی پہلی کڑی تھی کہ مسلمانوں کو تکلیف نہ دینا اور اس حدیث میں حقوق العباد کی دوسری کڑی کا بیان ہے کہ مسلمان اس زریں اصول کو دستورِ حیات کو ضابطۂ اخلاق بنالے کہ جو کچھ اور جیسے سلوک و معاملات اپنے لئے پسند کرے، وہی سلوک اپنے مسلمان بھائی کے لئے پسند کرے، مثلاً ہر شخص یہ اپنے لئے پسند کرتا ہے کہ کوئی اُسے نقصان نہ پہنچائے، بے آبرو نہ کرے، کوئی اسے دھوکہ و فریب نہ دے، کوئی اس سے اور اس کے رشتہ داروں سے بدسلوکی نہ کرے۔ یوں ہی ہر شخص یہ پسند کرتا ہے کہ مجھے عزت و آبرو ملے اور مال و دولت اور تندرستی و سلامتی نصیب ہو۔ جب اسی طرح اپنے

مُسلمان بھائی کے لئے پسند کرے گا، تو مسلم معاشرہ امن وسلامتی کا گہوارہ بن جائے گا۔ دھوکہ۔ فریب۔ ملاوٹ۔ لوٹ کھسوٹ کا قلع قمع ہو جائے گا۔ ہر طرف امن وسکون اور حسنِ سلوک، اور اخلاقِ حسنہ کا نقشہ نظر آئے گا کہ جب کوئی مسلمان اِس طرزِ فکر اور اس طریقہ کو اپنی زندگی کا دستورِ حیات بنائے گا، تو پھر وہ کسی مسلمان کی حق تلفی نہیں کرے گا اور وہ حرص وحسد، بغض وکینہ، نفاق وشقاق، جنگ وجدال کشت وقتال وغیرہ تمام اخلاقِ رذیلہ سے آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہو جائے گا اور مسلم معاشرہ آرام وراحت اور امن وچین کی ایک جنت بن کر ساری دنیا کے لئے کشش اور تمام اقوامِ عالم کے لئے جاذبِ نظر بن جائے گا۔

اِس محبت سے مراد اختیاری ہے نہ طبعی اور نہ قسری، اور اس سے مراد اپنے بھائی مسلمان کے لئے خیر کی آرزو، یہ کسی قلبِ سلیم غیر سقیم پر کچھ دشوار نہیں ہوتا۔ ہاں جس کا قلب بیمار ہو، وہ کسی کے لئے خیر کی آرزو نہیں کرتا، اور حسد کی آگ میں سڑتا اور جلتا ہے، خدا تعالیٰ حسد سے بچائے اور قلبِ سلیم عطا فرمائے۔

ایک ضروری انتباہ

اس حدیث پاک کی شرح میں علامہ عبد المصطفےٰ اعظمی علیہ الرحمہ نے فرمایا: یہاں ایک بات خصوصاً حدیث پڑھنے، پڑھانے والوں کے لئے بہت ہی خاص طور پر قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اکثر حدیثوں میں کسی ایک کام کو اسلام کا نشان قرار دیا گیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ "مسلمان وہ ہے کہ تمام مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے سلامت رہیں"۔ اور ایک حدیث شریف میں وارد ہوا کہ "بہترین اسلام اس شخص کا ہے، جو کھانا کھلائے اور سلام کرے"۔ تو ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس مسلمان میں ایذا سے بچنے یا کھانا کھلانے یا سلام کرنے کی صفت پائی گئی، وہ صرف ایک صفت کی وجہ سے مسلمان کامل ہو گیا۔ اگرچہ وہ دوسرے اعمال وارکانِ اسلام کی پابندی

نہ کرتا ہو۔ اسی طرح ان حدیثوں کا یہ مطلب بھی نہیں ہے ۔بس یہی ایک اسلامی کام ضروری ہے، اور باقی دُوسرے اعمالِ اسلام غیر ضروری ہیں، معاذ اللہ!
ان حدیثوں کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی ایک کام کو خاص طور پر نشانِ اسلام اور علامتِ ایمان فرما دینے سے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اس عمل کو کسی خاص اعتبار اور حکمت سے بہت زیادہ اہمیّت دینا پسند فرماتے تھے۔ مثلاً حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ایک حدیث ارشاد فرماتے ہیں، لَاصَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ۔ نہیں ہے کوئی نماز، مگر حضورِ قلب سے" تو اس حدیث کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ بس حضورِ قلب ہی نماز کے درست ہونے کے لئے سب کچھ ہے، شرائط اور ارکانِ نماز کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب صِرف اس قدر ہے کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نماز میں حضورِ قلب کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور حالتِ نماز میں دل کی حضوری ایک بہت ہی اہم صفت ہے۔ اسی طرح وہ حدیثیں جن میں چند خاص خاص گناہوں کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ جو ان گناہوں کو کرے، وہ مومن نہیں، یا خاص خاص اعمالِ صالحہ کے بارے میں یہ ارشاد ہوا کہ جو شخص ان اعمال کو چھوڑ دے، وہ مومن نہیں، تو خوب سمجھ لو کہ ان حدیثوں کا ہرگز ہرگز یہ منشا اور مقصد نہیں ہے کہ وہ شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہو کر کافر ہو گیا، بلکہ ان سب حدیثوں کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ان گناہوں کا کرنے والا اور ان اعمالِ صالحہ کا چھوڑنے والا کامل درجے کا مسلمان نہیں ہے اور ایک مومن کے اعلیٰ درجات اور بلند مقام سے محروم ہے اور یہ خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ان حدیثوں کا مقصدِ قانونِ شرعی بیان کرنا یا کفر کا فتویٰ دینا نہیں ہے، بلکہ ان حدیثوں کا مقصد بُرے کاموں کی بُرائیوں کو بہت شدید بتا کر شدّت کے ساتھ اس سے مسلمانوں کو

روکنا، اور اچھے کاموں کی اچھائی کو بہت زیادہ اچھا بتاکر اس کام پر مسلمانوں کی رغبت اور اہمیت بڑھانا ہے۔ درحقیقت کلامِ نبوت کے طرزِ خطاب کی اہمیت اور خصوصیات سے ناواقفیت اور ان حدیثوں کے اصل مفہوم سے بے خبری ہی کا نتیجہ ہے کہ فرقہ معتزلہ اور خوارج نے ان حدیثوں کے ظاہری معنی مراد لے کر گناہ گار مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے اور خود گمراہی کے گہرے غار میں گر پڑے۔ اسی طرح اس زمانے کے بعض جاہل مبلغ جو حدیثوں کا صرف ترجمہ پڑھ پڑھ کر تبلیغ کرنے لگے ہیں، وہ بھی اپنی جہالت سے ان حدیثوں کا یہی مطلب بتاتے پھرتے ہیں، مثلاً تارکِ نماز مسلمان ہی نہیں اور جس میں عہد و امانت کی پابندی نہ ہو وہ مسلمان ہی نہیں، حالانکہ حدیث کا یہ مطلب بالکل ہی غلط ہے، کیونکہ تارکِ نماز یقیناً مسلمان ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ کامل درجے کا مسلمان نہیں، اسی طرح عہد و امانت کی پابندی نہ کرنے والا اگرچہ گناہگار ہے مگر بلاشبہ وہ مسلمان ہے۔

بہرحال علماء اہل سنت کا فرض ہے کہ وہ جب اس قسم کی حدیثوں کو بیان فرمائیں، تو ان کی حقیقی پوزیشن کو تفصیل کے ساتھ ضرور واضح کر دیں، تاکہ خالی الذہن عوام گمراہی کا شکار نہ ہوں، اور عوام کا فرض ہے کہ وہ جاہل مبلغوں کو ہرگز ہرگز منبرِ رسول پر نہ آنے دیں اور کبھی بھی ان کا وعظ نہ سنیں، ورنہ بہت بڑا خطرہ ہے کہ ان جاہلوں کی زبان سے حدیثوں کا غلط مطلب و مفہوم سن کر کہیں سامعین و حاضرین کا عقیدہ خراب، اور ان کا ایمان برباد نہ ہو جائے خداوند کریم ایسے جاہل واعظین سے بچائے۔

والمولیٰ تعالیٰ ہو الموفق۔ (منتخب حدیثیں ص ۶۶ تا ۶۸)

تین محبوب خصلتیں

حدیث ۹ ؛ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُكْرِمْ ضَیْفَهٗ وَمَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا یُؤْذِ جَارَهٗ وَمَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْرًا اَوْ لِیَصْمُتْ۔

(بخاری جلد دوم ص۸۸۹، مسلم جلد اوّل ص۵۰)

حل لغات فَلْیُكْرِمْ: عزت کرے ضَیْفَهٗ: اپنے مہمان کی، لَا یُؤْذِ: نہ تکلیف دے جَارَهٗ: پڑوسی لِیَصْمُتْ: خاموش رہے

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کوئی اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو،

---

[1] حضرت ابوہریرہ عبداللہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۵۹ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۸۵ سال تھی۔ آپ خیبر کے سال اسلام لائے اور خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر رہے اور حصول علم کے لئے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں رہنے لگے، ایک بار عرض کیا، یارسول اللہ! میں آپ سے سنتا ہوں لیکن یاد نہیں رہتا۔ آپ نے فرمایا: اپنی چادر بچھالے میں نے بچھادی، تو آپ نے بہت سی باتیں فرمائیں۔ جب آپ نے گفتگو ختم فرمائی، تو میں نے چادر کو اپنی طرف سمیٹ لیا، پھر اس کے بعد میں آپ کی کوئی بات نہ بھولا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کثیر الروایۃ ہیں۔ امام بخاری نے کہا کہ آٹھ سو سے زیادہ صحابہ اور تابعین نے ان سے روایت کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحرین پر ان کو عامل مقرر کر دیا۔ پھر عامل بنانا چاہا، تو آپ نے انکار کر دیا اور مدینہ میں رہ پڑے اور یہیں وفات پائی۔ بعض کا قول ہے کہ عقیق میں وفات پائی اور مدینہ منورہ لائے گئے۔ ان کا جنازہ امیر مدینہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے پڑھایا۔ اسد الغابہ جلد ۵ ص۳۱۶)

وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے اور جو اللہ و قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اُس کو چاہیے کہ وہ اپنے ہمسایہ کو تکلیف نہ پہنچائے اور جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اُس کو چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔"

تشریح اس حدیث پاک میں مومن کی تین صفاتِ حمیدہ کا ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہو اور قیامت کے دن میں جزا و سزا کا یقین رکھتا ہو، اُس کو چاہیے کہ آنے والے مہمان کی عزت اور دلجوئی کرے اور اپنے قول و فعل سے اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور بات کرے جس میں اُس کے دین و دنیا کا بھلا ہو، ورنہ خاموشی اختیار کرے، کیونکہ غلط اور معصیت والی کلام سے خاموش رہنا ہی ہزار ہا درجہ بہتر ہے۔ اب ان تینوں صفاتِ حمیدہ پر قدرے روشنی ڈالی جاتی ہے:

اکرام الضیّف مہمان کو خدا تعالیٰ کی نعمت سمجھنا چاہیے۔ آنے والا مہمان اپنی قسمت کھاتا ہے اور میزبان کے گناہوں کی بخشش کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ میزبان کو چاہیے کہ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سُنّت سمجھتے ہوئے اُس کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آئے، ترشروئی سے پیش نہ آئے، سختی و تنگی نہ اختیار کرے اور حتی الوسع خود خدمت کرے۔ اسی حدیث کی شرح میں علامہ غلام رسول صاحب سعیدی لکھتے ہیں: امام غزالی علیہ الرحمہ ذکر فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "مہمان کو ناپسند نہ کرو، جو شخص مہمان کو ناپسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس شخص کو ناپسند کرتا ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے غلام ابو رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مہمان آیا تو حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رکھ کر اُس کی ضیافت فرمائی۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ "مہمانوں کی دعوت سے شہرت اور فخر کا ارادہ نہ کرے، بلکہ مہمان کو خوش کرنے اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کو اپنانے کا ارادہ کرے۔"

امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمہ المتوفی ۹۷۳ھ فرماتے ہیں کہ "جب کوئی مہمان تمہارے پاس آئے، تو اس کی ضیافت کے وقت تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ وہ تمہیں اس دعوت کے عوض کوئی چیز دے گا یا تم اس سے کوئی دنیوی مطلب حاصل کر وگے، ورنہ اس دعوت سے اخلاص کی دولت نصیب نہ ہوگی اور نہ ہی سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت حاصل ہوگی۔" اصل طریقہ یہ ہے کہ مہمان کے ساتھ کھانا کھانا چاہیئے۔ (لواقح الانوار القدسیہ ص۴۶، ص۵۹)

امام غزالی ابو حامد محمد بن غزالی علیہ الرحمہ المتوفی ۵۰۵ھ فرماتے ہیں کہ "اگر ایک دو دن کے بعد مہمان رخصت ہونے کا ارادہ ظاہر کرے، تو میزبان کو چاہیے کہ مہمان کو تنہا کھانا کھانے کا موقع دے، ممکن ہے کہ میزبان کا ساتھ کھانا کھانا اس کی وجہ سے گراں گزرتا ہو۔"

امام شعرانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ حضرت سیدی علی خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ اپنے پاس آنے والے ہر مہمان کی تعظیم و تکریم نہ کرے اور یہ خیال کرے کہ یہ لوگ اس کے پاس اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں ان کے آنے پر خوش ہو اور سنتِ نبوی کے مطابق اُن سے حسنِ سلوک کرے اور اُن کی خاطر تواضع مقدور بھر کرے۔ نیز انہوں نے فرمایا: اگر کسی دوسرے شیخ، اُستاذ یا کسی دوسرے صاحبِ منصب کے مریدین، تلامذہ اور متعلقین کسی دوسرے شخص کے ہاں مہمان ہو کر جائیں، تو اُن کے سامنے اُن کے ممدوح کی شان میں کوئی کلمۂ تنقیص نہ کہے اور نہ ان لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے، جو ان کے ممدوحین سے منقطع ہونے کا

سبب ہو، بلکہ جس قدر ممکن ہو، ان کے سامنے اُن کے ممدوحین کی وہ خوبیاں بیان کرے، جو دراصل ان میں موجود ہوں۔ (شرح مسلم، جلد اوّل، ص ۱۴۶)

پڑوسی کے حقوق

اس حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ مومن کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے، بلکہ ایک روایت میں ہے: آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا "واللہ! وہ مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اُس کی اذیتوں سے بے خوف نہ ہو۔" ان احادیث میں جو ایمان کی نفی کی گئی ہے، اِس سے کمالِ ایمان کی نفی ہے، کیونکہ ایذا معصیت ہے اور معصیت سے ایمان کامل نہیں رہتا۔ نفسِ ایمان کی نفی مراد نہیں ہے۔ ایک اور روایت میں ہے: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جبریل (علیہ السلام) ہمیشہ مجھے ہمسایہ کے متعلق وصیت کرتے رہتے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ شاید ہمسایہ کو وارث قرار دے دیں گے۔ اس میں حقوقِ ہمسایہ کا مبالغہ سے بیان ہے کہ وہ ہمسایہ کو وارث کے قائم مقام کہیں گے نہ کہ حقیقتاً وارث۔

عمدۃ القاری شرح بخاری جلد ۲۲ ص ۱۰۸ میں ہے کہ "لفظ جار (ہمسایہ) مسلمان، کافر، عابد، فاسق، دوست، دشمن، مسافر، شہری، دیہاتی، نفع دینے والا، نقصان دینے والا، اپنا بیگانہ سب کو شامل ہے، یعنی مذکورین میں سے جو بھی اس کا ہمسایہ ہو، اس پر لازم ہے کہ ان کے حقوق کا لحاظ رکھے اور اس کی طرف قول و عمل کے ساتھ کوئی تکلیف نہ پہنچے۔"

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پڑوسی کے حقوق میں سے یہ ہے کہ اس کو ابتدائً سلام کرے اور اس سے زیادہ دیر تک گفتگو نہ کرے، اس کے خانگی معاملات کی تفتیش نہ کرے، بیماری میں اس کی عیادت کرے، مصیبت میں اظہارِ ہمدردی اور موت میں اس کی تعزیت کرے، اور تجہیز و تکفین میں شریک ہو، خوشی

کے موقع پر اُس کو مبارک باد دے اور اس کی خوشیوں میں شریک ہو، اُس کے عیوب معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے، اُس کے گھر میں نظر نہ ڈالے، اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے گھر والوں کا خیال رکھے اور اُس کی خواتین سے گفتگو کرنی پڑے تو نظر نیچی رکھے اُس کے بچوں سے پیار کرے، اور دین و دُنیا کی بھلائی سے متعلق جو باتیں اُس کے بچے نہ جانتے ہوں، اُن کو بتلائے۔ حضور انور صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا: اگر پڑوسی مدد طلب کرے، تو مدد کرو، اگر قرض مانگے تو قرض دو، فقر اور مرض میں اُس کی عیادت کرو، مر جائے تو جنازہ میں شریک ہو۔ خوشی کے موقع پر مبارک باد دو، اُس کی اجازت کے بغیر اس کے مکان کے سامنے اتنا اُونچا مکان نہ بناؤ، جس سے اُس کی ہوا رک جائے (یا بے پردگی ہو)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: "جب تم سالن پکاؤ، تو شوربا زیادہ کر دیا کرو تاکہ بوقتِ ضرورت پڑوسی کو دے سکو۔"

نیز حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ پڑوسی تین قسم کے ہیں: اوّل وہ جو پڑوسی بھی ہو، اور رشتہ دار بھی ہو، اُس کا حق سب سے زیادہ ہے۔ دوسری قسم عام مسلمان پڑوسی، اس کا حق دوسرے درجے کا ہے اور اس تفصیل میں تمام احکام اسی سے متعلق ہیں اور تیسری قسم کے پڑوسی غیر مسلم، جو احکام مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ ان تمام احکام اور حقوق کا غیر مسلم پڑوسی بھی حقدار ہے۔

(شرح مسلم جلد اوّل ص ۱۴۵ ص ۱۴۶)

نوٹ: جار سے مراد حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے روایت ہے، جو اُس کے گھر سے آواز، ندا کو سُن لے اور بعض فرماتے ہیں جو نماز صبح تیرے ساتھ مسجد میں ادا کرے، وہ پڑوسی ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

سے روایت ہے کہ گھر کی جانب سے چالیس گھر حق جوار (پڑوس) رکھتے ہیں۔

(عمدۃ القاری جلد ۲۲ صہ ۱۰۸)

خاموشی یا کلامِ خیر

تیسری چیز جس کا بیان اس حدیث میں ہے وہ یہ ہے یا تو کلامِ خیر کرے یا خاموشی اختیار کرے۔

کلامِ خیر میں ہے کسی کو امر بالمعروف کرنا اور نہی عن المنکر کرنا، وعظ و نصیحت کرنا، جب کسی کو خلافِ شرع کام کرتے دیکھے تو اس کو احسن انداز سے منع کرنا، اس کو پیار سے سمجھانا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے، مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذَالِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ (او کما قال) "یعنی جو خلافِ شرع کام دیکھے، اولاً ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے منع کرے اور اگر یہ بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے بُرا جانے۔ یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"

آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ "بات کرنی ہے، تو وہ کرے جس میں اُس کا اُخروی بھلا ہو، ورنہ اس کے لئے خاموشی بہتر ہے۔" آجکل ہم وقت گزارنے کے لئے ہنسی، مزاح اور ٹھٹھا کرتے رہتے ہیں، اپنے نفس کو بہلانے کا نام "دل لگی" کہتے ہیں، حالانکہ قرآنِ حکیم میں ہے: (ترجمہ) "کوئی قوم کسی قوم سے ٹھٹھا نہ کرے، ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔" اِسی طرح نہ عورتیں عورتوں کے ساتھ ٹھٹھا کریں، ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔" اسی طرح لایعنی اور بیہودہ لغو اور بے فائدہ کلام سے خاموشی ہی بہتر ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

وَمِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ۔

"یعنی اسلام کی خوبی میں سے ہے لایعنی گفتگو کو چھوڑ دینا۔

دُوسری جگہ ارشاد ہے ؛ ۔مَنْ صَمَتَ نَجَا۔ "جو خاموش ہوا، وہ نجات پا گیا۔"
حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

؎ دل ز پُر گفتن بمیرد در بدن — گرچہ گفتارش بود دُرِّ عدن

"دِل زیادہ بولنے سے مُردہ ہو جاتا ہے، چاہیے اس کا کلام عدن کے موتی ہوں۔"
مُولیٰ تعالیٰ اِن اخلاقِ حسنہ کو اختیار کرنے کی توفیق بخشے۔

اِسی حدیث کے بارے میں عینی نے کرمانی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ یہ ارشاد "جُوامع الکلم" سے آخری حکم عباداتِ قولیہ کی جانب اشارہ ہے۔ پہلے دونوں فعلیہ کی جانب اور ایک حکم میں کمینی صفات سے مزیّن ہونے کی طرف اشارہ ہے، یعنی جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا وصفِ تعظیم پایا جاتا ہو، اُس کے لئے ضروری ہے کہ خلقِ خدا پر شفقت کرے یا اچھی بات کہہ کر یا شر سے خاموش رہ کر یا وہ کام کرے، جس میں خلقِ خدا کا بھلا ہو، اور اس کام کو چھوڑ دے، جو نقصان دہ ہو۔

(عمدۃ القاری شرح بخاری، جلد ۲۲، ص۱۱۱)

علاماتِ نفاق

حدیث ۱؎ : عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ کَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنْھُنَّ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰی یَدَعَھَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔

(بخاری شریف جلد اوّل ص۱۰، مسلم شریف ج ۱ ص۵۶)

حلِ لغات

اَرْبَعٌ: چار، یَدَعُھَا: چھوڑے اس کو، اُؤْتُمِنَ: امانت رکھی جائے، خَانَ: خیانت کرے، غَدَرَ: بدعہدی کرے، خَاصَمَ: جھگڑا کرے۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ بیشک حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص میں چار باتیں ہوں گی، وہ خالص منافق ہوگا اور جس شخص میں ان چار باتوں میں سے ایک بات ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی، یہاں تک کہ وہ اس کو چھوڑ دے۔
(۱) جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے
(۳) جب کسی سے کوئی عہد کرے، تو عہد شکنی نہ کرے (اور جب جھگڑا کرے، تو بدزبانی کرے۔"

تشریح

اس حدیث میں علاماتِ نفاق کا ذکر کیا گیا ہے۔ منافق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک منافق اعتقادی، اور دوسرا منافقِ عملی۔

ل ابو محمد عبداللہ بن عمرو بن عاص بن وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ: باپ سے پہلے اسلام لائے۔ عالم و فاضل تھے۔ قرآنِ کریم اور کتب سابقہ کو پڑھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے رضا و غضب میں کتابتِ حدیث کی اجازت طلب کی حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اجازت فرمائی اور فرمایا: میں ہر حالت میں حق ہی کہتا ہوں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ سوائے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور کوئی مجھ سے زیادہ حافظ الحدیث نہ تھے، کیونکہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے۔ باپ کے ساتھ فتح شام میں حاضر رہے۔ یرموک کے دن اپنے باپ کا جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھا۔ صفین میں بھی باپ کے ہمراہ تھے، مگر بعد میں نادم ہوئے۔ ۶۳ھ میں وفات پائی۔ آپ کے سن وفات میں بہت اختلاف ہے۔ ۷۲ سال عمر پائی اور بقول بعض ۹۲ سال زندہ رہے۔ ابن بکیر نے ۹۰ اور ۷۰ میں شک کیا ہے۔ (اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۳۳)

منافقِ اعتقادی، تو وہ ہے جو بظاہر کلمہ پڑھے اور اسلام کا اقرار کرے اور باطناً کفر کرے اور ضروریاتِ دین کا منکر ہو، جیسا کہ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں منافقین عبداللہ بن ابی سلول وغیرہ، وہ تو کافر ہی نہیں، بلکہ علانیہ کافروں سے بدتر۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔

"یعنی منافقینِ اعتقادی کو جہنم کے نچلے طبقے میں ڈال دیا جائے گا۔"

منافقِ عملی وہ ہے کہ جس کے ایمان و عقائد میں تو کوئی خرابی اور نفاق نہیں ہے بلکہ وہ ظاہر و باطن میں مسلمان ہوتا ہے، لیکن اس کے بعض اعمال اور بعض خصلتیں منافقوں والی ہوتی ہیں۔ اس حدیث میں جس منافق کی چار خصلتوں کا ذکر ہے اس سے مراد منافقِ عملی ہے اور چاروں منافقانہ خصلتوں سے مراد منافقانہ اعمال و کردار ہیں۔ بعض احادیث مبارکہ میں تین کا ذکر بھی ہے۔ ان احادیث میں تعارض نہیں ہے، کیونکہ حصر مراد نہیں ہے۔ بعض میں تین کا ذکر فرمایا اور بعض میں چار کا۔ اس میں چار کا ذکر ہے، بلاشبہ یہ چاروں خصلتیں ہرگز ہرگز مومن کی خصلتیں نہیں ہیں، بلکہ یہ منافقوں کی عادتیں ہیں اور گناہ ہیں، لہٰذا جس طرح ایک مسلمان کو کفر و شرک اور تمام کبیرہ گناہوں سے بچنا ضروری ہے، اسی طرح مسلمان کو یہ بھی ضروری ہے کہ منافقانہ اعمال و کردار کی گندگی اور پلیدی سے اپنے آپ کو بچاتے رکھے۔

(نوٹ) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ یہ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کے منافقینِ اعتقادی کا بیان ہے کہ اس وقت یہ علامات ان منافقوں میں پائی جاتی تھیں اور ان علامات سے منافق کی پہچان ہو جاتی تھی۔

بہرحال یہ اعمال منافقانہ ہیں، کسی مومن کے شایان نہیں ہیں، اگرچہ جب تک ایمان و تصدیق باقی ہوگی ——— ہوگا تو وہ مومن لیکن ناقص ہوگا، جب تک وہ

اِن علامات کو نہ چھوڑے گا! اب ان چار خصائل کے متعلق قدرے عرض کیا جاتا ہے،
(وماتوفیقی اِلّا باللہ العظیم)

امانت میں خیانت

پہلی علامتِ نفاق امانت میں خیانت ہے۔ امانت ہر وہ چیز ہے، جو کسی کو بغرضِ حفاظت سپرد کی جائے، جس کو سپرد کی جائے، اُس کو امین کہتے ہیں۔ امین، امانت رکھنے والے کی اجازت کے بغیر جو اس میں تصرف کرے گا، اُس کو خیانت کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ امانت صرف روپے پیسے، مال و دولت اور سونا چاندی ہی نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ بات، راز اور ذمہ داری وغیرہ بھی امانت ہیں، مثلاً آپ کو کسی نے راز کی بات بتائی اور یہ کہہ دیا کہ کسی سے ظاہر نہ کرنا، وہ راز بھی امانت ہے، اگر ظاہر کر دیا گیا، تو خیانت ہو گی۔ اسی حاکم کی ذمہ داری ہے۔ رعیّت کے حقوق کا لحاظ اور ان سے انصاف کرے۔ جب حاکم اس میں خلاف ورزی کرے گا، یہ بھی خیانت ہو گی۔ اسی طرح جس ملازم کی جو ڈیوٹی ہے، اس میں کوتاہی بھی خیانت، بلکہ بندوں کا مال، عقل و اختیار۔ آنکھ۔ کان۔ ہاتھ اور پاؤں وغیرہ تمام جسمانی اعضاء۔ جو کہ خداوند کریم کی عطا کردہ ہیں، ان میں جو احکامِ خداوندی میں اُن کو بجا لانا امانت ہیں اور ان میں خلافِ شرع اعمال خیانت ہیں، کیونکہ مالک و مولیٰ کی اجازت کے بغیر جو تصرف ہو گا، وہ خیانت کہلاتا ہے۔

مولیٰ کریم جلّ شانہٗ، ارشاد فرماتا ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمَانَاتِکُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ہ	"اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت مت کرو اور اپنے آپ کی امانتوں میں بھی خیانت مت کرو، حالانکہ تم جانتے ہو۔"

اسی طرح حدیث میں ہے "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ" "جس سے مشورہ کیا جائے وہ امین ہوتا ہے۔"

اور اگر اُس نے جان بُوجھ کر غلط مشورہ دیا، تو خائن ہوگا۔

آج کل ہمارے معاشرہ میں یہ بیماری بہت عام ہوگئی ہے نہ حاکم کو رعیت کے حقوق کا لحاظ ہے نہ ملازم کو اپنی ڈیوٹی کا لحاظ نہ مشورہ میں اخلاص، نہ اپنی ذمہ داریوں کا پاس، بلکہ ہر طرف ظلم کا دَور دَورہ ہے۔ ہر ایک کو طلب زر کی ہوس۔ جس طرح بھی ہوسکے بندہ یہ چاہتا ہے کہ بہت بڑا مالدار بن جائے، کوئی جائز و ناجائز کا خیال نہیں کرتا۔ رشوت۔ لوٹ کھسوٹ، ملاوٹ اور ناپ تول میں کمی بہت ہی عام ہوگئی ہے اور یہ امانات میں خیانتیں ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ایسی جسارت سے محفوظ فرمائے۔

جھُوٹ دُوسری علاماتِ نفاق میں سے جھُوٹ ہے، اس کا مطلب ہے خلافِ واقع خبر دینا، یہ بہت بُری اور ملعون عادت ہے۔ اس سے مومن مرد بے اعتبار ہو جاتا ہے اور معاشرہ میں بے وقار اور اس کی عزت مجروح ہو جاتی ہے۔ مولیٰ تعالیٰ جلّ شانہ، ارشاد فرماتا ہے:

لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ۔ "جھُوٹوں پر خدا تعالیٰ کی لعنت"

حضور پُر نور شافع یوم النشور صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان بار بار جھُوٹ بولتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا نام جھُوٹوں کی فہرست میں لکھ دیا جاتا ہے۔ نیز آپ کا ارشادِ گرامی ہے کہ "جھُوٹ رزق کو کم کر دیتا ہے"۔ ایک موقع پر آپ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمایا: تُجَّارُ فُجَّارٌ، "یعنی تاجر لوگ فاجر ہیں"۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا بیع حلال نہیں ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا "تاجر لوگ اس لئے فاجر ہوتے ہیں کہ یہ بیع کے وقت جھُوٹی قسمیں بہت کھاتے ہیں اور جب بات کرتے ہیں تو جھُوٹ کرتے ہیں۔ (کیمیائے سعادت ص ۳۸۱)

یعنی مال فروخت کرتے وقت اس میں جو عیب ہوتا ہے، اس کو چھپالیں گے اور قیمتِ خرید غلط بتائیں گے اور اس پر قسم بھی اُٹھا لیتے ہیں تاہم دیانتدار تاجر کی عظیم شان ہے

آپ نے فرمایا: اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِیْنَ۔ (رواہ الترمذی)

"سچے تاجر کا حشر انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔"

بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ تم لوگ اپنے آپ کو جھوٹ سے بچائے رکھو۔ اس لئے کہ جھوٹ بدکاری کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور بدکاری جہنم میں کھینچ کر لے جاتی ہے اور آدمی ہمیشہ جھوٹ بولتا اور جھوٹ کا متلاشی رہتا ہے، یہاں تک کہ دفترِ خداوندی میں وہ کذاب (جھوٹا) لکھ دیا جاتا ہے۔ (مشکوٰۃ باب حفظ اللسان)

ایک حدیث میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کسی نے سوال کیا: کیا مؤمن بزدل ہوسکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "ہاں" پھر اُس نے سوال کیا کہ "کیا مؤمن بخیل ہوسکتا ہے؟" ارشاد فرمایا کہ "ہاں!" پھر اُس نے دریافت کیا کہ کیا مؤمن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ "نہیں!" (مشکوٰۃ شریف باب حفظ الایمان)

یعنی مؤمن ہو اور جھوٹ بولے، یہ اُس کے لئے ہرگز ہرگز لائق و مناسب نہیں ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔

"یعنی جھوٹ بولنا انہی لوگوں کا طریقہ ہے، جو ایماندار نہیں ہوتے۔"

مقامِ غور ہے کہ کتنی شدید وعید ہے، جھوٹ بولنے پر لیکن ہمارے معاشرہ میں جھوٹ بول کر فخر کیا جاتا ہے اور سمجھا یہ جاتا ہے کہ جب تک جھوٹ نہ بولا جائے تو کاروبار فروغ نہیں پاتا، حالانکہ یہ غلط سوچ ہے، بلکہ جھوٹ کی وجہ سے کام، کاج میں برکت اُٹھ جاتی ہے۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں کو جھوٹ بولنے سے محفوظ فرمائے۔

عہد شکنی تیسری علامتِ نفاق ہے عہد شکنی۔ یہ بھی بُری عادت ہے مؤمن کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وعدہ کرکے اس کی خلاف ورزی کرے اور وعدہ کا ایفا کرنا امرِ مستحسن اور مندوب ہے۔ مولیٰ تعالیٰ

ارشاد فرماتا ہے : اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۔ "جو وعدہ کرو، اُس کو پورا کرو۔"

وعدہ خلافی اس بات کا نام ہے کہ وعدہ کرتے وقت نیت وارادہ میں یہ ہو کہ وقتی طور پر ٹال مٹول کرنا ہے، حقیقت میں پورا نہیں کرتا۔ اگر وعدہ کرتے وقت ارادہ یہی ہے کہ وعدہ پورا کرے گا، لیکن کسی مجبوری یا عارضہ کی وجہ سے پورا نہ کرسکا تو اس پر مؤاخذہ نہ ہوگا، وہ معذور ہے۔

عینی شرح بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۲۱ پر مذکور ہے :

قَالَ الْعُلَمَاءُ يُسْتَحَبُّ الْوَفَاءُ بِالْوَعْدِ بِالْهِبَةِ وَغَيْرِهَا اِسْتِحْبَابًا مُؤَكَّدًا وَيُكْرَهُ خِلَافُهُ كَرَاهَةَ تَنْزِيْهٍ لَا تَحْرِيْمٍ۔

"علماء کرام نے فرمایا کہ ہبہ وغیرہ کے وعدہ کو پورا کرنا بہت ہی اہم امر مستحب ہے، اور اس کا خلاف کرنا مکروہِ تنزیہی ہے۔"

سچا وعدہ کرنا حضراتِ انبیاء کرام علیہم الصّلوٰۃ والسّلام اور صالحین کا طریقہ ہے۔ خداوندِ قدّوس جلّ شانہ، نے حضرت اسماعیل علیہ السّلام کی شان میں فرمایا:

اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ ۔ بے شک آپ وعدہ میں سچّے تھے۔

اِس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ منافق کا کام ہے وعدہ کرکے خلاف ورزی کرنا۔

واضح رہے کہ جس طرح کسی مخلوق سے عہد شکنی منع ہے، اسی طرح اپنے خالق ومالک اللہ تعالیٰ سے بھی عہد شکنی اور بدعہدی اس سے کہیں بڑھ کر حرام وگناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان سے اپنی توحید کا عہد لیا ہے اور علماء کرام سے خصوصی طور پر عہد لیا ہے کہ وہ کبھی بھی اور کسی حال میں بھی حق بات کو نہ چھپائیں، اِس لئے جو انسان یا علماء کرام کسی دنیاوی منافع کی خاطر مشرکین کی خوشنودی کے لیے غلط کام کر بیٹھتے ہیں۔ یا کلمۂ حق کو چھپاتے ہیں یا اس کو بیان نہیں کرتے، وہ بھی عہد شکنی ہے اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدہ خلافی کے مجرم اور گناہگار ہیں۔ ہمیں مولیٰ تعالیٰ اپنے

وعدوں کو پورا کرنے کی توفیق بخشے۔

گالی چوتھی علامتِ نفاق گالی ہے۔ جھگڑتے وقت گالی گلوچ کرنا اور گالیاں بکنا، یہی انتہائی قبیح عادت ہے اور نہایت ہی معیوب اور گھناؤنی خصلت ہے۔ گالی گلوچ تو کجا کسی مسلمان (یا کسی بھی انسان) سے جس سے اُس کی دل آزاری ہو یا کسی مسلمان کو ایسے القاب سے یاد کرنا جس سے اس کو ایذا پہنچتی ہو، ربِّ کریم جلّ وعلا نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔

سورۂ حجرات کی اس آیتِ کریمہ کو نگاہِ عبرت سے دیکھئے اور منافقانہ سیرتوں اور فاسقانہ عادتوں سے توبہ کیجئے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

(ترجمہ) "اے ایمان والو! نہ مرد مردوں کا مذاق اُڑائیں، عجب نہیں کہ وہ ہنسی اُڑانے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اُڑائیں ــ ہوسکتا ہے کہ وہ اِن ہنسنے والیوں سے بہتر ہوں۔" اور ارشاد گرامی ہے:

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا — اور ایک دوسرے کو آپس میں طعنہ نہ دو،
تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ — اور نہ ایک دوسرے کے بُرے نام رکھو۔

نصیحت اللہ اکبر! جب کسی مومن سے اس قسم کا مذاق جائز نہیں ہے جس سے اس کی دل آزاری ہوتی ہو اور نہ کسی مومن کو ایسے بُرے القاب سے پکارنا جائز ہے جس میں اس کی توہین کا پہلو نکلتا ہو، تو پھر بھلا کسی مومن کو گالیاں دینا اور بیہودہ بکنا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ بہرحال کسی مسلمان کو گالیاں دے کر یا اُس کے سامنے بیہودہ الفاظ زبان سے نکال کر تکلیف دینا یہ منافقوں کی خصلت اور فاسقوں کا طریقہ ہے۔ گالی دینا اور فحش کلامی کرنا ہرگز ہرگز مومن کا کام اور مومن کے شایانِ شان نہیں ہے اور نہ ہی کسی مُسلمان کو مناسب ہے۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں کو منافقانہ خصلتوں سے محفوظ فرمائے۔

کسی مسلمان کو کافر کہہ کر پکارنا

حَدِیث ۱۱۱ : عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَیُّمَا رَجُلٍ قَالَ لِاَخِیْہِ یَا کَافِرُ فَقَدْ بَاءَ بِھَا اَحَدُھُمَا۔

(بخاری جلد دوم ص۱۰۱، مسلم جلد اوّل ص۵۷)

حلِّ لغات

بَاءَ : لوٹا۔

اَحَدُھُمَا : دونوں میں ایک۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ جنابِ رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے اپنے بھائی کو کافر کہا، تو اِن دونوں میں سے ایک کفر کا مستحق ہوگیا۔"

تشریح اس حدیث میں مسلمان بھائی کو کافر کہنے سے منع فرمایا گیا ہے، کیونکہ اخوت سے مُراد اخوۃ الاسلام ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اگر کسی مسلمان نے اپنے بھائی مسلمان کو کافر کہہ کر پکارا، تو ان دونوں میں سے ایک پر کفر لوٹے گا۔ اگر جس کو کہا، اُس نے کفریہ کلمہ کہا ہوگا، تو وہ کافر ہوگیا، ورنہ کہنے والا کافر ہوجائے گا۔ اِس جگہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ آیا کافر کہنا گناہ ہے اور انسان گناہ سے کافر نہیں ہوتا، تو پھر قائل کس طرح کافر ہوجائے گا۔ اس اشکال کے علماء نے کئی جواب دیئے ہیں: (۱) اس سے مراد یہ ہے کہ قائل نے اگر اس کلمہ کو جان بوجھ کر کہا تو قائل گناہ کو حلال جاننے کی وجہ سے کافر ہوجائے گا۔

(۲) اگر کسی مومن کو ایمان کی وجہ سے کفر کی طرف منسوب کیا، تو اُس نے ایمان کو کفر قرار دیا، اِس وجہ سے قائل کافر ہوجائے گا۔

(۳) یہ آپ کا ارشاد بطورِ تغلیظ و تہدید ہے، اور مبالغہ کہنے سے یا کافر کہنے سے اور مسلمان کی جانب کفر کی نسبت سے منع کیا گیا۔

(۴) اس سے مراد یہ ہے کہ اس تکفیر کی معصیت اور گناہ اِس قائل پر لوٹے گا، اور اس کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔

(۵) اس طرح کسی کو کافر کہنے کا آخر انجام قائل کا کفر اختیار کرنے کا خطرہ ہے، کیونکہ معاصی کفر کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں، جیسا کہ علمائے کرام نے فرمایا: "اَلْمَعَاصِیْ تَزِیْدُ الْکُفْرَ وَیُخَافُ عَلَی الْمُکْثِرِ مِنْھَا اَنْ تَکُوْنَ عَاقِبَۃُ شُؤْمِھَا الْمَصِیْرَ اِلَی الْکُفْرِ" یعنی گناہ کفر کے سبب ہوتے ہیں، اور کثرت سے گناہ کرنے والے پر خوف ہوتا ہے کہ کہیں گناہوں کی نحوست کی وجہ سے اس کا انجام کفر پر ہو جائے۔" العیاذ باللہ تعالیٰ!

بہرحال کسی مسلمان کو بلا وجہ کافر کہنا سخت منع ہے اور گناہِ عظیم ہے، تاہم اگر گالی کے طریقہ پر کہا تو قائل کافر تو نہ ہوگا، لیکن اس کا یہ کلمہ شدید جرم اور گناہ اور خاتمہ کے خراب ہونے کا شدید خطرہ ہوگا۔ اس جگہ امام بخاری علیہ الرحمہ نے باب باندھا ہے: باب من اکفر اخاہ بغیر تاویل۔ اُس باب میں بیان ہے اُس کا، جس نے اپنے بھائی کو بغیر تاویل کے کافر کہا۔" یہ اس لئے فرمایا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت حاطب بن بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منافق کہا، جبکہ حضرت حاطب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشرکین کی جانب خط لکھا اور سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا راز افشاء کرنے کی کوشش کی۔ اُس وقت حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو منافق کہا، یہ اُن کا کہنا تاویل سے تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ مشرکین سے اس طرح کی خط و کتابت اور سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے راز کا افشاء ہو سکتا ہے منافقت کی وجہ سے ہو۔ تاہم سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

نے منع فرمایا، اور فرمایا، حاطب کو منافق نہ کہو، کیا تم نہیں جانتے وہ اہل بدر سے ہیں اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حاطب رضی اللہ تعالیٰ کے عذر کو قبول فرمایا اور اُن کی خطا کو معاف فرمادیا۔

مسئلہ:۔ کسی کو بطورِ گالی کافر کہنا گناہِ کبیرہ ہے اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کے عقائدِ صحیحہ کو باطل جانتے ہوئے اس کو کافر کہتا ہے، تو وہ کافر ہو جائے گا اور اگر ایک مسلمان عالمِ دین، صاحبِ فتویٰ کسی شخص کے کلمۂ کفر کی وجہ یا عقائدِ کفریہ کی بنا، پر اُس کو کافر کہے تو یہ کہنا صحیح ہوگا، جیسا کہ علماء عرب و عجم نے اشرف علی تھانوی، خلیل احمد انبیٹھوی، قاسم نانوتوی، غلام احمد قادیانی، رشید احمد گنگوہی اور ان کے متبعین کو اُن کی گستاخانہ عبارتوں اور کفریہ تحریروں کی وجہ سے ان پر فتویٰ کفر دیا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے سیدنا اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی کتاب "حسام الحرمین علی منحر الکفر والمین"

نسب بدلنا حرام ہے

حدیث ۱۲ عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ وَاَبِیْ بَکْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ سَعْدٌ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْہِ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ غَیْرُ اَبِیْہِ فَالْجَنَّۃُ عَلَیْہِ حَرَامٌ فَذَکَرْتُ لِاَبِیْ بَکْرَۃَ فَقَالَ وَاَنَا سَمِعَتْہُ اُذُنَایَ وَوَعَاہُ قَلْبِیْ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

(بخاری جلد دوم ص۱۰۰۱، مسلم جلد اوّل ص۵۷)

حلِّ لغات: مَنِ ادَّعٰی: جس نے نسبت کی۔ وَعَاہُ: یاد کیا۔ قَلْبِیْ: میرے دل۔

ترجمہ: "سیدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے اپنی نسبت اپنے باپ کی

۱؎ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ابو وقاص کا نام مالک تھا، قریشی زہری ہیں۔ ابو اسحٰق کنیت ہے۔ سترہ سال کی عمر میں اسلام لائے۔ ان سے روایت ہے کہ میں نماز فرض ہونے سے قبل اسلام لایا۔ یہ عشرہ مبشرہ سے ہیں۔ دس کبار صحابہ میں سے ایک ہیں اور چھ اصحاب شوریٰ میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں کہ جن پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی وفات کے وقت تک راضی رہے۔ بدر، احد، خندق۔ تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ احد کے روز کارہائے نمایاں کئے۔ ان میں سے پہلے شخص ہیں، جنہوں نے خدا کے راستے میں خون بہایا، اور تیراندازی کی، کوفہ کے عامل تھے۔ کوفیوں کی شکایت پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو معزول کر دیا۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کو اپنا ماموں فرمایا کرتے اور فرماتے میرے ماموں جیسا کس کا ماموں ہے؟ اور یہ اس لئے کہ سعد زہری ہیں اور آپ کی والدہ ماجدہ علیہا السلام بھی زہریہ تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فارس کی لڑائیوں میں ان کو امیر لشکر بنایا۔ قادسیہ میں ان ہی کی قیادت میں فارسیوں کو زبردست شکست ہوئی۔ ان ہی نے مدائن فتح کیا۔ انہوں نے ہی کوفہ کی بناء ڈالی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعا کی وجہ سے یہ مستجاب الدعوات تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شرف حضرت سعد کے حصہ میں آیا کہ احد کے دن ان کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ارم فداك ابي وامي ارم ايها الغلام الحزور" روایت کیا گیا ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی آپ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ زہری نے کہا کہ احد کے روز حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہزار تیر مارے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو گوشہ نشین ہو گئے اور کسی لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔ واقدی نے کہا کہ ان کی وفات ۵۵ھ میں ہوئی۔ ابونعیم فضل بن دکین نے آپ کا سن وصال ۵۸ھ بتایا ہے۔ مدینہ منورہ سے ۷ میل کے فاصلہ پر عقیق میں وفات ہوئی، مدینہ منورہ لائے گئے۔ مہاجرین میں سے یہی آخری مہاجر فوت ہوئے (اسد الغابہ ص ۲۹۲ ج ۲)

بجائے غیر کی طرف کی، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا باپ نہیں، اس پر جنت حرام ہے۔ سعد نے حضرت ابوبکرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سے اس روایت کو ذکر کیا تو ابوبکرہ[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا یہ حکم میرے کانوں نے سُنا اور حضور سیدِ عالم نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے میرے دل نے یاد کیا۔"

تشریح اس حدیث پاک میں ارشاد ہے: جو شخص جان بوجھ کر اپنی نسبت اپنے باپ کے علاوہ غیر کی جانب کرے، اس پر جنت حرام ہے۔

یہ آپ کا حکم تغلیظ و تہدید ہے، کیونکہ غیر باپ کی جانب نسبت کرنا حرام و گناہ تو ہے لیکن کفر نہیں ہے اور جنت کافروں پر حرام ہے، ہاں جو اس کو حلال جانے گا تو وہ کفر ہوگا۔ اس حدیث کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، جس نے اپنے باپ سے اعراض کیا اُس نے کفر کیا۔ اس کا مفہوم بھی یہی ہے جس نے اعراض کو جائز و حلال جانا تو وہ کافر ہوگا یا کفر سے مُراد کفرانِ نعمت ہے یعنی اُس نے اُبوہیت جیسی عظیم نعمت کا انکار کیا ہے یا اُس نے اللہ تعالیٰ کے حق یا اپنے باپ کے حق کا انکار کیا ہے یا پھر وہ بھی ارشاد تغلیظ و تہدید پر محمول ہے۔ بہرحال اپنے باپ کے غیر کی طرف نسبت کرنا اور اپنا نسب تبدیل کرنا بہت بڑا جرم اور کبیرہ گناہ اور ناجائز و حرام ہے۔ قرآن پاک میں بھی ہے: اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ۔ "یعنی جو منہ بولے بیٹے ہوتے ہیں، جس کو عربی میں متبنّیٰ کہا جاتا ہے، فرمایا: جب ان کی نسبت کر کے پکارنا ہو تو ان کے حقیقی باپ کی جانب نسبت کر کے پکارا جائے۔"

---

[1] حضرت ابوبکرہ نفیع بن الحارث کلدہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) طائف کے روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔ نیکوکار کثیر العبادۃ فضلاء صحابہ سے تھے۔ بصرہ میں سنہ ۵۱ھ اور بقولے سنہ ۵۲ھ فوت ہوئے (اسد الغابہ ج ۵ ص ۱۵۱) ان کی ماں سمیّہ حارث بن کلدہ ثقفی کی جاریہ تھیں۔ زیاد ان کا خیفی بھائی تھا۔ (اسد الغابہ ج ۵ ص ۳۸)

آجکل جس کو بچہ بنالیا جاتا ہے، یہ لوگ اس کا نام ہی تبدیل کردیتے ہیں، اور کاغذات میں اس پر درستگی کرنے والے کا نام باپ کی جگہ لکھ دیا جاتا ہے، یہ ناجائز ہے۔ ستم بالائے ستم ہے کہ غیر سید اپنے آپ کو سید کہلانا شروع کردیتے ہیں، اور جعلی سید اور پیر بن جاتے ہیں، دیکھو سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کتنی سخت وعید فرمائی ہے کہ ایسے شخص پر جنت حرام ہے۔ عقلی طور پر بھی یہ بہت بڑا جرم اور بہت بڑی قبیح حرکت ہے۔ جس جگہ نسب کرے گا اور حقیقی باپ کی جگہ دوسرے کا نام لکھے گا، گویا اس جگہ اپنی ماں پر بدکاری کا الزام اور اس شخص پر زنا کا الزام لگاتا ہے۔ جب کسی سید اور آل رسول کا نام درج کرے گا، تو سوچے اور اپنے ضمیر میں غور کرے کس ذات اور کس شخصیت کی طرف غلط نسبت کر رہا ہے اور اپنے آقا و مولیٰ سید عالم حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے آپ پر ناراض اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف و اذیت پہنچا رہا ہے۔

(ابوبکرہ) اس حدیث میں ایک راوی ہیں حضرت ابوبکرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جن کے حالات حاشیہ ۲ پر ہیں۔ آپ حارث بن کلدہ جاہلیت کے دور کا حکیم حاذق کے لڑکے ہیں، آپ کی والدہ کا نام سمیہ ہے، جو حارث مذکور کی لونڈی تھی، ان کے ماں جایا بھائی حضرت زیاد تھے، جن پر نسب کے تبدیل کرنے کا الزام تھا اور شیعان علی کو یہ بات ناگوار تھی، اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پسند نہ کرتے تھے، اسی لئے مسلم شریف میں ہے کہ حضرت زیاد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب نسبت کی تو ابوعثمان نے ابوبکرہ کو کہا: یہ تم نے کیا کیا؟ پھر حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت اُن کو سنائی اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تصدیق و تائید فرمائی۔

حضرت زیاد کا اصل واقعہ حضرت زیاد (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا اصل واقعہ کچھ اس طرح سے ہے۔ حارث بن کلدہ نے

ابوبکرہ کی ولادت کے بعد اپنی لونڈی سمیہ کا نکاح اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے کردیا اور اتفاق سے ابوسفیان کسی کام کی غرض سے طائف گئے، وہاں انہوں نے سمیہ سے جاہلیت کے طریقہ والا نکاح متعہ وغیرہ کرلیا، کیونکہ دورِ جاہلیت میں ایک عورت سے کئی لوگ نکاح کرلیتے اور مباشرت کرتے اور جب لڑکا پیدا ہوتا تو وہ عورت جس شخص کی طرف منسوب کرتی، اسی کا لڑکا شمار ہوتا۔ ابوسفیان کے نکاح کے بعد زیاد پیدا ہوئے تو سمیہ نے ابوسفیان کی طرف نسبت کی اور ابوسفیان نے بھی خفیہ طور پر اس نسب کا اقرار کرلیا۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں اس نسب کا اظہار ہوا اور آپ ابوسفیان کی طرف منسوب ہوتے اور خاندان بنوامیہ کا فرد شمار ہونے لگے۔ اس وقت یہ طعن ہوا۔ درحقیقت یہ اُن پر طعن درست نہیں ہے کیونکہ شریعت نے جاہلیت کے دور کے نام و انساب کو برقرار رکھا ہے اور اس نسب پر بصرہ کے چند باشندوں نے گواہی بھی دی، تو سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس نسب کو درست تسلیم کرلیا، لہٰذا یہ نہ تو زیاد پر کوئی اعتراض ہے نہ ہی سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کوئی طعن ہوسکتا ہے۔ اس نسب کے صحیح ہونے کی شہادت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے۔ آپ لکھتی ہیں:

مِنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِیْنَ اِلٰی زِیَادِ بْنِ اَبِیْ سُفْیَان۔ (تہذیب تاریخ ابن عساکر ج ۵ ص ۴۱۱) جب اُن کے نسب کو سیدہ نے بھی درست مانا تو اب سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر لوگوں کا طعن کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

یہ سارا واقعہ شرح مسلم جلد اول صفحہ ۱۶۷ سے درج کیا گیا ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں ہرگز ہرگز اپنا نسب تبدیل نہ کیا جائے اور نہ کسی غیر سید کے لئے جائز ہے کہ وہ سید کہلوائے اور اپنے آپ کو سید لکھے۔ آجکل یہ مرض عام ہوگیا ہے اور یہ بیماری پھیل گئی ہے، عوام تو عوام ہی ہیں خواص بھی اس مرض کے شکار ہوچکے ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

مسلمانوں سے گالی اور لڑائی کا حکم

حدیث ۱۳۷: عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَّقِتَالُہٗ کُفْرٌ۔

(بخاری جلد اوّل ص۱۲، مسلم جلد اوّل ص۵۸)

حلِ لغات: سِبَاب: گالی دینا۔ فُسُوْق: طاعت سے نکلنا۔ قِتَال: لڑنا۔

ترجمہ: "سیدنا عبداللہ ابن مسعود[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور لڑنا جھگڑنا کفر ہے۔"

تشریح سِباب کسرِ سین کے ساتھ ہے اور یہ اسم مصدر ہے اس کا معنیٰ ہے: الشتم وھو التکلم فی عرض الانسان بما یعیبہ (عینی) انسان کی عزت و آبرو کو داغدار کرنے والی بات کرنا ہمارے عرف میں اس کا معنیٰ ہے

---

[1] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ان کا باپ ایامِ جاہلیت میں عبد بن حارث کا حلیف تھا یہ قدیم الاسلام ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے اسلام لائے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے ان کو اپنی خدمت میں لے لیا۔ حبشہ اور مدینہ دونوں طرف ہجرت کی اور ہر دو قبلہ کی جانب نماز پڑھی۔ بدر، احد، خندق، بیعتِ رضوان اور جملہ دیگر مشاہد میں رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے ساتھ حاضر رہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے بعد یرموک میں حاضری دی اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے روایت کی اور ان سے حضرت ابن عباس، ابن عمر، ابو موسیٰ، عمران بن حصین، ابن زبیر، جابر، انس، ابو سعید، ابو ہریرہ، ابو رافع وغیرہم صحابہ علیہم الرضوان

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

گالی دینا، اور فسوق کا لغوی معنی ہے نکلنا، اور اصطلاحی معنی ہے اللہ عزوجل اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طاعت اور فرمانبرداری سے نکلنا اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنا اور قتال کا معنیٰ ہے قتل کرنا اور لڑنا جھگڑنا بھی ہے ۔ اس حدیث کی تخریج بخاری مسلم، ترمذی اور نسائی نے بھی کی ہے ۔ اس حدیث کے راوی ابو وائل سے زبید نے فرقہ مرجئہ کے بارے میں سوال کیا، تو ابو وائل نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت سنائی۔

فرقہ مرجئہ یہ ایک ایسا فرقہ ہے جو اعمال میں تاخیر کرتے ہیں اور ہر وقت یا امید رہتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ جس طرح کفر کے ساتھ طاعت فائدہ نہیں دیتی، اسی طرح ایمان کے ہوتے ہوئے معصیت نقصان نہیں دیتی۔ جب ابو وائل سے ان کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آپ نے حدیث بیان فرمائی کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور لڑنا جھگڑنا کفر ہے، تو اس میں ان کے عقیدہ کی تردید کر دی گئی کہ ان کا عقیدہ تو ہے ایمان کے ساتھ معصیت ضرر نہیں دیتی، جبکہ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ مسلمان کو گالی دینا اور لڑنا جھگڑنا بھی نقصان دہ ہے، اس پر دوسرے گناہوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ اس میں گالی گلوچ کو جو فسق کہا گیا ہے، وہ بلا تاویل اپنے ظاہر پر ہے، لیکن جو قتال اور مقاتلہ کو کفر کہا گیا ہے، اس میں تاویل کرنا ضروری ہے کیونکہ اس میں اہل سنت کا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) نے روایت کی ہے اور حضرت علقمہ، ابو وائل، اسود، مسروق، عبیدہ، قیس بن ابی حازم وغیرہم تابعین نے ان سے روایت کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو کوفہ میں معلم بنا کر بھیجا اور لکھا کہ بدری صحابہ میں سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے برگزیدہ صحابی ہیں۔ کتاب اللہ کے بہت بڑے عالم تھے، شب بیدار تھے۔ آپ کی وفات مدینہ منورہ میں ۳۲ھ میں ہوئی، بقیع میں دفن ہوئے۔ ساٹھ سال سے کچھ اوپر عمر پائی ۱۲ اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۵۹

اتفاق و اجماع ہے کہ انسان گناہ کرنے سے کافر نہیں ہو جاتا۔ یہ خوارج کا عقیدہ ہے۔ ابن بطال کے مطابق کفر سے مراد دینِ اسلام سے نکلنا نہیں ہے، بلکہ حقوقِ مسلمین کی ناشکری اور کفرانِ نعمت ہے کہ ربّ کریم نے تو مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی فرمایا ہے اور آپس میں صلح اور مصالحت، ایک دوسرے کی اصلاح کا حکم فرمایا ہے۔ اب جو مسلمان کسی مسلمان بھائی کو قتل کرے گا یا لڑے جھگڑے گا، وہ حقوقِ مسلمین کی ناشکری کا ارتکاب کرتا ہے، اس کو آپ نے کفر سے تعبیر فرمایا۔

کرمانی نے کہا ہے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے لڑائی جھگڑے کی نحوست کی وجہ سے اس کا انجام کفر پر ہونے کا خطرہ ہے اور خطابی نے کہا کفر سے مراد حقیقی کفر ہی ہے، لیکن یہ اس کے لئے ہے جو بلا سبب اور بغیر تاویل کے مسلمان کے قتل اور لڑنے کو جائز سمجھے گا۔ ہاں تاویل سے لڑنے جھگڑنے والا اس حکم سے خارج ہے جیسے باغیوں کا امام برحق کے خلاف کسی تاویل سے لڑنا، جھگڑنا اور مقاتلہ کرنا، اگرچہ گناہ تو ہے لیکن کفر نہیں ہے بہرحال اس کلمہ کی تاویل لازم ہے، اگر یہ سوال کیا جائے جب سباب اور قتال دونوں فسق ہیں، تو قتال میں کفر کیوں فرمایا گیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ قتال سباب سے اغلظ اور اشد ہے یا قتال کفار کے احوال سے زیادہ مشابہ ہے۔

گالی

گالی دینا اور فحش کلامی کرنا اور ایک دوسرے پر لعنت کرنا نہایت بُری اور قبیح عادت ہے اور اپنے منہ اور زبان کو گندہ کرنا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ فحش کلامی کرنے والے پر بہشت حرام اور ارشاد فرمایا کہ دوزخ میں کچھ لوگ ایسے جائیں گے کہ جن کے منہ سے پلیدی نکلے گی اور اس کی گندگی سے تمام اہل دوزخ فریاد کریں گے اور کہیں گے کہ یہ کون لوگ ہیں کہ جن کی بدبو سے ہم سخت پریشان ہیں، تو کہا جائے گا یہ وہ لوگ ہیں کہ جو فحش کلامی کیا کرتے تھے اور فحش کلامی کو دوست رکھتے تھے۔" (کیمیائے سعادت ص ۲۷۵)

حضرت ابراہیم بن میسرہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص دنیا میں فحش کلامی کرے گا، قیامت کے روز وہ کتے کی شکل میں ہوگا۔ (کیمیائے سعادت ص۳۷۵)

مشکوٰۃ شریف ص۴۱۳ میں ہے:

لَا یَکُوْنَ الْمُؤْمِنُ لَعَّانًا۔ "مومن کسی پر لعنت کرنے والا نہیں ہوتا"

جو شخص کسی پر لعنت کرتا ہے، اگر وہ لعنت کے قابل ہے تو اس پر لعنت واقع ہوگی اور اگر وہ لعنت کے قابل نہیں، تو وہ لعنت اس لعنت کرنے والے پر لوٹ آتی ہے

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّہٗ مَنْ لَعَنَ شَیْئًا لَیْسَ لَہٗ بِاَھْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَۃُ عَلَیْہِ (مشکوٰۃ ص۴۱۲)

بے شک جو شخص لعنت کرتا ہے کسی چیز پر، اگر وہ اس چیز کی اہل نہ ہوگی، تو لعنت اس پر لوٹ آتی ہے۔

ہمارے معاشرہ میں بات بات پر گالی، فحش کلامی اور لعنت کی جاتی ہے سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات مبارک کی طرف غور کرنا چاہیے اور اس بری خصلت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔

فسوق جیسا کہ لکھا گیا ہے کہ فسوق کا معنی ہے اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طاعت سے نکلنا، اس کے تین درجے ہیں:

(۱) **تغابی**: گناہ کبیرہ کو برا جانتے ہوئے کبھی کبھی شامتِ نفس سے گناہ کرلینا، اس درجہ میں انسان ادنیٰ توجہ سے توبہ کرلیتا ہے۔

(۲) **انہماک**: گناہ میں لذت محسوس کرے اور اس کا عادی ہوجائے — اس درجہ میں گناہ کو چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے تاہم اگر کوشش کرے اور اس کو بار بار گناہ کی خرابی کی طرف توجہ دلائی جائے تو امید ہے کہ گناہ ترک کردے اور تائب ہوجائے۔

(۳) جحود: گناہ کو صحیح اور بہتر سمجھنے لگے اور اس کو صحیح سمجھ کر کرے۔ جب انسان فسق کے اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے، تو گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ گناہ حرام قطعی ہو تو اسلام سے خارج ہو کر مرتد ہو جائے گا، ورنہ گمراہی میں تو کوئی شبہ نہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔ (شرح مسلم، جلد اوّل للسعیدی صفحہ ۱۶۷-۱۶۹)

قتل کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا بہت بڑا کبیرہ گناہ ہے اور عظیم گھناؤنا جرم ہے اور اس کی دنیاوی سزا قصاص ہے، اور اخروی سزا جہنم میں مکثِ طویل ہے۔ مولیٰ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا۔

یعنی جس نے جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کیا، تو اس کی جزا جہنم ہو گی، وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔"

اس خلود سے مراد مکثِ طویل ہے، ہاں جو حلال سمجھ کر کسی مسلمان کو قتل کرے گا، وہ دائمی جہنمی ہو گا، اور کافر ہو جائے گا۔

آجکل بندے معمولی معمولی بات پر جھگڑتے ہیں، آخرکار ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ تخریب کاری، دہشت گردی بہت عام ہو گئی ہے اور انسانوں کا قتلِ عام کیا جا رہا ہے اور معاشرہ تباہی کے گڑھے میں گر رہا ہے اور ملک کا امان تہس نہس ہو گیا ہے کہ نہ کسی کی جان محفوظ ہے اور نہ ہی کسی کی عزت و آبرو محفوظ ہے۔ اس حدیث کو اگر مشعلِ راہ بنا لیا جائے، تو معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ ہو جائے گا، راحت و چین، سکون و اطمینان کا دور دورہ ہو گا۔

مولیٰ کریم جل شانہٗ، سرکارِ مدینہ سُرورِ سینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔

افضل اعمال

حدیث ۱۴ : عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ سَاَلْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْعَمَلِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الصَّلٰوۃُ عَلٰی وَقْتِہَا قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ ثُمَّ بِرُّ الْوَالِدَیْنِ قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ اَلْجِہَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ حَدَّثَنِیْ بِہِنَّ وَلَوِ اسْتَزَدْتُّہٗ لَزَادَنِیْ۔ (بخاری جلد اوّل صـــ۷۶ ، مسلم جلد اول صـــ۶۲)

حلِّ لغات اَیُّ الْعَمَلِ: کونسا عمل۔ بِرُّ الْوَالِدَیْن: والدین سے حسنِ سلوک۔ اِسْتَزَدْتُّہٗ: زیادہ چاہتا۔ لَزَادَنِیْ: مجھے زیادہ ارشاد فرماتے۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کو کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے۔ فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا، میں نے عرض کیا: اس کے بعد؟ فرمایا: پھر والدین سے حسنِ سلوک کرنا۔ میں نے عرض کیا: پھر اس کے بعد؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا۔ راوی فرماتے ہیں کہ آپ نے مجھے ان امور کی خبر دی دیکھتے ہیں کہ میں نے ان سوالات پر اکتفا کی، اگر میں آپ سے زیادہ طلب کرتا تو آپ اور زیادہ ارشاد فرماتے۔"

تشریح اس حدیث میں آپ نے افضل اعمال کا بیان فرمایا ہے: (۱) وقت پر نماز پڑھنا (۲) ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیکی اور اُن کی خدمت کرنا (۳) راہِ خدا میں کفّار کے ساتھ جہاد اور جنگ کرنا تاکہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کا نام بلند ہو اور دشمنانِ خدا و رسول مغلوب ہوں

راوی فرماتے ہیں: "میں نے مزید سوالات کا سلسلہ جاری نہ رکھا، اگر میں مزید سوالات کرتا، تو آپ مزید افضل اور محبوب ترین اعمال بتلا دیتے۔"

اس جگہ ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ بعض احادیثِ مبارکہ میں افضل اعمال اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا، پھر جہاد، پھر حج کا ذکر ہے اور بعض میں افضل عمل وقت پر نماز، پھر والدین سے نیکی پھر حج اور بعض میں وقت پر نماز، پھر والدین سے حُسنِ سلوک، پھر جہاد۔ اور پہلے ذکر ہوگیا ہے کہ بہتر مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور بعض میں ہے کہ افضل عمل کھانا کھلانا اور سلام کو عام کرنا۔

اِن احادیثِ مبارکہ میں تعارض معلوم ہوتا تو ان میں تطبیق کس طرح ہوگی؟

محدثین نے مختلف وجوہِ تطبیق بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ مختلف جوابات مختلف اشخاص کے اعتبار سے ہیں جیسے اشخاص اس مجلس میں تھے۔ ان کے اعتبار سے جوابات، اور ارشادات فرمائے یا سائل کے حالات کے اعتبار سے فرمائے ہیں اور بعض نے فرمایا یہ مختلف جوابات مختلف احوال کے اعتبار سے ہیں۔ مثلاً بعض احوال میں جہاد افضل ہے، تاہم ایمان باللہ مطلقاً تمام کے حق اور تمام احوال میں افضل اعمال ہے، جیسا کہ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

حجة لمن لم يحج افضل من اربعين غزوة وغزوة لمن حج افضل من اربعين حجة	جس نے حج نہیں کیا، اس کے لئے چالیس غزوات سے افضل ہے اور جس نے حج کرلیا ہے اُس کے لئے غزوہ چالیس حج سے افضل ہے۔

(مسلم جلد اوّل ص۶۳ برحاشیہ)

اس طرح مختلف احوال اور مختلف اشخاص کے اعتبار سے جوابات ہیں۔ بعض نے فرمایا اِن روایات میں لفظ من محذوف ہے اور اس کا حذف کلامِ عرب میں عام ہے۔

تو مطلب یہ ہوا کہ یہ سب امور افضل اعمال سے ہیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظ ثم ترتیب کے لئے ہوتا ہے تو یہ کس طرح ہوگا؟ اس کا جواب ہوگا کہ لفظ ثم اس جگہ صرف ترتیب ذکری کے لئے ہے، اور ثم کا ترتیب ذکری کے لئے ہونا کلام عرب میں عام ہے اور قرآن پاک میں بھی ترتیب ذکری کے لئے استعمال ہوا مثلاً۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ۔ یہ جواب شارح مسلم علامہ نووی علیہ الرحمہ نے مسلم جلد اول ص ۶۳ پر شرح میں ذکر کیا۔ شارح مسلم مولانا علامہ غلام رسول سعیدی شرح مسلم جلد اول ص ۱۸۵ پر فرماتے ہیں:

ایک جواب یہ بھی ہے کہ عقائد کے باب میں ایمان باللہ سب سے افضل ہے اور اعمال میں بعض حقوق اللہ ہیں اور بعض حقوق العباد۔ حقوق اللہ میں بعض صرف بدنی عبادات ہیں اور بعض صرف مالی اور بعض بدنی اور مالی کا مجموعہ اور حقوق العباد میں ماں، باپ، رشتہ دار اور عام مسلمانوں کے حقوق ہیں، حقوق اللہ میں صرف بدنی عبادات میں نماز کو اپنے وقت میں پڑھنا سب سے افضل ہے اور صرف مالی عبادات میں زکوٰۃ افضل ہے اور مالی اور بدنی عبادات کے مجموعہ میں حج اور جہاد سب سے افضل ہیں۔ اور حقوق العباد میں والدین کے ساتھ نیکی اور خدمت کرنا اور عام لوگوں کو کھانا کھلانا اور ان سے میل جول اور ان کو اپنے شر سے محفوظ رکھنا افضل اعمال ہیں۔ اب اس حدیث میں مذکور اعمال کے بارہ میں قدرے لکھا جاتا ہے:

نماز بروقت پڑھنا شریعت میں ایمان کے بعد اہم ترین فریضہ نماز ہے، باقی تمام احکام فرشی ہیں اور نماز والا حکم عرشی ہے۔ لیلۃ معراج کو یہ تحفہ عنایت ہوا، اسی لئے نماز کو مومنوں کی معراج قرار دیا گیا ہے اور آپ نے فرمایا ہے تین کاموں میں جلدی کرنا چاہیے:

(۱) نماز، جب اس کا وقت آجائے (۲) جنازہ جب حاضر ہو جائے۔

کفو مل جائے۔
(۳) اور بالغ لڑکی کے نکاح میں جب اس کا مناسب
(یہ حدیث کا مضمون ہے) اس حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے
محبوب ترین عمل بروقت نماز پڑھنا ہے۔
حدیث شریف میں ہے کہ نماز دین کا ستون ہے، جس نے نماز قائم کی اُس نے
دین کو قائم رکھا اور جس نے نماز کو چھوڑ دیا، اس نے دین کی عمارت کو ڈھا دیا۔
قرآن و حدیث میں نماز ترک کرنے والوں کے بارے میں بڑی بڑی شدید اور اشد
وعیدیں آئی ہیں، جن کو سُن کر مومن کے جسم کا رونگٹا رونگٹا اور بدن کا بال بال لرزہ
براندام ہو جاتا ہے، ان میں سے صرف ایک آیت اس وقت پیش کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ
ارشاد فرماتا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۙ (مریم: ۵۹)

یعنی نیک بندوں کے پیچھے کچھ ایسی نالائق اولاد آئی، جنہوں نے نماز کو برباد کیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔ یہ لوگ عنقریب جہنم کی وادی میں داخل کئے جائیں گے، جس کا نام غیّ ہے۔

وادیٔ غیّ کیا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ارشاد فرماتے ہیں:
"وادیٔ غیّ جہنم کی ایک ایسی اندوہناک وادی ہے کہ خود جہنم اس سے روزانہ ایک ہزار
مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ یہ دردناک عذاب کی وادی ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے
جو نماز باجماعت کے چھوڑنے والے ہیں۔
اللہ اکبر! الامان الامان! برادرانِ ملت اور اسلامی بھائیو! سوچو تو سہی
کہ ہم میں سے کون ہے جو وادیٔ غیّ کے عذاب کی طاقت رکھتا ہے؟ لہٰذا
خدا تعالیٰ کے لئے اے بزرگو! دوستو! بھائیو! نماز باجماعت کی پابندی کرو۔

ہائے افسوس! آج ہم امن و چین میں رہتے ہوئے بھی نماز با جماعت سے اس قدر سستی اور بے پرواہی برت رہے ہیں۔ مسلمانو! اسی زمین کے اوپر اور اسی آسمان کے نیچے کبھی ایسے بھی مسلمان تھے، بقول علامہ اقبال علیہ الرحمہ ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز، قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز، نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اسلامی بھائیو! تم مانو یا نہ مانو، مگر یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو آفتاب نصف النہار کی طرح عالم آشکار ہے کہ ہم مسلمانوں کی ذلت و خواری اور بربادی و ہلاکت کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں سر جھکانا چھوڑ دیا ہے جس کا یہ وبال ہے کہ آج ہم ایسے ایسے ذلیل و خوار اور کمینے انسانوں کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کرتے پھرتے ہیں جو کبھی ہماری جوتیوں کی ٹھوکروں کے فٹ بال بنے ہوئے تھے مگر پھر بھی ہمیں کہیں پناہ نہیں مل رہی۔ اگر ہم اپنے معبودِ حقیقی کا سجدہ کرتے تو خدا تعالیٰ کی قسم وہ غیرت والا ربِّ کریم کبھی بھی ہرگز ہرگز ہمارے سروں کو کسی دوسرے کے سامنے نہ جھکنے دیتا، بلکہ وہ ہم کو اتنا سربلند فرما دیتا کہ آسمان کی بلندی جھک جھک کر ہمارے سروں کی سربلندی کو سلامِ نیاز کا نذرانہ پیش کرتی کہ سر محمد اقبال شاعرِ مشرق نے کہا: ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ماں باپ سے حسنِ سلوک

علماء کرام کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کے بعد والدین کی فرمانبرداری کا مقام ہے۔ باقی تمام لوگوں سے

زیادہ احسان کے مستحق والدین ہیں اور شکریہ کے زیادہ حقدار ہیں۔

رب کریم جل وعلا ارشاد فرماتا ہے:

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ط (پ ۱۵)

اور تمہارے رب نے حکم فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت و عبادت کے بعد والدین کی اطاعت اور اُن کے ساتھ احسان کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع و اطاعت کے بعد والدین کی اطاعت جائز امور میں لازم و واجب ہے۔

پھر ایک دوسرے مقام پر خداوند قدوس جل وعلا نے ارشاد فرمایا:

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ۔ (سورۃ لقمان، پ۲۱)

میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا بھی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں اپنے لئے شکر ادا کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی والدین کا شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ انسان پر سب سے زیادہ احسانات اللہ تبارک وتعالیٰ اور اُس کے محبوب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہیں۔ ان کے بعد باقی تمام مخلوق سے زیادہ احسان والدین کے ہیں، اسی لئے ایسی عبادت کے ساتھ ساتھ اُن کی فرماں برداری اور اپنے شکریہ کے حکم کے ساتھ اُن کے شکر کا حکم فرمایا۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رِضَی الرَّبِّ فِیْ رِضَی الْوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ فِیْ سَخَطِ الْوَالِدِ (مشکوٰۃ ص۴۱۹)

اللہ تعالیٰ کی رضا، والدین کی رضا میں ہے اور اُس کی ناراضگی والدین کی ناراضگی میں ہے۔

یعنی اگر والدین راضی ہوں، تو مولیٰ تعالیٰ بھی راضی ہو جاتا ہے اور اگر والدین ناراض ہوں، تو حق تعالیٰ جلّ شانہ، بھی ناراض ہو جاتا ہے۔

ایک شخص نے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں عرض کیا:۔

یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا حَقُّ الْوَالِدَیْنِ عَلٰی وَلَدِیْہِمَا قَالَ ھُمَا جَنَّتُکَ اَوْ نَارُکَ (مشکوٰۃ ص ۴۲۱)

یارسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) والدین کا اولاد پر کیا حق ہے؟ ارشاد فرمایا کہ وہ تیری جنت ہیں یا دوزخ۔

اس حدیث میں بھی ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کو محبوب تر اور افضل اعمال میں شمار فرمایا گیا ہے۔

کتنے دُکھ کی بات ہے آجکل لوگ اپنی عورت کو ماں پر ترجیح دیتے ہیں۔ عورت کو راضی رکھنے کے لیئے ماں کو تنگ کرتے ہیں اور ناراض کر لیتے ہیں اور اپنے دوستوں کو راضی رکھتے ہیں، چاہے باپ ناراض ہو جائے۔ اسی کی یہ نحوست ہے کہ معاشرہ بگڑ گیا ہے اور والدین اپنی اولاد سے نالاں اور پریشان ہیں۔

یہاں پر یہ لکھ دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ والدین کو بھی چاہیے کہ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کریں، اور ان کو دینِ اسلام کی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کریں تاکہ اولاد ماں باپ کے حقوق کو پہچانے اور ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرے اولاد کی سوسائٹی کا خیال رکھیں اور بُری مجلس اور صحبتِ بد سے اولاد کو بچائیں تاکہ صُحبتِ بد کے بُرے تاثرات اولاد میں نہ آجائیں، بلکہ نیکی کے راستہ پر گامزن ہوں۔ واللہ الموفق و ہو الہادی

جہادِ فی سبیل اللہ اِس حدیث میں تیسرا عمل جس کو افضل اعمال میں شمار کیا گیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ تعالیٰ کا نام بُلند کرنے کے لیئے کفّار سے جنگ کرنا اور لڑنا اور مسلمانانِ عالم کو کفّار کے شر سے بچانا، اقوامِ عالم کو دعوتِ توحید اور نیکی کا حکم دینا، اور بُرائی سے روکنا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ' ارشاد فرماتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (الآیۃ)

"تم بہترین اُمت ہو، جو لوگوں میں ظاہر کیے گئے نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو۔"

اس آیتِ مبارک سے معلوم ہوا کہ مسلمان تمام اقوامِ عالم کے راہنما بنا کر بھیجے گئے ہیں کہ خود خدا پرستی کریں اور باقیوں کو خدا پرستی سکھائیں، خود نیکی کریں، اور دوسروں کو نیکی کی تعلیم دیں اور خود برائی سے بچیں اور دوسروں کو بھی بُرائی سے بچنے کی ہدایت کریں، خود ظلم نہ کریں اور دوسروں کو ظلم نہ کرنے دیں، اپنے حقوق کی حفاظت کریں، اور دوسروں کے حقوق بھی محفوظ رکھیں۔

ظاہر ہے کہ یہ راہنمائی اور یہ ہدایت اور یہ حفاظت، اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک قومِ مسلم کو اقتدار اور قوت و سلطنت حاصل نہ ہو اور یہ قوت و سلطنت، جہاد ہی کی برکت سے حاصل ہوتی ہے۔ اِسی لئے مسلمانوں پر جہاد فرض فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (الآیۃ)

"تم پر جہاد فرض کر دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تم کو ناگوار ہے۔"

بہت سی ایسی چیزیں ہیں، جو تم کو ناگوار ہوں گی، لیکن وہ درحقیقت تمہارے لیے بہتر ہوں گی، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر وقت جہاد کے لئے تیار رہیں، اور اس کے لئے بہت ضروری اشیاء، اسلحہ وغیرہ کا انتظام کریں اور فوجی ٹریننگ کو اپنے اوپر لازم کریں۔ مولیٰ تعالیٰ جل شانہ' ارشاد فرماتا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ۔ (پ ۱۰)

(اے مسلمانو!) اپنے دشمنوں کے لئے جو طاقت تیار کر سکتے ہو، وہ تیار کرو۔

اس میں اُمتِ مسلمہ کو واضح طور پر جہاد کے ذریعے قوت و طاقت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس قوت سے قومِ مسلم اپنے فریضہ کو احسن طریقہ سے ادا کر سکے۔

جہاد کے منافع

ذرا غور کریں جہاد فی سبیل اللہ میں کونسی خوبی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے متعدد مقامات میں جہاد کا حکم فرمایا اور نبی مختار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین خوشی خوشی جہاد میں اپنی جانیں قربان کرنا سعادت سمجھتے ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا، جہاد ہی سے آزادی حاصل ہوتی ہے، جہاد ہی سے مُلکِ خدا کی بادشاہی ملتی ہے۔ جہاد ہی سے جنت ملتی اور شہادت حاصل ہوتی ہے اور اس سے مولیٰ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی نصیب ہوتی ہے۔ جہاد سے عبادت گاہیں آباد، اور مساجد محفوظ ہوتی ہیں۔

جہاد کا ایک بڑا عطیہ یہ ہے کہ مجاہدینِ اسلام کو دونوں جہان کی کامیابی اور کامرانی کا تمغہ حاصل ہوتا ہے۔ جنت کی بشارت ملتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خداوندِ قدوس جل و علا کی رضا نصیب ہوتی ہے۔ مولیٰ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ (پ ۱۰)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی، اور اپنے مال و جان سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اُن کا درجہ بہت بڑا ہے اور وہی (لوگ) مراد کو پہنچے۔

اُن کا رب اُن کو بشارت دیتا ہے اپنی رحمت اور رضا اور جنت کی۔ اُن کے لئے اس میں دائمی نعمت ہے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

ہمارے اسلاف میں جہاد کا جذبہ موجزن تھا اور بے دریغ جان و مال قربان کرتے

تھے، جس کی وجہ سے وہ باعزت زندگی گزارتے تھے۔ جب سے مسلمانوں نے جہاد کو چھوڑ دیا اور مفاد پرستی اور عیش پرستی میں ڈوب گئے، اس وقت سے مسلمان غلامانہ زندگی اور ذلت و رسوائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اب بھی رب تعالیٰ کی رحمت دُور نہیں، ذرا ہمت کریں اور مجاہدین اور جان و مال کی قربانی شروع کریں، بخدا دونوں جہان کی کامیابی و کامرانی اُن کے قدم چومے گی اور قومِ مسلم کا گیا ہوا وقار واپس آجائے گا۔

جہادِ اکبر

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا

رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَی الْجِهَادِ الْاَکْبَرِ۔

ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔"

یعنی جو کفار سے جہاد کیا جاتا ہے، وہ جہادِ اصغر ہے، کیونکہ وہ وقتی طور پر ہوتا ہے اور کبھی کبھی معرکہ اور میدان کارزار گرم ہوتا ہے اور اپنے نفس سے جہاد ہمہ وقت ہوتا ہے، اس لئے یہ جہادِ اکبر ہے۔ انسان کا نفس اس کا بدترین دشمن ہے جیسا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے اَعْدٰی عَدُوِّكَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ۔

"تیرا بدترین دشمن وہ ہے، جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے:

پھر اس کا مددگار اور معاون شیطان لعین ہے جو انسان کا عَدُوٌّ مُّبِیْن (کھلا دشمن) ہے۔ یہ دونوں انسان کو ہر وقت بُرائی اور گمراہی پر ابھارتے ہیں اور اعمالِ صالحہ سے روکتے ہیں۔ صبح و شام، دن، رات، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، ہر گھڑی، ہر لمحہ وہ دشمنی کرتے ہیں، اور بندۂ مسلمان کی اس کے ساتھ لڑائی اور جنگ جاری رہتی ہے، اسی لئے آپ نے اس جہاد کو جہادِ اکبر سے تعبیر فرمایا اور صوفیائے کرام کی اصطلاح میں اس کو مجاہدہ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا — جنہوں نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا تو
لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (الآیۃ) — ہم ضرور اُس کی راہنمائی فرمائیں گے۔

جہادِ اصغر میں لڑتا لڑتا جو قتل ہو جائے، اس کو شہید کہا جاتا ہے اور اُس کی زندگی نص قرآنی سے ثابت ہے۔ مولیٰ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اُن کو مردہ مت کہو۔" اور ایک جگہ ارشاد فرمایا: "اُن کو مُردہ مت خیال کرو۔" اور نفس سے تا دمِ آخر مجاہدہ کرتا رہے اور نفس کے مکر و فریب سے مقابلہ کرتا رہے اور ہمہ وقت اپنے مولیٰ تعالیٰ کی رضا جوئی میں لگا رہے اور تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرے، وہ کیوں نہ شہید ہوگا اور یقیناً یقیناً اس کو بھی حیاتِ جاودانی حاصل ہوگی۔ مولیٰ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ — جس مرد و عورت نے عملِ صالح کئے
اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ — اس حال میں کہ وہ مؤمن ہے تو ہم اس کو
حَیٰوۃً طَیِّبَۃً۔ (پ ۱۴) — حیاتِ طیبہ عطا فرمائیں گے۔

اِسی لئے ایک روایت میں ہے کہ اولیاء مرتے نہیں ہیں، بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔

؎ کون کہتا ہے کہ مومن مر گئے — قید سے چھوٹے وہ اپنے گھر گئے

مولیٰ تعالیٰ دونوں جہادوں کی توفیق عطا فرمائے۔

کبیرہ گناہ

حدیث ۱۵۱: عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْکَبَائِرِ قَالَ اَلْاِشْرَاکُ بِاللہِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَشَہَادَۃُ الزُّوْرِ۔

(بخاری جلد اوّل صـ ۳۶۲، مسلم جلد اوّل صـ ۶۴)

حَلِّ لُغات کبائر: بڑے گناہ۔ عقوق: نافرمانی۔
شہادۃ الزور: جھوٹی گواہی۔

ترجمہ: حضرت سیدنا انس[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کبیرہ گناہوں کے بارے میں۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی، کسی کو ناحق قتل کرنا۔ جھوٹی گواہی دینا۔

تشریح اِس حدیث کو بخاری نے باب الادب میں بھی ذکر کیا ہے اور ترمذی نے کتاب البیوع اور نسائی نے کتاب القضا میں بیان کیا ہے۔

کبائر کی تعداد اور تعریف میں علماء کا اختلاف ہے۔ عمدۃ القاری جلد ۲۳ صـ۲۱۶ میں ہے: کبیرہ وہ بُرا فعل ہے جس سے شرع میں منع کیا گیا ہو اور اس کا معاملہ عظیم ہو جیسا کہ ناحق قتل کرنا، زنا کرنا، جہاد سے بھاگنا وغیرہ اور لکھتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ کبیرہ گناہ وہ ہے جس کا تعلق ربا لعنت یا غضب یا عذاب کے ساتھ ملایا گیا ہو جیسا کہ جھوٹ پر لعنت فرمائی گئی ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ ہر گناہ اپنے فوق کے اعتبار سے صغیرہ ہے اور اپنے ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہے۔
شارح مسلم مولانا علامہ غلام رسول سعیدی نے جلد اوّل صـ۱۸۸ میں ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے فرمایا: کبیرہ گناہ وہ ہے، جس پر خدا تعالیٰ نے دُنیا میں حد یا تعزیر کی سزا مقرر کی ہو اور آخرت میں عذاب۔ حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ نے فرمایا: جس گناہ کو انسان بغیر کسی شرم و حیاء کے بے حجاب اور جرأت اور بے خوفی سے کرے وہ کبیرہ ہے۔
اعلیٰ حضرت امامِ اہل سنّت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں، گناہِ کبیرہ سات سو ہیں، ان کی تفصیل بہت ہے، اللہ تعالیٰ کی معصیت جس قدر ہے سب کبیرہ ہے۔ اگر صغیرہ و کبیرہ

---

[1] آپ کے حالات حدیث ۲ کے حاشیہ میں درج ہیں۔

کو علیحدہ علیحدہ شمار کر لیا جائے، تو لوگ صغائر کو ہلکا سمجھیں گے اور یہ کبیرہ سے بھی بدتر ہے۔ جس گناہ کو ہلکا جان کر کرے گا، وہ ہی کبیرہ ہے۔ امتیاز کے لئے اس قدر کافی ہے کہ فرض کا ترک کبیرہ ہے اور واجب کا ترک صغیرہ۔" (الملفوظ جلد اوّل صفحہ ۹۴)

معلوم ہوا کہ ترک فرض اور ارتکاب حرام گناہ کبیرہ اور ترکِ واجب اور مکروہِ تحریمی کا ارتکاب گناہِ صغیرہ ہے۔

کبائر میں بھی مراتب ہیں، مثلاً جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے، لیکن مسجد میں باوضو ہو کر قبلہ رُو ہو کر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر جھوٹ بولنا، بہت بڑا کبیرہ گناہ ہے۔ اسی طرح کسی کا ظلماً مال کھانا کبیرہ ہے، لیکن یتیم کا مال کھانا بڑا کبیرہ گناہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس حدیث میں چار کا ذکر تخصیص کے ساتھ اسی لئے ہے کہ یہ بہت بڑے کبائر ہیں، ویسے تعداد میں اختلاف ہے۔ اس جگہ چار کا ذکر ہے، بعض میں سات کا ذکر ہے اور بعض میں نو کا ذکر ہے۔ ابو طالب مکی نے کہا، کبیرہ گناہ سترہ ہیں۔ کسی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا: کبیرہ سات ہیں، آپ نے فرمایا: سات سو بیس۔

چند کبیرہ گناہ

اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا، ناحق قتل۔ جادو، سُود کھانا، رشوت لینا، یتیم کا مال کھانا۔ جہاد سے بھاگ جانا۔ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا، ماں باپ کی نافرمانی، حرام کو حلال کرنا، جھوٹی قسم، جھوٹی گواہی، شراب پینا، چوری کرنا، زنا، لواطت وغیرہ۔

گناہ کبیرہ پر توبہ کرنا لازم ہے اور توبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے گناہ پر ندامت، آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ اور اس گناہ سے جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کرنا مثلاً: اگر نماز رہ گئی ہو تو اس کی قضا، اور کسی کا چھینا ہوا مال، واپس کرنا، کسی کو گالی دی ہو تو اسے معاف کروانا۔

گناہِ کبیرہ کی مغفرت

کبیرہ گناہ کی معافی کی تین صورتیں ہیں ، توبہ، شفاعت ، محض فضلِ خدا۔ جس گناہگار مسلمان کو (العیاذ باللہ) کوئی صورت حاصل نہ ہوئی، تو وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر بالآخر جنت میں جائے گا۔ یہ سزا دنیا میں کسی بیماری یا مصیبت کی صورت میں، اور برزخ میں عذابِ قبر کی صورت اور آخرت میں عذابِ نار کی صورت میں ہر طرح ہوسکتی ہے۔ گناہِ صغیرہ پر اصرار بھی کبیرہ ہوجاتا ہے۔

شیخِ محقق عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "اشعۃ اللمعات" جلد دوم ص۲۴۷ پر فرماتے ہیں: " (ترجمہ) اصرار اور تکرار میں فرق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صغیرہ گناہ کرنے کے بعد نادم ہو اور توبہ کرے اور بعد میں شامتِ نفس سے وہ گناہ کرے اور پھر نادم ہو تو یہ تکرار ہے اصرار نہیں اور اگر کوئی شخص گناہ صغیرہ کرکے اس پر نادم نہ ہو اور منع کرنے کے باوجود بلا جھجک دوبارہ گناہ کرے تو یہ اصرار ہے۔

عینی شرح بخاری میں ہے: لا کبیرۃ مع الاستغفار ولا صغیرۃ مع الاصرار۔ "جب توبہ کرلی جائے، تو گناہ کبیرہ بھی مٹ جاتا ہے اور صغیرہ پر اصرار کبیرہ بنا دیتا ہے۔"

اب حدیث مذکور میں چار گناہوں کے بارے میں کچھ ذکر کیا جاتا ہے:

اَلاشراک باللہ

شرک کا لغوی معنیٰ ہے حصّہ یا ساجھا، اِسی لیے شریک کے معنی ہیں حِصّہ دار اور ساجھی کے۔

مولیٰ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں ارشاد فرماتا ہے:

اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ کیا اِن بُتوں کا اِن آسمانوں اور زمین میں حِصّہ ہے؟

"شرک کا اِصطلاحی معنیٰ ہے کسی کو خدا تعالیٰ کے برابر جاننا، یعنی اُس کی

ذات و صفات میں کسی کو برابر اور مساوی جاننا اور ماننا، یہ شرک جلی سب سے بڑا کفر ہے۔ کفر شرک سے عام ہے، یعنی ہر شرک کفر ہے اور ہر کفر شرک نہیں ہے جیسے دہریہ، جو خدا تعالیٰ کے منکر ہیں — وہ کافر تو ہیں مشرک نہیں ہیں، لیکن بعض دفعہ شرک سے مراد کفر ہوتا ہے، یعنی خاص بول کر عام مراد لیا جاتا ہے۔

مولیٰ تعالیٰ جل شانہٗ ارشاد فرماتا ہے،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ	بے شک اللہ تعالیٰ اس جرم کو نہیں
یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا	بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے
دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔	اس کے سوا جس کو چاہے بخش دے

اس آیتِ کریمہ میں شرک سے مُراد کفر ہے، کیونکہ کسی بھی کافر کی بخشش نہ ہوگی، اور نہ ہی کوئی کافر قابلِ بخشش ہے۔

شرک کی حقیقت شرک کی حقیقت ربِ کریم جلّ وعلا سے مساوات برابری پر مبنی ہے، یعنی جب تک کسی کو ربِ تعالیٰ کے برابر نہ جانا جائے، تب تک شرک نہ ہوگا، اسی لئے قیامت میں کفار اپنے بُتوں سے کہیں گے۔ قرآنِ کریم میں ان کے قول کا اس طرح ذکر ہے:

تَاللّٰہِ اِنْ کُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ	خُدا تعالیٰ کی قسم ہم کھُلی گمراہی میں تھے
مُّبِیْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّیْکُمْ	کہ تم کو ربّ العالمین جلّ جلالہٗ کے
بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝	برابر ٹھہراتے تھے۔

اس برابر جاننے کی چند صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کسی کو خدا تعالیٰ کا ہم جنس مانا جائے جیسے عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اور یہودی عزیر علیہ السلام کو خُدا تعالیٰ کا بیٹا مانتے تھے اور مشرکینِ عرب فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں مانتے تھے، چونکہ اولاد باپ کی مِلک نہیں ہوتی، بلکہ باپ کی ہم جنس اور مساوی ہوتی ہے، لہٰذا یہ

ماننے والا مشرک ہوگا۔ دوسرے یہ کہ کسی کو خدا وند قدوس جل و علا کی طرح خالق مانا جائے جیسا کہ بعض کفارِ عرب کا فیصلہ اور یہ عقیدہ تھا کہ خیر کا خالق اللہ ہے اور شر کا خالق دُوسرا رب ہے۔ اب بھی پارسی یہی مانتے ہیں۔ خالقِ خیر کو یزداں اور خالقِ شر کو اہرمن کہتے ہیں۔ یا بعض کفار کہتے ہیں کہ ہم اپنے بُرے اعمال کے خود خالق ہیں۔ ان کے نزدیک۔ بُری چیزوں کو پیدا کرنا بُرا ہے، لہٰذا اس کا خالق کوئی اور چاہیئے۔ متعدد آیات میں ایسے مشرکوں کی تردید کی گئی ہے۔

تیسری صورت یہ کہ خود مؤثر زمانہ کو مانا جائے اور خُدا تعالیٰ کی ہستی کا انکار کیا جائے جیسا کہ بعض مشرکین عرب کا عقیدہ تھا۔ موجودہ دہریہ انہی کا بقایا ہیں۔ چوتھی صورت یہ عقیدہ کہ خالق ہر چیز کا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر وہ ایک بار پیدا کر کے (معاذ اللہ تعالیٰ) تھک گیا ہے، اب معطّل و بیکار ہے۔ اب اُس خدائی کو چلانے والے یہ ہمارے معبودینِ باطلہ ہیں۔ اس قسم کے مشرکین عجیب بکواس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ چھ دن میں زمین و آسمان پیدا ہوتے اور ساتواں دن اللہ تعالیٰ نے آرام کا رکھا تھکن دُور کرنے کو، اب بھی وہ آرام ہی کر رہا ہے، چنانچہ فرقہ تعطیلیہ اسی قسم کے مشرکوں کی یادگار ہے۔ ان کی تردید میں اللہ ربّ العزّت ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ۔

اور بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے چھ دن میں بنائے اور ہم کو تھکن نہ آئی۔ (القرآن)

اِس قسم کے مشرکین کی تردید اس آیت کے علاوہ متعدد آیات میں کی گئی ہے جن میں فرمایا گیا کہ ہم کو عالم کے بنانے میں کسی قسم کی کوئی تھکاوٹ نہیں پہنچی۔ اس قسم کے مشرک قیامت کے منکر اس لئے بھی تھے کہ وہ سمجھتے تھے ایک دفعہ دُنیا پیدا فرما کر حق تعالیٰ

کافی تھک چکا ہے، اَب دوبارہ کیسے بنا سکتا ہے؟ (معاذ اللہ) اِسی لئے فرمایا گیا کہ ہم تو صرف "کُن" سے ہر چیز پیدا کرتے ہیں، پھر تھکن کیسی؟ ہم دوبارہ پیدا کرنے پر بدرجہ اَدلیٰ قادر ہیں۔

شرک کی پانچویں قسم

یہ عقیدہ کہ ہر ذرہ کا خالق و مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر وہ اتنے بڑے جہان کو اکیلا سنبھالنے پر قادر نہیں، اس لئے اُس نے مجبوراً اپنے اپنے بندوں میں سے بعض بندے عالم کے انتظام کے لئے چُن لئے ہیں، جیسے دُنیاوی بادشاہ اور اُن کے محکمے، اب بھی یہ بندے جنہیں عالم کے انتظام میں دخیل بنایا گیا ہے، وہ بندے ہونے کے باوجود رب تعالیٰ پر دھونس رکھتے ہیں، اگر ہماری شفاعت کریں تو رب تعالیٰ کو ماننا پڑے اور اگر وہ چاہیں تو ہماری بگڑی بنائیں، ہماری مشکل کشائی کریں، جو وہ کہیں رب تعالیٰ کو اُن کی ماننی پڑے، ورنہ اس کے عالم کا نظام بگڑ جائے۔

یہ وہ شرک ہے جس میں عرب کے بہت سے مشرکین گرفتار تھے اور اپنے بُت وُد۔ یغوث۔ لات۔ مَنات۔ عزّیٰ وغیرہ کو رب کا بندہ مان کر اور سارے عالم کا رب تعالیٰ اور خالق مان کر بھی مشرک تھے۔ اس عقیدے سے کسی کو پکارنا شرک، اس کی شفاعت ماننا شرک، اسے حاجت روا اور مشکل کشا ماننا شرک، اس کے سامنے جھکنا، اس کی تعظیم کرنا شرک۔ غرضیکہ یہ برابری کا عقیدہ رکھ کر اس کے ساتھ جو تعظیم و توقیر کا معاملہ کیا جائے، وہ شرک ہے۔

یہ پانچویں قسم کے مشرک اللہ تعالیٰ کو سب کا خالق و مالک، زندہ کرنے والا، مارنے والا، پناہ دینے والا اور مدبر عالم مانتے تھے، مگر پھر بھی مشرک تھے یعنی ذات و صفات کا اقرار کرنے کے باوجود وہ مشرک رہے، کیوں؟ کہ وہ ان عقائد کے باوجود دو سبب سے مشرک تھے۔ ایک یہ کہ وہ صرف خدا تعالیٰ کو عالم کا مالک نہیں مانتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کو بھی اور دوسرے

اپنے معبودوں کو بھی اسی لئے وہ یہ نہ کہتے تھے کہ ملکیت و قبضہ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے بلکہ وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا بھی ہے اور دوسروں کا بھی۔ دوسرا سبب یہ کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اکیلا یہ کام نہیں کرتا، بلکہ ہمارے بتوں کی مدد سے کرتا ہے، خود مجبور ہے، ان وجوہ سے وہ مشرک ہوئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین عرب کا شرک ایک ہی طرح کا نہ تھا، بلکہ اس کی پانچ صورتیں ہیں: (۱) خالق کا انکار اور زمانہ کو مؤثر ماننا (۲) چند مستقل خالق ماننا (۳) اللہ تعالیٰ کو ایک مان کر اس کی اولاد ماننا (۴) اللہ تعالیٰ کو ایک مان کر اسے تھکن کی وجہ سے معطل ماننا (۵) اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک مان کر اسے دوسرے کا محتاج ماننا اور انہیں ملکیت اور خدائی میں دخیل ماننا۔ ان پانچ کے سوا اور چھٹی قسم کا شرک ثابت نہیں۔

سوال: مشرکین عرب بھی اپنے بتوں کو خدا تعالیٰ کے ہاں سفارشی اور خدا رسی کا وسیلہ مانتے تھے اور مسلمان بھی نبیوں، ولیوں کو شفیع اور وسیلہ مانتے ہیں، تو وہ کیوں مشرک ہوگئے اور یہ کیوں مومن رہے؟ (ما الفرق بینہما)

جواب: دو طرح کا فرق ہے کہ مشرکین خدا کے دشمنوں یعنی بتوں وغیرہ کو سفارشی اور وسیلہ سمجھتے تھے جو کہ واقع میں ایسے نہ تھے اور مومنین اللہ تعالیٰ کے محبوبوں کو شفیع اور وسیلہ سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ کافر ہوئے اور یہ مومن رہے، جیسے گنگا کے پانی اور بُت کے پتھر کی تعظیم، ہولی، دیوالی، بنارس، کاشی کی تعظیم شرک ہے۔ مگر آبِ زمزم، مقامِ ابراہیم، رمضان، محرم، مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ کی تعظیم ایمان ہے، حالانکہ زمزم اور گنگا جل دونوں پانی ہیں۔ مقامِ ابراہیم اور سنگِ اسود بُت کا پتھر دونوں پتھر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ اپنے معبودوں کو خدا تعالیٰ کے مدِ مقابل دھونس کا شفیع مانتے تھے، اور جبری وسیلہ مانتے تھے۔ مومن انبیاء اور اولیاء کرام کو محض بندۂ خدا، محض اعزازی طور پر خدا تعالیٰ کے اذن و عطا سے شفیع یا وسیلہ مانتے ہیں۔ اذن اور مقابلہ ایمان و کفر کا معیار ہے۔

سوال: مشرکین عرب کا شرک صرف اس وجہ سے تھا کہ وہ مخلوق کو فریادرس، حاجت روا، مشکل کشا، سفارشی، دُور سے سُننے والا مانتے تھے، وہ اپنے بتوں کو خالق، مالک، رازق نہ مانتے تھے اور موجودہ مسلمان بھی نبیوں، ولیوں کے لئے مذکورہ چیزیں ثابت کرتے ہیں، وہ بھی انہیں کی طرح مشرک ہیں، اگرچہ بندۂ خدا سمجھ کر کریں، کیونکہ یہ کام مافوق الاسباب مخلوق کے لئے ثابت کرتے تھے، مشرک ہوئے۔

جواب: یہ محض غلط اور قرآن پر افترا ہے، جب تک رب تعالیٰ کے ساتھ بندے کو برابر نہ مانا جائے شرک نہیں ہوسکتا، وہ بُتوں کو رب تعالیٰ کے مقابل ان صفتوں سے موصوف کرتے تھے۔ مومن رب تعالیٰ کے اذن سے انہیں محض اللہ تعالیٰ کا بندہ جان کر مانتا ہے، لہٰذا وہ مومن ہے، ان بندگانِ خدا کے لئے یہ صفات قرآن کریم سے ثابت ہیں۔

قرآنی آیات ملاحظہ ہوں: "عیسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا کہ میں باذنِ الٰہی مردوں کو زندہ، اندھوں، کوڑھیوں کو اچھا کرسکتا ہوں، میں باذنِ الٰہی مٹّی کی شکل میں پھونک مار کر پرندہ بنا سکتا ہوں، جو کچھ تم گھر میں کھاؤ یا بچاؤ بتا سکتا ہوں۔"

"حضرت یوسف علیہ السّلام نے فرمایا: میری قمیص، میرے والد کی آنکھوں پر لگا دو، انہیں آرام ہوگا۔" "حضرت جبریل نے سیّدہ مریم (علیہا السّلام) سے کہا "میں تمہیں بیٹا دوں گا"" ان تمام مافوق الاسباب میں مشکل کشائی، حاجت روائی، علمِ غیب، سب کچھ آگیا۔

"حضرت آصف آنکھ جھپکنے سے پہلے تختِ بلقیس یمن سے شام لے آئے۔"

"حضرت سلیمان علیہ السّلام نے تین میل کے فاصلے سے چیونٹی کی آواز سُن لی۔"

"حضرت یعقوب علیہ السّلام نے کنعان میں بیٹھے ہوئے یوسف علیہ السّلام کی خوشبو سونگھ لی"۔ "حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے رُوحوں کو پکارا۔ تمام نے اور قیامت تک آنے والی رُوحوں نے سُن لیا۔"

یہ تمام کام مافوق الاسباب ہیں اور کیا یہ شرک ہوں گے؟ ہرگز نہیں! فرق وہی ہے کہ باذن اللہ یہ چیزیں بندوں کو ثابت ہیں اور رب کے مقابل ماننا شرک ہے

ھٰذَا خلاصۃ مَا ذُکِرَ فِیْ عِلْمِ القرآن وَالتفصیل فیہ -

آجکل بدمذہبوں کی عادت ہے جو آیات بتوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں وہ انبیاء و اولیاء پر چسپاں کرتے ہیں اور جو مشرکین کے متعلق نازل ہوئی ہیں وہ مومنین کے متعلق پڑھتے ہیں اور بات بات پر کفر و شرک کے فتوے لگاتے ہیں۔ یا رسول اللہ کہنے پر یا شیخ عبدالقادر کہنے پر، انبیاء و اولیاء سے استمداد و استعانت اور استغاثہ کرنے پر فوراً کفر کی مشین حرکت میں آجاتی ہے۔ ہاں اگر یہی باتیں اُن کے اکابر سے سرزد ہوں تو وہ نہ کفر نہ شرک نہ بدعت نہ حرام صرف وہ فتاوٰی اہل سنّت کے لئے ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولوی قاسم نانوتوی، مولوی محمود الحسن وغیرہ نے استمداد و استغاثہ بھی کیا ہے، اور دُور سے پکارا بھی ہے اور یا حرفِ ندا کو استعمال بھی کیا ہے ان پر یہ فتاوٰی اُن کو یاد نہیں آتے، جنہیں کعبہ جا کر بھی گنگوہ ہی کی تلاش ہے دیکھئے مرثیہ گنگوہی۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائے۔ آمین!

عقوق الوالدین

عقوق مصدر ہے باب عَقَّ یَعُقُّ کا، اس کا لغوی معنیٰ ہے قطع (کاٹنا) اسی سے ہے عق عن ولدہ جبکہ بچے کے سر کے بال کاٹے یا بچہ کی جانب سے عقیقہ کرے۔ عقیقہ اُس جانور کو کہا جاتا ہے جو بچہ کی جانب سے بطورِ شکرانہ ذبح کیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے عق والدہٗ یعنی اُس نے طاعت کے عصا کو توڑ ڈالا۔" شیخ ابو عمرو بن صلاح نے اپنے فتاوٰی میں فرمایا: عقوق محرم ہر وہ فعل ہے جس سے والدین کو تکلیف پہنچے، بشرطیکہ وہ واجبات سے نہ ہو کیونکہ حکم یہ ہے کہ معصیت میں کسی کی طاعت نہ کی جائے گی۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ امورِ مشتبہ میں والدین کی اطاعت کی جائے گی۔ یہ

اکثر علماء کا قول ہے۔ شیخ تقی الدین سبکی علیہ الرحمہ نے کہا: عقوق کا ضابطہ ہے والدین کو تکلیف دینا، جس طریقہ اور جس طرح سے بھی ہو کم ہو یا زیادہ انہوں نے روکا ہو یا نہ روکا ہو جس کے کرنے کا انہوں نے حکم دیا ہو یا جس سے انہوں نے منع فرمایا ہو اُس کی مخالفت کرنا، اسی بناء پر علماء کرام فرماتے ہیں کہ اگر جہاد فرض کفایہ ہو تو والدین کی اجازت کے بغیر شریک نہ ہو، اس میں اس کے عضو کٹ جانے کی وجہ سے ہو سکتا ہے انہیں کو تکلیف ہو۔ اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ ایک شخص نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا۔

تیری والدہ حیات ہے تو اس کی خدمت کر، تیرا یہی جہاد ہے، بلکہ کوئی بھی خطرناک سفر ان کی اجازت کے بغیر نہ کرے۔ تاہم طلب علم کے لئے سفر کرنا بغیر اجازت بھی جائز ہے، کیونکہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض اور لازم ہے، والدین کو چاہیے بخوشی اجازت دیں، والدین کی نافرمانی مولیٰ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے اور انسان کی تباہی اور بربادی ہے۔ خداوند قدوس فرماتا ہے: والدین کو اُف نہ کہو، اور نہ ہی ان کو جھڑکو، بلکہ ان کے ساتھ نرمی کرو اور اُن کے لئے دُعا کرو (آیت کا مفہوم ہے) مقام غور ہے کہ بچہ جب شکم مادر میں ہوتا ہے، تو والدہ اُس کی حفاظت کے لئے ایسا کام نہیں کرتی جس سے اس کو تکلیف ہو، ایسا کھانا نہیں کھاتی جو اسے نقصان دہ ہو، پھر وقت ولادت تکالیفِ شاقہ برداشت کرتی ہے، پھر دو سال اپنے سینے سے لگائے دُودھ پلاتی ہے، اس کا پاخانہ اپنے ہاتھ سے صاف کرتی ہے، اسی طرح والد بھی اس کی آسائش کے لئے محنت و مزدوری کرتا ہے اور کما کر اس کو کھلاتا ہے، اب جبکہ والدین بوڑھے ہو جائیں اور اولاد کے تعاون کے محتاج ہو جائیں، تو کتنے دُکھ کی بات ہے کہ اولاد والدین کی خدمت نہ کرے اور اپنے لئے ان کو بوجھ سمجھے، اسی لئے سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: "جس نے اپنے ماں باپ دونوں کو یا ایک کو بڑھاپے میں پایا پھر اس نے جنت حاصل نہ کی (یعنی ان کی خدمت کرکے)

تو اُس کی ناک خاک آلود ہو۔ کیا سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ بددُعا معمولی ہے؟ ایک حدیث میں ہے "ماں باپ کے (نافرمان) کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی۔" (کشف الغمۃ)

زواجر کی روایت میں ہے، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جس نے بیوی کو ماں پر ترجیح دی، اُس پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور سب لوگوں کی لعنت ہو (العیاذ باللہ)

حکایت

سیدنا علقمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزع کے وقت تک اُن کی زبان سے کلمہ جاری نہ ہو رہا تھا۔ آپ نے پتہ کیا تو اُن کی والدہ حیات تھیں۔ آپ اُن کی بوڑھی والدہ کے پاس گئے اُن سے دریافت فرمایا کہ علقمہ کیسا تھا؟ اُس نے عرض کیا: نیک اور صالح تھا۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا: کیا تو بھی اس پر راضی تھی؟ اُس نے کہا، یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) میں تو اس پر ناراض ہوں۔ آپ نے سبب پوچھا، تو اُس نے بتایا کہ وہ میری بات نہ مانتا تھا، اپنی عورت کی بات مانتا تھا، اُس کو مجھ پر ترجیح دیتا۔ آپ نے فرمایا اُسے معاف کردے۔ اُس نے کہا مَیں اسے معاف نہیں کروں گی کیونکہ اُس نے مجھے بہت تنگ کیا ہے۔ پھر آپ نے صحابہ کرام کو فرمایا: لکڑیاں اکھٹی کرو۔ اُس کی بوڑھی والدہ نے پوچھا: یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) لکڑیاں کس لیے اکھٹی کرنی ہیں۔ آپ نے فرمایا "تیرے لڑکے کو اس میں جلاؤں گا۔" بوڑھی والدہ نے کہا: مجھ سے یہ برداشت نہ ہوگا۔ تو آپ نے فرمایا: آخرت کا عذاب تو اس سے بھی سخت ہوگا۔ اگر تو چاہتی ہے اللہ تبارک و تعالیٰ اس کی بخشش فرمادے اور آگ کے عذاب میں نہ جلائے تو اس کو معاف کردے۔ مجھے خدا تعالیٰ عزوجل کی قسم! اس کا روزہ، نماز اور نہ ہی اس کے صدقات و خیرات اس کے کام آئیں گے، جب تک تو اس پر ناراض ہے۔" اس کی والدہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم میں نے اس کو معاف کیا اور اب میں اس پر راضی ہوں۔ آپ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا: علقمہ کی خبر کرو۔ جب وہ گئے تو دیکھا کہ اُس کی زبان پر کلمہ جاری ہے اور آپ کلمہ پڑھتے ہوئے اس دُنیائے فانی سے کوچ فرما گئے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) زواجر ص ۵۵)

سبق: اس حکایت سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ والدین کو تکلیف دینے والا اور اُن کا نافرمان اور اُن کو ناراض کرنے والا ایسا بدنصیب ہے کہ اس کو کوئی نیک کام مفید نہیں ہوتا اور جب تک معاف نہ کریں تو مولیٰ تعالیٰ بھی اس کو معاف نہیں فرمائے گا۔ اسی لئے اس حدیث میں ماں باپ کی نافرمانی کو بہت بڑا گناہ قرار دیا گیا۔

قتلِ نفس قتلِ نفس سے مراد کسی کو ناحق قتل کرنا ہے۔ علامہ بدرالدین عینی شارح بخاری عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں: اس کی وعید کیلئے یہی فرمانِ الٰہی کافی ہے: (ترجمہ) "جس کسی نے مسلمان شخص کو جان بوجھ کر (ناحق) قتل کیا تو اُس کی جزا جہنم ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا یعنی بہت دیر تک رہے گا" اس کے متعلق حدیث ۱۲ کی تشریح میں قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے۔

جھوٹی گواہی زور کا معنیٰ ہے خلافِ واقع بات کرنا یعنی جھوٹ کو اس طرح بیان کرنا کہ سچ معلوم ہو، جھوٹ خود ہی بہت بڑا گناہ ہے اور جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، جس کا بیان علاماتِ نفاق والی حدیث میں گزر چکا ہے۔ لیکن جھوٹی گواہی تو بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ ایک تو جھوٹ ہونے کی وجہ سے اور دوسرا کسی کے حق تلفی کی وجہ سے کہ جھوٹی گواہی سے کسی کا حق ضائع ہوگا، یہ گناہ پر گناہ ہے اور حقوق العباد سے متعلق جو گناہ سرزد ہوتے ہیں، وہ بڑے اس وجہ سے بھی ہو جاتے ہیں کہ جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے، حق تعالیٰ کی بارگاہ سے معافی نہیں ملتی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ جھوٹی گواہی کو اشرک باللہ سے برابر کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ	پلید بُتوں سے بچو، اور
وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔	جھوٹی بات سے پرہیز کرو،

اس بات میں اختلاف ہے جھوٹے گواہ کی توبہ قبول ہوتی ہے یا نہیں۔ حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کا قول ہے: اس کی توبہ قبول ہو گی۔ عبدالملک سے روایت ہے وہ زندیق کی طرح ہے، اس کی توبہ قبول نہ ہو گی۔ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب اس کی توبہ ظاہر ہو جائے تو قبول کی جائے گی اور یہی امام شافعی اور ابوثور رحمہما اللہ تعالیٰ کا ہے۔ مشاہد زور کی سزا کے متعلق بھی علماء کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ حضرت قاضی شریح علیہ الرحمہ سے مروی ہے اس کو اس کی قوم یا بازار میں بھیجا جائے گا اور اعلان کیا جائے گا کہ ہم نے اس کو جھوٹا گواہ پایا ہے، اس کے سر سے پگڑی اتاری جائے، اس کو ذلیل و رسوا کیا جائے اور کچھ مارا بھی جائے۔ امام شعبی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اس کو چالیس کوڑوں سے کم کی سزا دی جائے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا بھی قول ہے کہ اس کو تعزیراً کوڑے لگائے جائیں، لیکن چالیس سے کم اور اس کی خوب تشہیر کی جائے۔ حضرت امام اوزاعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اگر دو آدمیوں نے طلاق پر گواہی دی اور قاضی نے زوجین میں تفریق کر دی، بعد میں انہوں نے جھوٹی گواہی کا اقرار کر لیا تو ان کو سو سو کوڑے مارے جائیں اور خاوند کے لئے مہر کا تاوان ادا کریں۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک جھوٹے گواہ کو اس کے محلہ یا بازار میں بھیجا جائے گا، اور اعلان کیا جائے گا، یہ گواہ جھوٹا ہے اس سے بچو، اور مارا نہیں جائے گا اور نہ ہی قید کیا جائے گا۔ صاحبین کے نزدیک مارا بھی جائے گا اور قید بھی کیا جائے گا، اگر اس نے توبہ نہ کی۔ توبہ کرنے پر چھوڑ دیا جائے گا۔

(کذا فی العینی عمدۃ القاری جلد ۱۳ صفحہ ۲۱۷)

غور کریں جھوٹی گواہی کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اکبر کبائر فرمایا، اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: جھوٹی گواہی اشراک باللہ کے برابر

ہے، اور بعض علماء کے اقوال کے مطابق اس کی توبہ قبول نہ کی جائے گی۔ اکثر علماء نے فرمایا: "اس کی تشہیر کی جائے اور اس کو رُسوا کیا جائے۔"

ہمارے معاشرہ اور کچہریوں میں پہلے تو مقدمات ہی جھوٹ پر مبنی ہوتے ہیں۔ وکیل حضرات اپنی فیس لے کر جھوٹا مقدمہ درج کرواتے ہیں اور جھوٹا بیان دلواتے ہیں۔ پھر اس پر جھوٹے گواہ در گواہ پیش ہوتے ہیں۔ پھر فیصلے بھی رشوت لے کر کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے جھوٹے مقدمات میں حق والے کو حق کس طرح مل سکتا ہے۔ بہ مشہور محاورہ کے مطابق: جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس والا معاملہ ہے جس نے زیادہ پیسے خرچ کئے، اُس کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔ انصاف نام کو نہیں: لیکن یہ دُنیا میں ہوگا، آخرت میں سب کچھ سامنے آ جائے گا، منتقمِ حقیقی کے پاس حاضر ہونا پڑے گا، اور وہ غالب انتقام لینے والا ہے۔ ہر مظلوم کو انصاف ملے گا۔ اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور پچھتائے گا، لیکن اُس وقت کا پچھتانا کام نہ آئے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝

"جس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور کہے گا: ہائے کاش! میں فلاں کو دوست نہ بناتا۔" یہ مقامِ عبرت ہے۔

مولیٰ کریم معاشرہ کی ناانصافیوں، کمزوروں پر ظلم و زیادتیوں، رشوت اور جھوٹی گواہیوں سے دُوسروں کی حق تلفیوں سے بچائے۔ آمین!



کوئی بھی اپنے والدین کو گالی گلوچ نہ کرے

حدیث ۱۶۷، عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَکْبَرِ الْکَبَائِرِ اَنْ یَّلْعَنَ الرَّجُلُ وَالِدَیْہِ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ یَلْعَنُ الرَّجُلُ وَالِدَیْہِ قَالَ یَسُبُّ الرَّجُلُ اَبَا الرَّجُلِ فَیَسُبُّ اَبَاہُ وَیَسُبُّ اُمَّہٗ فَیَسُبُّ اُمَّہٗ۔ (بخاری جلد دوم ص۸۸۳، مسلم جلد اوّل ص۶۴)

حلِّ لغات

یَلْعَنُ، لعنت کرے۔ یَسُبُّ، گالی دے۔
اَبَاہُ، اس کے باپ کو۔ اُمَّہٗ، اس کی ماں کو۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، بہت بڑا گناہ یہ ہے کہ بندہ اپنے والدین پر لعنت کرے۔ آپ کی بارگاہ میں عرض کیا گیا، یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) بندہ کس طرح اپنے والدین پر لعنت کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا، آدمی کسی کے باپ کو گالی دے گا، تو وہ (جواباً) اس کے باپ کو گالی دے گا اور آدمی کسی کی ماں کو گالی دے گا، تو وہ (جواباً) اس کی ماں کو گالی دے گا۔"

تشریح اس حدیث کو ترمذی نے بھی بیان کیا ہے۔ اس کے الفاظ اس طرح ہیں: من الکبائر ان یشتم الرجل والدیہ۔ "یعنی کبیرہ گناہ میں سے ہے والدین کو گالی دینا۔" ترمذی کی روایت بتاتی ہے کہ یہ کبیرہ گناہ ہے اور مسلم میں بھی اسی طرح ہے، لیکن بخاری کی روایت کا تقاضا ہے کہ یہ اکبر کبائر سے ہے، ان کے درمیان تفاوت ہے۔ بعض کبائر دوسرے کبائر سے بڑے ہوتے ہیں۔ مطلقاً کبائر کی تعداد میں اختلاف ہے۔ سات سے لے کر سات سو کا بھی قول ہے۔ عمدۃ القاری شرح بخاری جلد ۲۲ ص۸۳ میں مختلف روایات کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل گناہوں کو اکبر کبائر سے شمار کیا گیا ہے۔

(۱) اشتراک باللہ (۲) والدین کی نافرمانی (۳) جھوٹی گواہی (۴) زائد پانی کو روک لینا (۵) فحل یعنی نر جانور کو مادہ سے روکنا (۶) جھوٹی قسم (۷) مومن کو ناحق قتل کرنا (۸) جہاد میں میدانِ کارزار سے بھاگنا (۹) پاک دامن عورت پر تہمت لگانا (۱۰) جادو سیکھنا (۱۱) سُود کھانا (۱۲) یتیم کا مال کھانا (۱۳) شراب پینا، جو سب بے حیائیوں کی اصل ہے یعنی ام الفواحش ہے (۱۴) سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اکبر کبائر سے ہے میری جانب اس حدیث کو منسوب کرنا، جو میں نے نہیں فرمائی، یعنی حدیث کو اپنے پاس سے گھڑنا۔

ماں باپ کو گالی دینا

اِس حدیث میں والدین کو گالی دینا بہت بڑا گناہ فرمایا گیا جب آپ نے یہ ارشاد فرمایا؛ وہ صحابہ کرام کا پاکیزہ دور تھا، انہیں تعجب لاحق ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بندہ اپنے والدین کو گالی دے، ایسا احسان فراموش اور ناشکری کرنے والا کون ہو سکتا ہے، تو انہوں نے اس کو بعید جانتے ہوئے سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کر دیا کہ یا رسول اللہ (علیک الصلوٰۃ والسلام) بندہ اپنے والدین کو کس طرح سب وشتم اور لعنت کر سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جب کوئی شخص کسی کے باپ یا کسی کی ماں کو گالی دے گا، تو وہ جواباً اس کے باپ اور اس کی ماں کو گالی دے گا، تو گویا بندے نے اپنے ماں باپ کو گالی دی۔ یہ اس کے ماں، باپ کو گالی نہ دیتا اور وہ جواباً اس کے والدین کو گالی نہ دیتا؛ معلوم ہوا کہ جس طرح فعل واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے۔ (مُقَدَّمَۃُ الْوَاجِبِ وَاجِبٌ) اسی طرح فعل حرام کا سبب بھی حرام ہوتا ہے۔ کسی کے والدین کو گالی دینا، یہ سبب بنا اپنے والدین کو گالی پہنچانے کا، لہٰذا کسی کے والدین کو گالی دینا بھی حرام اور گناہ ہوا اور یہ ایسے ہے جیسے کہ اپنے والدین کو گالی دینا۔ اسی طرح تصویر کھینچنے والے پر لعنت فرمائی گئی اور جو کوئی تصویر بنواتا ہے، وہ بھی ملعون ہوا، کیونکہ وہ تصویر کھینچنے کا سبب ہوا۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی شاگرد کے سامنے اس کے استاد کو اور کسی مُرید کے سامنے

اس کے شیخ کو بُرا بھلا نہ کہا جائے کہ وہ جواباً اس کے اُستاد اور شیخ کو بُرا بھلا کہے گا۔
جس طرح روافض کی عادت ہے کہ وہ صحابہ کرام پر سب و شتم کرتے ہیں تو خوارج اہل بیت پر اعتراضات کی تنقید کرتے ہیں۔ خُدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم اہل سُنّت، دونوں کی عقیدت کا دَم بھرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

اہل سُنّت کا ہے بیڑا پار اصحاب حضورؐ!
نجم[1] ہیں اور ناؤ[2] ہے عترت رسُول اللہ کی

اِس شعر میں آپ نے ان دو احادیث کی طرف اشارہ فرمایا، جن میں صحابہ کرام کو ستاروں سے تشبیہ دی گئی اور اہلِ بیت عظام کو کشتیٔ نوح سے تشبیہ دی گئی ہے۔
جب کسی کے والدین کو گالی دے کر اپنے والدین کو گالی نکلوانا بہت بڑا گناہ ہوا، تو گریبان میں منہ ڈال کر سوچیے، جو بچہ خود اپنے ماں باپ کو گالی دے گا، وہ کتنا بڑا گھناونا جرم ہوگا، شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی علیہ الرحمہ اپنے زمانے کا رونا رو رہے ہیں، اور ارشاد فرماتے ہیں،

وَفِی هٰذا الزمان من الناس الطغام من یسب والدیه بل یضربهما۔	اس زمانہ میں ایسے کمینے لوگ بھی ہیں، جو اپنے والدین کو گالی گلوچ کرتے ہیں، بلکہ زدوکوب کرتے ہیں، یعنی مارتے ہیں۔

بلکہ لکھتے ہیں، بعض دفعہ اپنے والد کو قتل کر دیتا ہے۔

حکایت حضرت عوام بن اشہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں عرب کے ایک قبیلہ پر وارد ہوا، وہاں پر ایک قبرستان تھا نمازِ عصر کے بعد ایک قبر پھٹ جاتی ہے اور اس سے ایک مرد نکلتا، جس کا سر گدھے کی طرح ہوتا اور باقی جسم انسان کی طرح، تین بار گدھے کی طرح ہینگتا اور پھر اُس کی قبر

---
[1] ستارے [2] کشتی

مل جاتی اور وہ قبر میں چھپ جاتا، وہاں ایک عورت سوت کات رہی تھی، اُس نے مجھے کہا کہ اس بڑھیا کو دیکھتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں! اُس نے کہا یہ بڑھیا اس کی ماں ہے جو ہینگتا ہے۔ میں نے اس آدمی کا حال دریافت کیا، اس عورت نے جواب دیا کہ یہ شخص شرابی تھا، جب وہ شراب پیتا، تو اس کی ماں اسے کہتی اے میرے بچے (تو) اللہ تبارک و تعالیٰ سے ڈر، کب تک تو شراب پیتا رہے گا؟ تو یہ شخص اپنی ماں کو کہتا تھا کہ کیا گدھے کی طرح ہینگتی رہتی ہے۔ جب یہ مر گیا، تو عصر کے بعد دفن ہوا تو ہر عصر کے بعد اس کی قبر شق ہوتی ہے اور یہ تین دفعہ ہینگتا ہے اور پھر قبر مل جاتی ہے (العیاذ باللہ)
(کشف الغمہ صـ۲۱۲، زواجر، جلد دوم۔ صـ۵۸)

مسلمانوں پر ہتھیار اُٹھانے کا حکم

حدیث ۱۷: عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ حَمَلَ عَلَیْنَا السِّلَاحَ فَلَیْسَ مِنَّا۔ (بخاری جلد دوم صـ۱۰۴۷، مسلم جلد اوّل صـ۶۹)

حلِ لغات: حَمَلَ: اُٹھایا۔ اَلسِّلَاحَ: ہتھیار۔

ترجمہ: "حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں نہیں ہے۔"

تشریح اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے حضرت سیدنا ابن عمر اور سیدنا حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک ہی باب میں تخریج کیا ہے[1] اور مسلم شریف کے الفاظ ہیں:

مَنْ سَلَّ عَلَیْنَا السَّیْفَ "یعنی جس نے ہمارے خلاف تلوار اٹھائی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

---

[1] ان کے حالات، حدیث ۵ کے حاشیہ میں ملاحظہ کئے جائیں۔ ۱۲ منہ

علامہ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۲ میں فرماتے ہیں :

مَعنَی الحَدِیثِ حَمل السِّلَاحِ علی المسلمین لقتال بغیر حق لما فی ذالک من تخویفھم و ادخال الرّعب علیھم۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ قتال کرنے کے لئے ناحق ان پر ہتھیار اُٹھانا، کیونکہ اس میں ان کو ڈرانا اور ان پر رُعب داخل کرنا ہے۔

کرمانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں لیس منا کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری سُنّت کا متبع نہیں اور ہمارے طریقہ پر چلنے والا نہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے دین سے خارج ہے، کیونکہ مسلمان کا مسلمان پر حق یہ ہے کہ اس کی مدد کرے اور اُس کی جان بچانے کے لئے دوسروں سے جنگ کرے، یہ نہیں کہ خود ہی مسلمان پر ناحق ہتھیار اور تلوار اُٹھا کر اُس کو مرعوب کرے۔ آج کل دہشت گرد اور تخریب کار دہشت پھیلانے اور ڈرانے کے لئے ویسے ہی فائر کرتے رہتے ہیں تاکہ اُن کا رعب طاری ہو جائے اور مسلمان مرعوب ہو جائیں۔ وہ بھی اس حدیث میں داخل ہیں۔ اور سرکار اَبد قرار علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے اس حکم میں کہ آپ فرماتے ہیں مسلمانوں پر ناحق ہتھیار اٹھانے والا ہمارا نہیں ہے، کتنی بڑی شدید تنبیہ ہے۔ جب سرکار علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمادیا کہ وہ ہمارا نہیں ہے تو اب اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا؟ اور اس کا سہارا کون ہوگا؟ اسی باب میں امام بخاری نے یہ روایت بھی درج کی ہے، جس کا مفہوم ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی طرف اشارہ نہ کرے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ سے ہتھیار نکلوا دے اور اس وجہ سے وہ دوزخ کے گڑھے میں گر جائے۔

ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں "اس میں وہ بھی داخل ہے، جو ارادے سے ہتھیار مسلمان کی جانب کرے یا ہنسی مزاح سے اس کی جانب ہتھیار تلوار کرے۔" جب ہنسی سے ہتھیار مسلمان کی طرف کرنے والا اس وعید میں داخل ہے تو جان بوجھ کر

مُسلمانوں پر ہتھیار اٹھائے گا، اُس کا کیا حال ہو گا۔؟

ترمذی شریف کی روایت میں ہے مسلمانوں کی جانب سے ہتھیار سے اشارہ کرنے والے پر فرشتے لعنت بھیجتے ہیں بلکہ یہاں تک حکم ہے کہ کھلی ہوئی تلوار بغیر نیام کے نہ پکڑائی جائے، کہیں غفلت سے اُس کو لگ نہ جائے۔ اسی میں ہے کہ چاقو چھری بھی نہیں پکڑانی چاہیے، کہیں تکلیف نہ پہنچ جائے۔ کیسے کیسے سُنہری آداب آپ نے مسلمانوں کو سکھائے ہیں اور کتنا آپ کو اپنی امت کا خیال ہے۔

اس جگہ عمدۃ القاری میں باغیوں کے خلاف تلوار اٹھانے کے متعلق کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ باغی خود متبع سنت نہیں ہیں، ان کا اہل حق کے خلاف تلوار اٹھانا اس حکم میں داخل ہو گا نہ کہ امامِ برحق کا ان کو راہِ راست پر لگانے کے لئے اور ان کی اصلاح کے لئے ان سے جنگ کرنا، کیونکہ اس کا تو خود قرآن پاک میں حکم وارد ہے:

فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْءَ اِلٰی اَمْرِ اللّٰہِ۔ — اُس طائفہ سے لڑو، جو باغی ہو یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف واپس آجائے۔

لہٰذا باغیوں اور اسی طرح ڈاکوؤں سے قتال اس حدیث کے حکم میں داخل نہیں ہے اسی لئے شارحین نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ناحق مسلمانوں پر تلوار اٹھانا۔

مولیٰ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔ آمین!

میّت پر نوحہ اور ماتم کی ممانعت

حدیث ۱۸: عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُیُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَی الْجَاھِلِیَّۃِ۔

(بخاری شریف جلد اول ص۱۷۳ مسلم شریف جلد اوّل ص۷۰)

حلِّ لغات: الخُدُود: رُخسارے۔ الجُیُوب، گریبان۔
دَعوَی الجَاھلیۃ، جاہلیت کی پکار۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو اپنے رخساروں کو مارے اور گریبان پھاڑے جاہلیت کے زمانے کی طرح چیخ و پکار کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

تشریح اس حدیث کو امام بخاری نے چند جگہ مختلف عنوانات سے ذکر فرمایا ہے ایک جگہ ضرب کی جگہ لَطَمَ ہے جس کے معنی ہیں طمانچہ مارنے کے الخدود جمع ہے خَدٌّ کی، جس کا معنی رخسارہ ہے اور مُراد منہ ہے اور الجیوب جمع ہے جَیْبٌ کی، جس کا معنیٰ ہے گریبان اور واوَ اَوْ کے معنی میں ہے۔
مطلب یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مصیبت اور کسی کی فوتیدگی کے وقت جو منہ پر طمانچے مارے چہرے کو پیٹے یا گریبان پھاڑے، یا جاہلیت کے دور کی طرح نوحہ اور چیخ و پکار کرے، وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے۔ جس طرح پچھلی حدیث میں بتایا جا چکا ہے کہ لَیْسَ مِنَّا کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری سیرت اور ہمارے طریقہ پر نہیں ہے۔ اس حدیث میں بھی یہی مُراد ہے کہ جو مصیبت کے وقت ان تینوں کاموں میں سے کوئی کام کرے گا، وہ ہمارے طریقہ اور ہماری سُنّت پر عمل کرنے والا نہیں ہے۔ اس طرح کرمانی اور ابن بطال نے فرمایا ہے کذا فی العینی کیونکہ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ قرآن کے مطابق ہے۔ قرآنِ کریم فرماتا ہے: (ترجمہ) جب ان کو مصیبت پہنچے تو کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْن ایسے صابرین کے لئے بشارت ہے۔ اب جو کوئی مصیبت کے وقت جزع فزع اور بے صبری کا اظہار کرے اور نوحہ خوانی اور ماتم کرے، وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

لے ان کے حالات، حدیث ۱۳۷ کے حاشیہ نمبر ۱ پر درج ہیں۔ ۱۲ منہ

کی سُنّتِ مُبارکہ کا تارک اور فَلَیۡسَ مِنَّا کی وعید میں داخل ہے۔ اب سوچنے والی بات ہے کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے رفقائے کربلا میں صبر فرما کر سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سُنّت پر عمل فرمایا یا معاذ اللہ ماتم کر کے تارکِ سُنّت ہوئے۔ ہرگز ایسا نہیں ہوا۔ حضراتِ اہلِ بیت سے کس طرح یہ متصور ہو سکتا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے حکم کی خلاف ورزی کریں۔ آپ نے تو صبر اور شجاعت و بہادری کی اعلیٰ مثال قائم فرمائی۔ اب جو روافض میں ماتم کا رواج زور پکڑ گیا ہے اور اس کو عبادت اور نیک کام سمجھتے ہیں اور اہلِ بیت کی محبت کا دم بھرتے ہیں، یہ محبت نہیں، بلکہ اُن کی سیرت و طریقہ کی خلاف ورزی ہے۔ ویسے بھی بیوی کے علاوہ میت پر تین دن سے زائد سوگ کرنا شرعاً ناجائز ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ ماتم کرنا، مرثیے پڑھنا، بال نوچنا اور گریبان پھاڑنا، ناجائز و حرام ہے۔ ہمارے معاشرہ میں بھی اب یہ بیماری عام ہو گئی ہے کہ فوتیدگی کے وقت چیخ و پکار اور نوحہ کرتی ہیں اور بال کھول کر میت کی چارپائی کے پیچھے چلتی اور پیٹتی ہیں، بے صبری اور جزع فزع کرتی ہیں اور اس پر اگر میت راضی ہو یا وصیت کی ہو، تو اس کی وجہ سے میت کو عذاب ہوتا ہے جیسا کہ سیدنا عمر اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت میں ہے جس کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس حدیث سے متقدم چند احادیث سے قبل بیان فرمایا: اِنَّ الۡمَیِّتَ لَیُعَذَّبُ بِبُکَاءِ اَھۡلِہٖ عَلَیۡہِ۔

"کہ بے شک میت کو اُس کے اہل کے اس پر رونے کی وجہ سے، عذاب دیا جاتا ہے۔"

رونے سے مراد نوحہ کرنا اور چیخنا، ورنہ آنسوؤں سے رونے کی اجازت ہے، اور خود حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اہل کے رونے کی وجہ سے میت کو عذاب کی توجیہ محدثینِ کرام نے فرمائی ہے کہ جب میت نے وصیت کی ہو یا اس کو اپنے اہل کی عادت معلوم ہو اور اس نے منع نہ کیا ہو کیونکہ یہ وصیت کے حکم میں ہے اور وصیت اس کا ایسا فعل ہوگا، اگر اس نے وصیت نہ کی اور نہ ہی وہ اس پر راضی ہو تو پھر اہل و عیال کے نوحہ

کرنے کی وجہ سے میت کو عذاب نہ ہوگا، کیونکہ قرآن پاک میں ہے

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ۔ کوئی گناہوں کا بوجھ اُٹھانے والی جان، کسی کے گناہوں کا بوجھ نہیں اُٹھائے گی،

اب اس نوحہ کرنے اور ماتم کرنے کا وبال، نوحہ کناں اور ماتم کرنے والوں پر ہوگا۔ ان کے گناہوں کی وجہ سے میت کو عذاب نہ ہوگا۔ اس توجیہ پر آیت اور حدیث میں تطبیق ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ بھی حدیث کی توجیہات کی گئی ہیں، لیکن عمدۃ القاری میں اس توجیہ کو اصح فرمایا گیا ہے، اس لئے راقم نے صرف اسی توجیہ پر اکتفا کیا ہے۔

مَنْ شَاءَ التَّفْصِيْلَ فَلْيَرْجِعْ إِلَيْهِ ۔

چغلخوری کا حکم

حدیث ۱۹ عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ ۔ (بخاری شریف جلد دوم ص۸۹۵، مسلم شریف جلد اول ص۷۱)

حلّ لغات: لَا يَدْخُلُ: نہ داخل ہوگا۔ قَتَّات: چغل خور۔

ترجمہ: "سیدنا حضرت[1] حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں: میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا کہ جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔"

تشریح حضرت سیدنا حذیفہ بن یمان صاحب السر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے تذکرہ ہوا کہ فلاں شخص حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

---

[1] حضرت سیدنا حذیفہ بن الیمان، ان سے عبیدہ، عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب، قیس بن حازم، ابو وائل، زید بن وہب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) وغیرہم نے روایت کی ہے، اُحد میں حاضر ہوئے اور یہیں ان کے والد مقتول ہوئے۔ یہ منافقین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صاحب السر ہیں (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

پاس بات پہنچا دیتا ہے۔ اس وقت حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے حضور سید دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ چغلخور جنت میں نہ جائے گا آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد بطورِ تہدید و تغلیظ ہے یا اس کا مطلب ہے اس کا دخول کامیاب لوگوں والا نہ ہوگا، کیونکہ تمام وعیدات کا نفاذ مولیٰ تعالیٰ کی مشیت پر ہے یعنی اگر ربِ کریم نے اس کو سزا دینا چاہی، تو وہ جنت میں اوّلاً نہ جائے گا، اس لئے کہ ربِ کریم کا ارشاد ہے کہ شرک کے علاوہ جس کو چاہے گا، بخش دے گا، ہاں اگر کوئی چغلخوری کو بغیر کسی تاویل کے حرام کا علم ہوتے ہوئے بھی حلال جانے تو حدیث اپنے ظاہر معنی پر ہوگی اور وہ کافر ہونے کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا۔

بعض روایات میں لفظ نمّام ہے اور اس روایت میں لفظ قتّات ہے بعض محدثین نے اس کے معنی میں اس طرح فرق کیا ہے کہ نمام وہ ہے کہ واقعہ میں لوگوں کے سامنے حاضر ہوا اور پھر ان کی بات برائے فساد کسی تک پہنچا دے اور قتات وہ ہے جو چھپ کر بات سُنے اور دُوسرے شخص تک پہنچائے۔ بہرحال دونوں طریقے سے بات پہنچانا اور فتنہ اُٹھانا ممنوع اور ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ "فتنہ قتل سے بھی زیادہ بُرا ہے۔"

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) جس کے جنازے میں یہ حاضر نہ ہوتے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس کا جنازہ نہ پڑھتے۔ نہاوند میں حاضر ہوئے۔ جب نعمان بن مقرن سالارِ لشکر شہید ہو گئے تو علم انہوں نے لے لیا۔ ہمدان، رے اور دینوران کے ہاتھ پر فتح ہوئے۔ لیلۃ الاحزاب میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کفار کی خبر لانے کے لئے بھیجا تھا۔ مشرکین سے عہد کر لینے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اجازت سے بدر میں شرکت نہیں کی۔ آپ کی وفات، شہادتِ سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے چالیس راتوں کے بعد ۳۶ھ میں ہوئی۔ (اسد الغابہ ج ۱ صفحہ ۳۹۰)

چغلی کی تعریف بعض کے نزدیک غیبت اور چغلی ایک ہی ہیں اور بعض کے نزدیک فرق ہے۔ یعنی چغلی یہ ہے کہ کسی کی بات اُس کی مرضی کے بغیر فتنہ و فساد کے ارادے سے دوسرے تک پہنچانا اُس کو علم ہو یا نہ ہو۔ اور غیبت یہ ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی وہ بات یا اس کے فعل پر دوسرے کو مطلع کرنا جس کا اظہار اس کو پسند نہ ہو ارادہ فساد ہو یا نہ ہو۔ اس فرق کی بنا پر عدم موجودگی میں بارادہ فساد بات نقل کرنا چغلی ہوگی اور غیبت ہوگی اور منقول عنہ کے علم میں ہوتے ہوئے بارادہ فساد بات نقل کرنا چغلی ہوگی غیبت نہ ہوگی ـــ اور عدم موجودگی میں بغیر اس کے علم کے اور بغیر ارادہ فساد کے بات نقل کرنا غیبت ہے چغلی نہ ہوگی۔ اس کو منطق کی اصطلاح میں عموم خصوص من وجہ کہتے ہیں ـــ غیبت کرنے والے پر بھی قرآن پاک میں سخت وعید آئی ہے اور اس کی مثال اس طرح بیان فرمائی ہے جیسے اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھاتا۔

چغلی کا حکم چغلی بہت بُری عادت اور گھناؤنا فعل ہے اور گناہِ کبیرہ ہے، کیونکہ یہ مسلمانوں میں خلاف و شقاق اور جنگ و جدال کا سبب ہے۔

اس کو ایک حدیث میں عذاب قبر کا سبب بتایا گیا اور قرآن پاک میں ہے:

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ۔ خرابی ہے چغل خور کے لئے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بدترین شخص وہ ہے جو کہ چغل خوری کرتا ہے۔ دکیمیائے سعادت صفحہ ۳۹۲، شارح مسلم مولانا علامہ غلام رسول سعیدی صاحب، شرح مسلم ج ۱ صفحہ ۲۰۵، بحوالہ احیاء العلوم (للامام غزالی علیہ الرحمہ) جلد سوم صفحہ ۱۵۲ بیان فرماتے ہیں:

جس شخص کے پاس چغلخور آکر چغلی کرے، اُس پر چھ چیزیں واجب ہیں:

(۱) چغلخور کی بات کی تصدیق نہ کرے، کیونکہ وہ فاسق ہے۔

(۲) چغل خور کو چغلی کرنے سے روکے اور اس فعل کی برائی اس پر واضح ہے۔
(۳) چغل خور کو نہایت برا جانے۔
(۴) جس شخص کی چغلی کی گئی ہے، اس کے بارے میں بلا دلیل بدگمانی نہ کرے۔
(۵) جو قول و فعل اس کو بتایا گیا ہے اس کی پوری پوری تحقیق کرے۔
(۶) چغل خور کی چغلی کو آگے نہ پھیلائے۔ (امام غزالی علیہ الرحمہ کا بیان ختم ہوا)

یہ تمام احکام اس وقت ہیں جب کسی بات یا کام کو بدنیتی سے اور دوسرے شخص کو نقصان پہنچانے کے ارادہ پر کئے جائیں، لیکن اگر بات پہنچانے میں کوئی شرعی مصلحت ہو تو وہ بعض احوال میں مستحب اور بعض صورتوں میں واجب و فرض ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو علم یقینی ہو کہ فلاں شخص کسی کا سودا بگاڑنا چاہتا ہے، تو صاحب معاملہ کو باخبر کرنا مستحب ہے اور اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ فلاں شخص کسی کو قتل یا اس کی عصمت دری کرنے کا ارادہ اور پروگرام رکھتا ہے تو اسکے متعلق شخص کو خطرہ سے آگاہ کرنا فرض ہے۔ حکومت نے جو جاسوس مقرر کئے ہوتے ہیں، وہ چغلخور کے ضمن میں نہیں آتے۔ کیونکہ چغلخوری وہ حرام ہے، جس سے کسی شخص کا شخصی نقصان ہو اور جاسوسی میں حکومت کو جو خبریں مہیا کی جاتی ہیں، وہ قوم کے اجتماعی مفاد میں ہوتی ہیں جو حالات کے اعتبار سے فرض، واجب، مستحب اور مباح ہوتی ہیں۔ (شرح مسلم جلد اول صفحہ ۲۰۵-۲۰۶م)

حکایت

ایک دفعہ بنی اسرائیل میں قحط پڑا اور لوگ تنگ آ گئے۔ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم بنی اسرائیل کو نماز استسقاء پڑھائی تاکہ اللہ تبارک و تعالیٰ رحم فرما کر باران رحمت نازل فرمائے۔ مگر بارش نہ ہوئی۔ دوسرے روز پھر نماز استسقاء پڑھائی، لیکن بارش پھر بھی نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ چند روز نماز پڑھنے کے بعد دعا کے باوجود بھی بارش نہ ہوئی، تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام بڑے حیران ہوئے، تب اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی اے موسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تمہاری دعا

قبول نہ ہوگی، تم میں ایک چغلخور ہے۔ آپ نے عرض کیا کہ یا اللہ! وہ کون ہے تاکہ اُس کو باہر نکال دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "جب میں چغل خوری کو بُرا جانتا ہوں، تو تمہیں یہ بتا کر کہ کون چغل خور ہے، اس کا اظہار کیوں کروں؟"

سیدنا حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سب مجمع کو حکم دیا کہ سب کے سب، خالص دل سے چغل خوری سے توبہ کریں، تو سب نے چغل خوری سے توبہ کی۔ ادھر مجمع نے توبہ کی اور ادھر بارش برسنا شروع ہوگئی۔ (کیمیائے سعادت، ص ۳۱۲، نزہۃ المجالس ص ۱۲۱)

ماقبل حدیث اس حدیث کے ماقبل امام بخاری نے "باب النمیمہ من الکبائر" میں ایک روایت نقل فرمائی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کا گزر دو قبروں کے پاس سے ہوا۔ آپ نے جان لیا کہ ان دو قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے اور آپ نے فرمایا، ایک کو تو عذاب اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ وہ پیشاب کرتے وقت لوگوں سے چھپتا نہ تھا اور پردہ نہ کرتا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ پیشاب کے چھینٹوں سے نہ بچتا تھا اور دوسرے کو اس وجہ سے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کرتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ چغلی کبیرہ گناہ ہے، جس کی وجہ سے عذاب قبر ہو رہا ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم برزخ کے واقعات دیکھتے سُنتے اور جانتے تھے، کیونکہ عذاب قبر برزخ کے احوال سے ہے۔ پھر ایک ہری ٹہنی لی اور اُس کو چیر کر دو ٹکڑے کئے۔ پھر ہر قبر پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا اور ارشاد فرمایا: اُمید ہے جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہ ہوں گی۔ ان دونوں کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی۔ محدثین کرام فرماتے ہیں: اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب تک ٹہنی تر رہتی ہے، وہ تسبیح کرتی ہے، کیونکہ ہر زندہ چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے اور ٹہنی جب تک ہری رہتی ہے زندہ ہوتی ہے اور جب خشک ہو جائے تو مردہ ہو جاتی ہے اور اس کی تسبیح کی برکت سے

عذاب میں تخفیف ہو گی۔ محدث خطابی نے فرمایا کہ جب سبز ٹہنیوں کی تسبیح سے میت کے عذاب میں تخفیف ہوتی ہے، تو قبر کے پاس اگر کوئی مسلمان قرآن مجید کی تلاوت کرے، تو بدرجۂ اولیٰ اس سے میت کے عذاب میں تخفیف ہو گی، کیونکہ مسلمان کا تلاوتِ قرآن کرنا ٹہنیوں کی تسبیح سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے۔ (عینی شرح بخاری جلد ۳ صفحہ ۱۱۸)

حضرت شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شرح مشکوٰۃ میں ذکر کیا کہ "علماء کرام نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ قبر کے پاس قرآن کریم پڑھنا مستحب ہے۔" (تفہیم البخاری، جلد اوّل صفحہ ۴۸)

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قبروں پر تازہ پھول اور ہری پتیوں کو ڈالنا ہرگز ہرگز بدعت نہیں ہے، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی حدیث پر عمل ہے، لہٰذا یہ سنت ہے، چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت بریدہ اسلمی صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ "میری قبر میں دو گیلی ٹہنیاں ڈال دی جائیں۔" (بخاری شریف جلد اوّل باب الجرید علی القبر)

ایصالِ ثواب

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور امام احمد (رحمہما اللہ تعالیٰ) کا یہی مسلک ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت کا اجر و ثواب میت کو پہنچتا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں بکثرت احادیث بھی وارد ہیں، مثلاً ابوبکر نجار نے اپنی کتاب السنن میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ "جو کوئی قبرستان میں میں گزرے اور گیارہ مرتبہ قل ہو اللہ احد پڑھ کر ثواب مُردوں کو بخشے، تو اللہ تعالیٰ اس قبرستان کے مردوں کی تعداد کے مطابق ثواب عطا فرمائے گا۔"

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جو شخص قبرستان میں جائے، اور سورۂ یٰسین پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچائے، تو اللہ تعالیٰ اس میت کے عذاب میں تخفیف فرمائے گا۔

اسی طرح حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

جو شخص اپنے والدین کی قبر کی زیارت کرے اور وہاں سُورہ یٰسین پڑھے تو اللہ تعالیٰ اُن کی بخشش و مغفرت فرمائے گا۔ (عینی جلد سوم، ص۱۱۸)

اِس مسئلہ کی مزید تفصیل تفہیم البخاری جلد اوّل ص۴۸۱ اور فیوض البارى جلد اوّل ص۸۷۶ پر دیکھی جا سکتی ہے یا مولانا سعید احمد اسعد کا رسالہ "ایصالِ ثواب" کا مطالعہ کیا جائے۔

اعمال کی جزا و سزا

حدیث ۲۰: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُكُمْ اِسْلَامَهٗ فَكُلُّ حَسَنَةٍ یَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰی سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَكُلُّ سَیِّئَةٍ یَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِمِثْلِهَا۔

(بخاری شریف جلد اوّل ص۱۱، مسلم شریف جلد اوّل ص۱۱۹)

حلِ لُغات
اَحْسَنَ: اچھا کرے۔ تُكْتَبُ: لکھی جائے۔
ضِعْفٍ: دوگنا۔

ترجمہ: "حضرت سیدنا ابوہریرہ[ۛله] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنے اسلام کو اچھا کرے، تو ہر نیکی جو وہ کرے گا، اُس کے لئے دس مثلوں سے لے کر سات سو گنا تک لکھی جائے گی اور جو بدی کرے گا، وہ اس کے لئے اُس کی مثل ہی لکھی جائے گی۔

تشریح حُسنِ اسلام سے مُراد یہ ہے کہ اعتقاد و اخلاص سے مُسلمان ہو اور اسلام اس کے ظاہر و باطن میں داخل ہو۔ یہ خطاب اگرچہ اس وقت

له آپ کے حالات حدیث ۹ کے حاشیہ میں درج ہیں۔

کے حاضرین کو ہے، لیکن اس کا حکم عام قیامت تک آنے والے مردوں، عورتوں کو شامل ہے، اس خطاب میں غلام بھی شامل ہیں، یعنی جو کامل مسلمان ہو گا، اس کی ایک نیکی کو دس سے لے کر سات سو تک بڑھا دیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ "جس نے ایک نیکی کی اس کو دس گنا ثواب ملے گا۔"

اور دوسرے مقام میں ارشاد ہوا: (ترجمہ) "مثال ان لوگوں کی جو راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں، اس کی ہے جیسے ایک دانہ سات خوشے اُگائے، اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں" یعنی ایک دانے کے بدلے اس کو سات سو دانے حاصل ہوتے ہیں، ایسے ہی راہ خدا میں خرچ کرنے پر ایک کے بدلے سات سو خرچ کرنے کا ثواب ملے گا اور اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ ہو گیا تو اُس کا ایک ہی گناہ لکھا جائے گا۔ چاہے تو مولیٰ تعالیٰ اس پر سزا دے، چاہے تو اپنے فضل و کرم سے معاف فرما دے۔ تاہم گناہ کی کیفیت شخص اور وقت اور جگہ کے اعتبار سے بڑھ جاتی ہے۔

عام اشخاص کے گناہ سے خواص کی غلطی پر زیادہ گرفت ہوتی ہے۔ اسی طرح عام اوقات میں گناہ کرنے سے خاص اوقات مثلاً ماہِ رمضان میں گناہ بڑا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خاص جگہ مثلاً حرم مکہ۔ مسجدِ حرام۔ مسجدِ نبوی میں گناہ کا بوجھ بڑھ جاتا ہے لیکن وہ ہو گا ایک ہی جیسا کہ گناہوں کے درجات میں فرق ہوتا ہے۔ بعض گناہ بعض سے بڑے ہوتے ہیں۔ یہ جو بعض اعمالِ صالحہ کا اجر دس گنا اور بعض کا سات سو گنا اور بعض کا بلا حساب ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:۔

اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ "بیشک صابرین کو اجر بے حساب دیا جائے گا۔"

اِن مراتب میں تطبیق اس طرح دی جا سکتی ہے:۔ عباداتِ بدنیہ میں اجر دس گنا، اور مالیہ میں سات سو گنا اور ضبطِ نفس اور صبر (جیسا کہ روزہ) پر لا محدود اجر ملتا ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ اجر کے یہ مراتب نیکی کرنے والے کے صدق و خلوص نیت کے

مراتب کے اعتبار سے ہیں۔ جس شخص میں جتنا زیادہ خلوص ہوگا اُس کو اتنا ہی زیادہ اجر ملے گا۔
تیسری توجیہ یہ ہے کہ بعض لوگ عبادات اور صدقہ و خیرات حساب سے کرتے ہیں، یعنی جتنا اُن کے ذمہ ہو اُتنا ہی کرتے ہیں اور بعض لوگ بے حساب عبادات اور صدقہ و خیرات کرتے ہیں، تو جو لوگ حساب سے صدقہ و خیرات اور عبادت کرتے ہیں، اُن کو اجر بھی حساب سے ملتا ہے اور جو لوگ بلا حساب خیرات و صدقات اور عبادت کرتے ہیں، تو ان کو اجر بھی بے حساب عطا کیا جائے گا۔ چوتھی توجیہ یہ ہے کہ اجر کے یہ مراتب کرنے والے کی حیثیت کے اعتبار سے ہیں، مثلاً کوئی ارب پتی ہے، اُس سے کسی شخص نے ایک روٹی کا سوال کیا اور وہ اُس کو ایک روٹی عطا کر دے، تو یہ ایک نیکی ہے، اس کا اجر دس گنا ملے گا، لیکن جس کے پاس ہو ہی صرف ایک روٹی اور اس کو بھی وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دے، اور محتاج کو عطا کر دے، تو یہ شخص اس پہلے کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے کہ اُس نے اربوں روپوں کی دولت خیرات کر دی۔ اصل بات یہ ہے کہ اجر محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ملتا ہے جس کو جتنا چاہے عطا فرمائے وہ مالک الملک ہے اُس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں۔

ایک واقعہ ایک دفعہ سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چند سیر گیہوں بطور قرض لئے۔ سیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو پیسا اور ایک دن کا کھانا تیار کیا، ابھی ایک لقمہ بھی نہ اٹھایا تھا کہ دروازہ پر کسی نے دستک دی کہ اے اہل بیت نبوت! میں امت رسول کا ایک مسکین ہوں مجھ کو کھانے کے لئے کچھ دیا جائے وہ سارا کھانا اُس مسکین کو دے دیا اور خود بھوکے سو گئے۔ اسی طرح جب دوسرے دن کا کھانا تیار کیا گیا تو ایک یتیم آ گیا، وہ بھی اس یتیم کو دے دیا گیا اور تمام اہل خانہ بھوکے سو گئے۔ اسی طرح جب دوسرے دن کھانا تیار کیا گیا تو ایک اسیر (قیدی) کے آ جانے پر سارا کھانا اُس کو دے دیا اور خود بھوکے رہے تو قرآن میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ہ (پ۲۹) اور کھانے کی محبت ہوتے ہوئے وہ کھانا مسکین و یتیم اور اسیر کو کھلا دیتے ہیں۔

جو کچھ اپنے پاس ہے وہ بھی بذریعہ قرض اور باوجود یکہ خود بھی حاجت ہے، لیکن راہِ خدا میں خرچ کر دیا، ایسے لوگوں کو بلا حساب اجر ملتا ہے، انہی کی شان ہے :۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔

یعنی خود کو شدید ضرورت ہوتے ہوئے بھی وہ ایثار اور ہمدردی و غمخوارگی کرتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی غزوہ تبوک کے موقع پر جو کچھ بھی گھر میں تھا حتیٰ کہ جسم کے کپڑے اور سب کا سب مال آپ کے قدموں میں ڈال دیا اور خود بدن پہ ٹاٹ پہنا، تو یہ مراتب حیثیت کے اعتبار سے ہیں۔

سوال ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں اور حدیث شریف میں ایک گناہ کی سزا، ایک گناہ کے مطابق فرمائی گئی ہے، حالانکہ قرآنِ کریم میں ہے، ازواجِ مطہرات کے متعلق :۔

مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۔

یعنی تم میں سے جس نے بے حیائی کا کام کیا، تو اس کو دوہرا عذاب ہوگا۔"

تو آیات میں تطبیق کس طرح ہوگی؟ اس کا جواب کہ یہ حکم عام لوگوں کا ہے اور خواص اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا۔ (جس کا رتبہ ہے سوا اس کو سوا مشکل ہے)

ازواجِ مطہرات کا مرتبہ اس وجہ سے زیادہ ہے، ان کے لئے مؤاخذہ کی مقدار بھی زیادہ رکھی گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السّلام کی محض بھول پر محاسبہ ہوا اور حضرت یونس علیہ السلام کی صرف اجتہادی خطا پر ان کو مچھلی کے پیٹ میں مقید فرمایا گیا اور حدود و تعزیرات میں غلام کے مقابلہ میں آزاد کی سزا زیادہ مقرر فرمائی گئی۔

ماقبل حدیث: اس حدیث سے ماقبل مسلم نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرمائی ہے کہ رسولِ خدا حبیبِ کبریا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا کہ مولیٰ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: "جب میرا بندہ کسی نیکی کے لئے حدیثِ نفس کرتا ہے، تو جب تک وہ اُس نیکی کو کرتا نہیں ہے، میں اُس کی ایک نیکی لکھتا ہوں اور جب وہ نیکی کر لیتا ہے، تو میں اُس کی دس نیکیاں لکھ دیتا ہوں اور جب وہ کسی گناہ کے لئے حدیثِ نفس کرتا ہے، تو جب تک وہ اس پر عمل نہ کرے، میں بخش دیتا ہوں اور جب وہ گناہ کر لیتا ہے، تو میں اُس کا ایک گناہ لکھتا ہوں۔"

اِس روایت کے پیشِ نظر معلوم ہوا کہ نیکی کے لئے حدیثِ نفس پر بھی ثواب ملتا ہے اور بُرائی پر حدیثِ نفس پر گناہ اور مؤاخذہ نہیں ہوتا، جب تک وہ گناہ کرتا نہیں۔ انسان کے ذہن میں جو بات، خیالات، ترغیبات اور عزائم پیدا ہوتے ہیں، اُن کی شارحِ مسلم حضرت علامہ غلام رسول سعیدی نے بحوالہ تفسیرِ صاوی پانچ قسمیں لکھی ہیں:

۱۔ ہاجس: اچانک کسی چیز کا خیال آجائے۔

۲۔ خاطر: کِسی چیز کا بار بار خیال آئے۔

۳۔ حدیثِ نفس: جس چیز کا خیال آئے ذہن اُس کے حصول کیلئے پروگرام تیار کرنا شروع کر دے۔

۴۔ ہَم: غالب جہت اِس چیز کو حاصل کرنے کی ہو اور مغلوب خیال ہو کہ اس کو حاصل نہ کیا جائے۔

۵۔ عزم: مغلوب سا خیال بھی زائل ہو جائے اور اس چیز کے حصول کا پختہ ارادہ ہو۔

اگر کسی شخص کے ذہن میں گناہ کا خیال آئے تو ہاجس، خاطر، حدیثِ نفس اور ہم کے مرتبہ میں اس سے مؤاخذہ نہیں ہوتا، البتہ اگر گناہ کا عزم کرے تو وہ مستحقِ مؤاخذہ ہے، خواہ اس کے بعد گناہ کا فِعل نہ کرے، کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے عزم سے روکا ہے، ارشاد فرمایا:-

وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ۔ "اور عورت کی عدّت میں اس سے نکاح کرنے کا ارادہ نہ کرو۔"

نماز میں جو خیالات ہاجس، خاطر کی قسم سے ذہن میں آئیں، ان سے نماز میں کوئی کمی نہیں آتی، کیونکہ وہ اس کے بس اور اختیار سے باہر ہیں، البتہ حدیثِ نفس سے احتراز چاہیے اور یہ انسان کے بس اور اختیار میں ہے۔ (شرحِ مسلم، جلد اوّل ص۲۳۲)

طہارت کا بیان

حدیث ۲۱: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةَ اَحَدِكُمْ اِذَا اَحْدَثَ حَتّٰی یَتَوَضَّأَ۔ (بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۲۸، مسلم جلد اوّل صفحہ ۱۱۹)

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے بلا وضو اللہ تعالیٰ کسی کی نماز قبول نہیں فرماتا یہاں تک کہ وہ وضو کرلے۔"

تشریح اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر وضو کے نماز درست نہیں ہے، اور مطلقاً نماز فرمایا ہے، لہٰذا کوئی بھی نماز چاہے نمازِ جنازہ۔ اسی طرح سجدۂ تلاوت بغیر طہارت کے درست اور جائز نہیں۔ وضو کرے یا وضو کا قائم مقام (مجبوری کے وقت) تیمم کرے، کیونکہ تیمم بھی وضو ہی ہے۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تیمم کا نام بھی وضو ارشاد فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں:۔ اَلصَّعِیْدُ الطَّیِّبُ وُضُوْءُ الْمُسْلِمِ وَاِنْ لَّمْ یَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِیْنَ (رواہ النسائی) "یعنی پاک مٹی مسلمان کا وضو ہی ہے، چاہے دس سال تک پانی نہ ملے۔"

اِس حدیث میں جو قبول کی نفی ہے، وہ صحت کے معنی میں ہے یعنی طاعت کا مُجزِیَہ (کافی) ہونا اور مافی الذمہ کا مسقط ہونا۔ اور ایک قبول کا معنی ہوتا ہے ــــ مولیٰ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہونا، اور اس پر اجر و ثواب کا حصول ہونا۔ عبادت کو شرائط سے ادا کرنا قبول بمعنی صحت کے ہے اور اس پر امید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حقیقۃً مقبول ہوا ور مولیٰ تعالیٰ کی رضا اور اجر و ثواب حاصل ہو۔ بعض دفعہ شرعًا نماز صحیح تو ہوجاتی ہے، لیکن مقبول نہیں ہوتی، جیسے عبدِ آبق کا نماز پڑھنا یا شاربِ الخمر کا نماز پڑھنا،

جبکہ اس کے جسم میں شراب کا قطرہ موجود ہو۔ اسی طرح مغصوبہ دار (گھر) میں نماز پڑھنا فقہی معنی میں درست تو ہوگی، لیکن عنداللہ مقبول نہ ہوگی، لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت پا جانا، اس کی کیفیت کچھ اور ہے اور اس کا مقام بہت بلند ہے اسی لئے بعض سلف صالحین نے فرمایا: لَاَنْ تُقْبَلَ لِیْ صَلٰوۃٌ وَّاحِدَۃٌ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا۔ (عینی)

"میری ایک نماز کا قبول ہو جانا مجھے دنیا و ما فیہا سے زیادہ محبوب ہے۔"

نماز کے لئے طہارت (وضو یا تیمم) حاصل کرنا فرض ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ جب سے نماز فرض ہوئی، تو ساتھ ہی وضو بھی فرض ہوا۔ جو شخص بغیر طہارت کے نماز پڑھے گا، وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، البتہ اگر نماز کی توہین یا اس کو مشغلہ اور کھیل بنانے کی غرض سے ایسا کرے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ یہی سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب ہے۔

جس شخص کو نہ وضو کے لئے پانی میسر ہو اور نہ اُس کو تیمم کی سہولت حاصل ہو، ایسے شخص کو فقہ میں "فاقد الطہورین" کہتے ہیں۔ فاقد الطہورین کی نماز کا وقت اگر جا رہا ہو، تو اس کے بارے میں علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس کو نماز پڑھ لینی چاہیئے اور یہ نماز صرف صورۃً نماز ہوگی نہ کہ حقیقتہً، اصل نماز اس کو دوبارہ پڑھنی ہوگی، یہ صرف اظہارِ بندگی ہے یعنی بندہ مولیٰ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض گزار ہے کہ مولیٰ کریم! میں جس حد تک تیری عبادت کرسکتا تھا، میں نے وہ عبادت کرلی ہے، قبول فرمانا تیرا کام ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن جزیری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اس نماز کے بارے میں احناف کا مسلک یہ ہے کہ فاقد الطہورین قبلہ رُو کھڑا ہو کر صرف صورۃً نماز پڑھے یعنی قیام، رکوع، سجود تو کرے لیکن اس میں قرأت و تسبیح و تشہد کے الفاظ نہ پڑھے۔ اس نماز کے پڑھنے سے فرض نماز ساقط نہ ہوگی۔ (طہارت پر قدرت ہونے پر نماز کو دہرانا اس پر لازم ہوگا)

(شرح مسلم جلد اوّل صفحہ ۳۹۰ تا صفحہ ۳۹۱ والتفصیل فیہ)

فضائلِ وضو

وضو کرنے میں ظاہر و باطن کی طہارت حاصل ہوتی ہے ظاہر کی طہارت تو ظاہر ہے، باطن کی طہارت اس طرح کہ جب نیت اور اخلاص سے وضو کرے گا تو اُس کے گناہ جھڑ جائیں گے جیسا کہ سیدنا امامِ اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ سے مروی ہے کہ آپ کے سامنے سے اگر کوئی وضو کرتا ہے، تو آپ اپنے کشف سے اُس کے گناہ جھڑتے دیکھتے، بلکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعا کی کہ مولیٰ تعالیٰ مجھ پر مسلمانوں کے گناہوں کو ظاہر نہ فرما۔ حدیث شریف سے بھی ثابت ہے کہ وضو کرنے سے اعضائے وضو کے گناہ جھڑ جاتے ہیں (مسلم شریف)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کا بیان فرمایا جس سے گناہ[1] مٹتے ہیں اور درجات بلند ہوتے ہیں، اس میں ایک چیز بیان فرمائی: مشقتوں میں وضو پورا کرنا۔ (مسلم شریف)

یعنی اعضائے وضو کو کامل دھونا اور تین بار دھونا اور وضو کی سنتوں کا پورا کرنا، مشقت سے مراد سردی یا بیماری یا پانی کی گرانی کا زمانہ یعنی جب وضو مکمل کرنا بھاری ہو تب مکمل کرنا۔ (مرآۃ شرح مشکوٰۃ)

بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "بے شک میری اُمت قیامت کے دن پنج کلیان بلائی جائے گی۔"

پنج کلیان وہ سُرخ یا سیاہ گھوڑا ہوتا ہے، جس کے چاروں ہاتھ پاؤں اور پیشانی سفید ہوں۔ یہ بہت ہی قیمتی خوبصورت اور طاقتور ہوتا ہے۔ امت سے مراد سارے نمازی مسلمان ہیں کہ قیامت میں ان کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں آثارِ وضو سے چمکتے ہوں گے۔ خیال رہے اگرچہ پچھلی امتوں نے بھی وضو کیا مگر یہ نور صرف امتِ محمدی پر ہوگا۔ نیز

---

[1] مراد صغیرہ گناہ ہیں نہ کبیرہ نہ حقوق العباد، ۱۲ منہ

جو صحابہ نماز کی فرضیت سے پہلے وفات پا گئے، یا اب مسلمانوں کے چھوٹے بچے، یا اسلام قبول کرتے ہی فوت ہو جانے والے لوگ جنہیں نماز اور وضو کا وقت ہی نہیں ملا، ان پر بھی انشاء اللہ تعالیٰ یہ آثار وضو ہوں گے، کیونکہ وہ نمازیوں کے گروہ سے تو ہیں، ہاں بے نمازی، فساق، جنہوں نے بلا وجہ نماز نہ پڑھنے کی عادت ڈال لی۔ وہ سزاءً اس سے محروم رہیں گے۔

خیال رہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنی امت کو پہچاننا اس نور پر موقوف ہوگا، کیونکہ آپ نیکو کار نورانیوں اور گنہ گار ظلمانیوں کو بھی پہچانیں گے۔ (مراٰۃ شرح مشکوٰۃ)

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مسلک کے مطابق

فرائضِ وضو وضو میں چار فرض ہیں: (۱) پورا چہرہ دھونا (۲) کہنیوں سمیت ہاتھوں کو دھونا (۳) چوتھائی سر کا مسح کرنا (۴) ٹخنوں سمیت پاؤں دھونا۔

اور اس کا ثبوت قرآن پاک کی اس آیت سے ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (پ۶)

اے ایمان والو! جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو، تو اپنے منہ دھوؤ اور کہنیوں سمیت ہاتھ دھوؤ اور سر کا مسح کرو، اور ٹخنوں سمیت پاؤں دھوؤ۔

طریقہ وضو عبادت کی نیت کر کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اونچی جگہ قبلہ رُو بیٹھ کے وضو کرنا شروع کرے پھر تین بار ہتھیلیوں سمیت پہنچوں تک ہاتھ دھوئے۔ پھر تین بار پانی لے کر کلی کرے۔ کلی میں پانی منہ کے اندر حلق تک اوپر پہنچائے اور نیچے پہنچائے، پھر تین بار ناک میں پانی ڈالے اور ناک صاف کرے، پھر تین مرتبہ تمام چہرہ دھوئے اور داڑھی کا خلال کرے پھر تین مرتبہ

کلائیاں کہنیوں سمیت دھوئے اور انگلیوں میں خلال کرے۔ پھر سر کا مسح اس طرح کرے کہ بھلے گیلے ہاتھوں کو سر پر مسح کرتے ہوئے پیچھے لے جائے اور پچھلی جانب سے مسح کرتے ہوئے سر کی اگلی جانب لائے۔ پھر کانوں کے ظاہر و باطن کا مسح کرے، اس کے بعد گدی کا مسح کرے۔ پھر دونوں پیروں کو ٹخنوں سمیت تین مرتبہ دھوئے، اور انگلیوں کا خلال کرے، ہر عضو میں دائیں جانب سے ابتدا کرے۔ عضو کے بالائی حصے سے دھونے کی ابتدا کرے۔ ہر عضو کو دھوتے وقت دعائیں مانگے۔ وضو کے اخیر میں بھی دعا کرے اور وضو کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پی لے۔ (سعیدی) (تفصیل کیلئے بہارِ شریعت حصہ دوم دیکھیں)

اعضاءِ وضو کو چمکانے کے لئے حدِ مفروض سے زیادہ دھونا

حدیث ۲۲: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اُمَّتِیْ یُدْعَوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ غُرًّا مُّحَجَّلِیْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ یُّطِیْلَ غُرَّتَهٗ فَلْیَفْعَلْ۔

(بخاری جلد اوّل ص۲۵، مسلم جلد اوّل ص۱۲۶)

حلِّ لغات: یُدْعَوْنَ: بلائے جائیں گے۔ غُرًّا: سفید چہرے۔ مُحَجَّلِیْنَ: ہاتھ پاؤں چمکدار۔

ترجمہ: سیدنا ابوہریرہ[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ بے شک میری اُمت قیامت کے دن پنج کلیان[2] بلائی جائے گی آثارِ وضو کی وجہ سے، پس جو تم سے اپنی سفیدی کو بڑھانا چاہے، پس چاہیے کہ وہ (دو) وضوء کرے۔"

---

[1] آپ کے حالات حدیث ۹ کے حاشیہ میں دیکھیں ۱۲ منہ
[2] اس لفظ کی شرح حدیث ۳۱ کے تحت ص۔۔ پر درج ہے۔

تشریح اس حدیث میں وضوء کی فضیلت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ کل قیامت کو میری امت پنج کلیان بلائی جائے گی، یعنی وضو کرنے کی وجہ سے اُن کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں اور چہرہ چمک رہے ہوں گے اور یہ چمک آپ کی امت سے خاص ہوگی اور نمازیوں کی ایک علامت ہوگی۔ آپ نے فرمایا: جو اپنی چمک کو بڑھانا چاہے، وہ بڑھائے یعنی مقدارِ مفروض سے قدرے زیادہ دھوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ مقدارِ مفروض سے قدرے زائد دھونا مستحب ہے، مثلاً ہاتھوں کو کہنیوں سے قدرے اوپر تک دھوتے اور پاؤں کو ٹخنوں سے اوپر دھوئے اور چہرہ پیشانی سے قدرے اوپر دھوئے، تاہم بہت زیادہ اوپر سے نہ دھونا چاہیے کہ وضو کرتے وقت پانی میں اسراف کرنا مکروہ ہے۔ فضائلِ وضو۔ فرائضِ وضو۔ طریقۂ وضو اس کے قبل حدیث ۲۱ کی شرح میں لکھ دیا گیا ہے۔

عینی شرح بخاری جلد دوم ص۲۴۷ میں ہے کہ اُمّت کا لفظ واحد ہے اور معنیً جمع ہے اور لغت میں اس کا معنیٰ جماعت ہے، حیوان کی جماعت پر بھی امت کا اطلاق ہوتا ہے اور لغت میں طریقہ، دین اور وقت کے معنی پر بھی استعمال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فُلان لا اُمّة لهٗ ای لا دین لهٗ۔ قرآن پاک میں ہے: وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ ای بعد حین۔ اور فرشتہ اور رجل جامع للخیر پر بھی اطلاق ہوتا ہے انبیاء کرام کے اتباع کو بھی امت کہا جاتا ہے۔ حضور سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی دو اقسام ہیں: امتِ دعوت، جن کی طرف آپ مبعوث ہوتے اور امتِ اجابت، جس نے آپ کی تصدیق کی اور ایمان لائی۔ اس حدیث میں امتِ اجابت ہی مراد ہے، اور امتِ اجابت کو ہی قرآنِ پاک میں خیر امۃ فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ "تم بہترین اُمت ہو"۔ خیر الامم ہونے کا انعام آپ کی طرف منسوب ہونے کے صدقہ سے ہے۔ جس چیز کو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نسبت

ہوگئی، وہ خیر ہوگئی۔ آپ کے اصحاب کرام تمام انبیاء علیہم السلام کے اصحاب سے بہتر، آپ کی آلِ اطہار سب انبیاء کی آل سے بہتر، آپ کی ازواج سب عورتوں سے بہتر، آپ کا شہر مدینہ منورہ تمام شہروں سے بہتر، آپ کا روضۂ انور تمام مزارات سے بہتر۔ بلکہ وہ مٹی مبارک قبرِ انور کی جو آپ کے جسدِ اطہر سے ملی ہوئی ہے وہ کعبہ بلکہ عرشِ الٰہی سے بہتر ہے۔ الغرض آپ سے نسبت بڑی چیز ہے۔ جو آپ کا ہوگیا، وہ اللہ تعالیٰ کا ہوگیا اور جو آپ سے پھر گیا، وہ اللہ تعالیٰ سے پھر گیا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"

مسواک کا بیان

حدیث ۲۳: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ اَوْ عَلَی النَّاسِ لَاَمَرْتُھُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ صَلٰوةٍ۔

(بخاری جلد اوّل ص۱۲۲، مسلم جلد اوّل ص۱۲۸)

ترجمہ: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر مجھے اپنی امت پر (یا فرمایا لوگوں پر) دشوار محسوس نہ ہوتا تو میں ان کو ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔"

تشریح بخاری و مسلم کی اس روایت میں جو آیا کہ ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا، اس سے مراد ہر نماز کے وضو کے ساتھ مسواک کا حکم دینا ہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے۔ محمد بن علی شوکانی ظاہری لکھتے ہیں: محدث ابن حبان علیہ الرحمہ اپنی صحیح میں سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر مجھے اپنی امت پر دشوار معلوم نہ ہوتا تو میں

ہر نماز کے وقت وضو کے ساتھ مسواک کو لازم کر دیتا۔"

(نیل الاوطار، جلد اوّل صفحہ ۱۲۵، ماخوذ از شرح مسلم جلد اوّل صفحہ ۴۲۵)

نیز اس مضمون کی روایت بخاری شریف جلد اوّل صفحہ ۲۵۹ پر بھی ہے کہ اگر مجھے اپنی امت پر دشوار معلوم نہ ہوتا، تو میں ہر وضو کے وقت مسواک کا حکم دیتا۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ مسواک کرنا وضو کی سنت ہے، جبکہ امام شافعی علیہ الرحمہ کا مسلک یہ ہے کہ مسواک نماز کی سنت ہے۔ نیل الاوطار والی حدیث اور بخاری شریف کی مذکورہ حدیث حنفی مذہب کی تائید اور اوپر والی حدیث کی تفسیر کرتی ہے۔

مختار نبی اس حدیث سے جہاں سیدِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اُمت پر شفقت اور مہربانی معلوم ہوتی ہے۔ اس جگہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احکامِ شرعیہ آپ کی طرف سپرد کر دیئے ہیں۔ جس چیز کو چاہیں فرض نہ کریں، جس چیز کو چاہیں حلال فرما دیں اور جس چیز کو چاہیں حرام فرما دیں، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسواک کو فرض نہ کرنے کی وجہ صرف یہ بیان فرمائی کہ یہ عمل میری اُمت پر دشوار ہوگا۔ معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے احکامِ شرعیہ کے اجراء کا مالک و مختار بنایا ہے، اس کی تائید و تصدیق میں وہ حدیث پاک بھی ہے کہ جب آپ نے حج کرنے کا حکم فرمایا تو حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کیا ہر سال حج فرض ہے۔ انہوں نے تین بار سوال کیا تو آپ نے فرمایا نہیں، اور فرمایا: لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ۔" اگر میں ہاں فرما دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ اس سے بھی آپ کا مختار ہونا ثابت ہے۔ اسی اختیار کے پیشِ نظر آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو کے قائم مقام قرار دیا۔ اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حیاتِ مقدسہ

بیوی دوسری شادی کرنے سے منع فرمایا۔ ان روایات سے آپ کا مالک و مختار اور متصرف عام ہونا ثابت ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک اعرابی، آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ میں نے رمضان شریف کا روزہ عمداً کھول لیا ہے۔ آپ نے اس کو کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا غلام آزاد کر۔ اُس نے عرض کیا: مجھے غلام آزاد کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ فرمایا: دو ماہ کے لگاتار روزے رکھ۔ عرض کیا: اس کی بھی طاقت نہیں ہے۔ فرمایا: ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلا۔ عرض کیا: اس کی بھی طاقت نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: اچھا ٹھہر۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک صحابی کھجوروں کا ٹوکرا لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: سائل کہاں ہے؟ عرض کیا: حاضر ہوں۔ فرمایا: یہ ٹوکرا کھجور کا لے جا اور مساکین میں تقسیم کر دے، تیرا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ وہ آپ کی بے کراں رحمت پر مچل گیا، کہنے لگا: شہر مدینہ میں مجھ سے زیادہ کوئی حاجت مند نہیں ہے۔ رحمت کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یہ لے جا اور اپنے اہل و عیال کو کھلا دے تیرا کفارہ ادا ہو جائے گا۔"

یہ ہے آپ کا اختیار اور تصرف کہ فرمایا: جا اپنے اہل و عیال کو کھلا دے تیرا کفارہ ادا ہو جائے گا، جبکہ کفارہ ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانے سے ادا ہوتا ہے آپ نے اپنے اختیار سے اس کو اس حکم سے مستثنیٰ فرما دیا۔

سرکار مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مولیٰ کریم نے مالک و مختار بنایا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ایک جملہ آپ نے ارشاد فرمایا: بخاری کتاب الحوض میں ہے:

وَاِنِّیْ اُعْطِیْتُ مَفَاتِیْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ۔ (بخاری ج ۲ ص ۹۷۵)

"اور بے شک مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں (الیٰ آخر الحدیث)

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں

میرے ہاتھ میں دے دی ہیں۔ تمام دُنیا جانتی ہے، جب کوئی شخص کہتا ہے کہ میں نے تو تالا اور کنجی فلاں کے ہاتھ میں دے دیا ہے، تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ میں نے فلاں شخص کو اپنے خزانوں میں تصرف کا مالک و مختار بنا دیا ہے۔ اب قابل ذکر بات یہ ہے کہ زمین کے خزانوں سے کیا مراد ہے۔ بعض شارحین نے یہ فرمایا ہے کہ اس سے مراد آپ کی وہ فتوحات ہیں، جو آپ کو یا خلفاء راشدین یا اُن کے بعد والے امراء و سلاطین کو حاصل ہوئیں۔ سلطنتِ روم و فارس وغیرہ کے تمام خزانے مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے۔

بعض شارحین نے فرمایا کہ ان خزانوں کے علاوہ سونا۔ چاندی۔ ہیرے۔ جواہرات۔ لوہا۔ تانبا۔ پیتل وغیرہ قسم قسم کی دھاتیں اور تیل۔ پٹرول وغیرہ کے خزانے مراد ہیں کہ سب خزانے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بدولت آپ کی اُمت کو مل گئے اور حضرت علامہ عبد المصطفےٰ اعظمی شیخ الحدیث اپنی کتاب "منتخب حدیثیں" میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ شارحین حدیث نے زمین کے خزانوں کے بارے میں اسلامی فتوحات یا زمین کی قسم قسم کی کانوں کا جو تذکرہ کیا ہے، یہ بطورِ مثال ہے، ورنہ خزائن الارض صرف یہی اور اتنی ہی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ خزائن الارض میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں، جو زمین میں سے نکلتی ہیں۔ اس بناء پر تمام جمادات، نباتات اور حیوانات سبھی زمین کے خزانے ہیں — ظاہر ہے کہ ہر قسم کی سبزیاں۔ غلّے۔ پھل قسم قسم کے ذائقے اور غذائیں، طرح طرح کی دوائیں یہ سب زمین ہی میں سے نکلتی ہیں۔ جانداروں کے نطفے بھی زمین سے نکلی ہوئی غذاؤں کی پیداوار ہیں، کیونکہ اگر جاندار زمین سے نکلی ہوئی غذائیں نہ کھاتے، تو اُن کی زندگی کہاں ہوتی؟ اُن کے جسم میں خون کہاں سے پیدا ہوتا؟ اور بلا خون کے نطفے اور منی وغیرہ کہاں سے پیدا ہوتی؟ غرض تمام جانور اور جاندار اور ان جانداروں کی زندگانی کا سارا ساز و سامان زمین ہی سے نکلتا ہے۔ اس لحاظ سے خزائن الارض میں تمام حیوانات، نباتات، جمادات شامل ہیں بلکہ زمین و آسمان کے درمیان کی کائنات بھی زمین کے خزانوں میں شامل ہیں، کیونکہ

بدلی، بارش، اولے۔ قوسِ قزح، ہالہ، رعد، برق۔ غرض تمام کائنات زمین میں سے نکلے ہوئے دُخان اور بخارات کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا اس حدیث شریف کا یہ مطلب ہوا کہ زمین کی ساری کائنات اور تمام مخلوقات جو سب زمین کے خزانے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سب میں تصرف کا مالک و مختار بنا دیا ہے۔

جب حدیث میں لفظ خزائن الارض میں کوئی تقیید و تخصیص موجود نہیں ہے، بلکہ جمع کی اضافت استغراق کا افادہ کرتی ہے، تو پھر اس صورت میں ظاہر ہے کہ یقیناً اس لفظ کو اس کے عموم ہی پر باقی رکھا جائے گا، اس کے عام ہونے ہی کی صورت میں یہ حدیث مقام مدح میں حضور پُرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شایانِ شان ہے گی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کل کائناتِ زمین کا مالک و مختار بنا دیا ہے۔ (ص ۱۷۸) بلکہ آسمانوں کی بھی بادشاہی و سلطنت، آپ کو عطا فرما دی گئی، جس کی تائید وہ حدیث کرتی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: میرے دو وزیر زمین میں ہیں، اور دو وزیر آسمان میں ہیں، وزیر سلطان ہی کے ہوتے ہیں، اسی لئے تو اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

مالکِ کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں،
دو جہاں کی نعمتیں ہیں اُن کے خالی ہاتھ میں،

مزید تفصیل کے لئے مطالعہ کی جائے کتاب سلطنتِ مصطفےٰ (مصنفہ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

فضائلِ مسواک

عُمدۃ القاری شرح بخاری جلد ۶ ص ۱۸۲ پر مسواک کے فضائل میں روایات درج ذیل ہیں:

(۱) سیدنا حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ مسواک کو لازم کر دو کہ اس میں چوبیس فوائد ہیں، جس میں افضل و اعلیٰ رحمٰن کی رضا، نماز کے اجر کا ۷۷ گنا اضافہ، وسعتِ

غنی کی صورت، منہ کی بُو اچھا کرتی ہے اور جبڑے کو مضبوط کرتی ہے، دردِ سر کو آرام دیتی ہے، داڑھ کے درد کو دور کرتی ہے، فرشتے مصافحہ کرتے ہیں، اُس کے چہرے کے نور اور دانتوں کی چمک کی وجہ سے۔

(۲) احمد و ابن حبان نے حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی ہے: اَلسِّوَاكُ مِطْهَرَةٌ لِلْفَمِ مِرْضَاةٌ لِلرَّبِّ۔ مسواک منہ کی طہارت اور ربِ کریم کو راضی کرنے والی ہے۔

(۳) ابو نعیم سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں: اس نماز کا اجر جو مسواک کے ساتھ ادا کی جائے، اس نماز پر جو مسواک کے بغیر ادا کی جائے، ستر گنا زیادہ ہے۔

(۴) حضرت احمد و ترمذی علیہما الرحمہ نے سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرمائی ہے:-

اَرْبَعٌ مِّنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ اَلْخِتَانُ وَالسِّوَاكُ وَالتَّعَطُّرُ وَالنِّكَاحُ

چار رسولوں کی سُنتوں سے ہیں ختنہ کرنا ۔ مسواک کرنا ۲ خوشبو لگانا اور نکاح کرنا۔

(۵) حضرت بزار نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے:

اَلطَّهَارَاتُ اَرْبَعٌ قَصُّ الشَّارِبِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ وَتَقْلِيْمُ الْاَظْفَارِ وَالسِّوَاكُ۔

طہارت چار ہیں: مونچھیں کاٹنا۔ زیرِ ناف بال مونڈنا ۔ ناخن کاٹنا۔ مسواک کرنا۔

ان احادیثِ مبارکہ سے مسواک کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مسواک سے محبت

حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے لیے اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضور تاجدارِ مدینہ

سُرورِ سینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، کی وفاتِ ظاہری میری باری کے دن میری ہنسلی اور سینہ کے درمیان ہوئی اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے کہ آپ کے مبارک لُعابِ دہن کو میرے تھوک کے ساتھ آپ کی وفاتِ ظاہری سے پہلے اکٹھا کر دیا۔ (وہ اس طرح) کہ میرے پاس عبدالرحمٰن بن ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) آئے اور اُن کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ میں آپ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو سہارا دے رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ آپ اُن کی مسواک کی طرف دیکھ رہے ہیں مجھے معلوم تھا کہ آپ مسواک پسند فرماتے ہیں، اِس لئے میں نے دریافت کیا کہ آپ کے لئے مسواک لوں؟۔ آپ نے سرِ اقدس کے اشارہ سے فرمایا ہاں! چنانچہ میں نے عبدالرحمٰن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے مسواک لے کر آپ کو پیش کی۔ آپ نے استعمال کرنا چاہی لیکن مسواک سخت تھی، اس لئے میں نے عرض کیا کہ نرم کر دوں؟ آپ نے سرِ مبارک کے اشارے سے فرمایا ہاں! چنانچہ میں نے دانتوں سے چبا کر نرم کر کے سرکارِ مدینہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو پیش کر دی۔ آپ نے اس کو دانتوں پر پھیرنا شروع کر دیا۔ (الی آخر الحدیث)

معلوم ہوا کہ سرکارِ مدینہ سُرورِ قلب و سینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو مسواک سے بہت محبت تھی کہ وصالِ ظاہری سے پہلے بھی مسواک فرمائی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب تاجدارِ مدینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سفر پر تشریف لے جاتے، تو اپنے ساتھ مسواک، پیشاب دانی، کنگھا، سُرمہ دانی اور آئینہ بھی لے جاتے۔

برکاتِ مسواک

مشائخِ عظام فرماتے ہیں، جو مسواک کا عادی ہوگا۔ مرنے کے وقت کلمہ نصیب ہوگا اور جو افیون کا عادی ہوگا، اُسے مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہوگا۔ (بہارِ شریعت)

علامہ سید طحطاوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں، مسواک شریف کی برکات جن کو ائمۂ کرام نے حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عطاء (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے نقل کی ہیں، وہ یہ ہیں: مسواک میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ اس سے نماز کا ثواب ننانوے ۹۹ گنے یا چار سو گنا بڑھ جاتا ہے۔ ہمیشہ مسواک کرنے سے دردِ سر دُور ہوتا ہے اور سر کی تمام رگوں کو سکون ملتا ہے۔ بلغم کو دُور کرتی ہے۔ نظر کو تیز کرتی ہے۔ معدہ کو درست رکھتی ہے۔ انسان کو فصاحت (خوش بیانی) عطا کرتی ہے۔ جسم کو توانائی بخشتی ہے۔ حافظہ کو تیز کرتی ہے اور عقل کو بڑھاتی ہے۔ دل کو پاک کرتی ہے۔ نیکیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ فرشتے مصافحہ کرتے ہیں۔ کھانا ہضم کرتی ہے۔ بچوں کی پیدائش بڑھاتی ہے۔ بڑھاپا دیر میں آتا ہے۔ حرارت کو بدن سے دُور کرتی ہے۔ بدن کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قوت دیتی ہے۔ نزع میں آسانی اور کلمۂ شہادت یاد دلاتی ہے۔ قیامت میں نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دلاتی ہے۔ پُل صراط سے بجلی کی طرح گزارے گی۔ قبر کو فراخ کیا جاتا ہے۔ قبر میں آرام اور سکون حاصل ہوگا۔ اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ مسواک کرنے والا اُس وقت تک دُنیا سے نہیں جاتا، جب تک مدینے کے تاجدار، احمدِ مختار، ساقیٔ کوثر، شافعِ روزِ محشر (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) کے مبارک حوض کا جام نہ پی لے۔ سب سے بڑھ کر فائدہ یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور منہ کی بھی صفائی حاصل ہوتی۔ (ماخوذ از فیضانِ سُنّت (ملخص))

مسائلِ مسواک بوقتِ وضو کم سے کم تین تین مرتبہ داہنے بائیں، اُوپر نیچے کے دانتوں میں مسواک کرے اور ہر مرتبہ مسواک کو دھوئے اور مسواک نہ بہت نرم ہو نہ بہت سخت، اور پیلو یا زیتون یا نیم وغیرہ کڑوی لکڑی کی

ہو، میوے یا خوشبودار پھول کے درخت کی نہ ہو۔ چھنگلیا کے برابر موٹی اور زیادہ سے زیادہ ایک بالشت لمبی اور اتنی چھوٹی بھی نہ ہو کہ مسواک کرنا دشوار ہو۔ جو مسواک ایک بالشت سے زیادہ ہو، اُس پر شیطان بیٹھتا ہے مسواک جب قابل استعمال نہ رہے تو اسے دفن کر دیں یا کسی جگہ احتیاط سے رکھ دیں کہ کسی ناپاک جگہ پر نہ گرے کہ ایک تو وہ آلہ ادائے سُنّت ہے، اس کی تعظیم چاہیے، دوسرے آب دہن مسلم ناپاک جگہ ڈالنے سے خود کو محفوظ رکھنا چاہیے، اسی لئے پاخانہ میں علماء نے تھوکنے کو نامناسب لکھا ہے۔

مسئلہ: مسواک داہنے ہاتھ سے کرے اور اس طرح ہاتھ لے کہ چھنگلیا مسواک کے نیچے اور درمیان کی تین انگلیاں اوپر اور انگوٹھا سرے پر سے نیچے ہو اور مٹھی نہ باندھے۔

مسئلہ: دانتوں کی چوڑائی میں مسواک کرے، لمبائی میں نہیں، چت لیٹ کر بھی مسواک نہ کرے۔ پہلے داہنی جانب کے اوپر کے دانت مانجھے، پھر بائیں جانب کے اوپر کے دانت، پھر داہنی جانب کے نیچے کے، پھر بائیں جانب کے نیچے کے دانت۔ جب مسواک کرنا ہو تو اسے دھو لے، یونہی فارغ ہونے کے بعد دھو ڈالے اور زمین پر پڑی نہ چھوڑ دے، بلکہ کھڑی رکھے اور ریشہ کی جانب اُوپر ہو۔

مسئلہ: اگر مسواک موجود نہ ہو تو انگلی یا سنگین کپڑے سے دانت مانجھ لے۔ یونہی اگر دانت نہ ہوں تو انگلی یا کپڑا مسوڑھوں پر پھیر لے۔

مسئلہ: مسواک نماز کے لئے سُنّت نہیں، بلکہ وضو کے لئے، تو جو ایک وضو سے چند نمازیں پڑھے، اِس سے ہر نماز کے لئے مسواک کا مطالبہ نہیں، جب تک تغیّرِ رائحہ نہ ہو گیا ہو، ورنہ اس کے لئے مستقل سنّت ہے۔ البتہ اگر وضو میں مسواک نہ کی تھی، تو اب نماز کے وقت کرلے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

(بہارِ شریعت)

آدابِ قبلہ

حدیث ۲۴: عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَتَیْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَۃَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْھَا وَلٰکِنْ شَرِّقُوْا اَوْ غَرِّبُوْا۔

(بخاری شریف جلد اوّل ص۲۶، مسلم شریف جلد اوّل ص۱۳۰)

حلِ لُغات

اَلْغَائِطِ: پاخانہ۔ لَاتَسْتَقْبِلُوْا: منہ نہ کرو۔ لَاتَسْتَدْبِرُوْا: پشت نہ کرو۔

ترجمہ: "سیدنا ابوایوب[1] انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم قضاء حاجت کے لئے آؤ تو (بوقتِ قضائے حاجت) قبلہ کی طرف نہ منہ کرو، اور نہ پشت کرو، لیکن مشرق کی طرف منہ کرلو، یا مغرب کی جانب۔"

---

[1] حضرت ابوایوب خالد بن زید بن کلیب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ عقبہ۔ بدر، اُحد اور تمام مشاہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر ہوئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو انہیں کے مہمان ہوئے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان کے درمیان مؤاخات فرمائی۔ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تمام جنگوں میں شریک رہے۔ صحابہ کرام میں سے ان سے ابن عمر، براء بن عازب، ابوامامہ، زید بن خالد جہنی، مقدام بن معدیکرب، انس بن مالک، جابر بن سمرہ، عبداللہ بن یزید الخطمی رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے حضرات سعید بن المسیب، عروہ، سالم بن عبداللہ، ابوسلمہ، عطاء بن یسار، عطاء بن یزید رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم نے روایت کی ہے۔ باختلاف روایات آپ کی وفات ۵۰ھ ۵۱ھ ۵۲ھ میں ہوئی۔ یہ اس لشکر میں تھے جس کا امیر یزید بن معاویہ تھا۔ آپ کو قسطنطنیہ کے نزدیک دفن کیا گیا۔

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

تشریح الغائط کا لغوی معنی پست زمین ہے، لیکن منقولِ عرفی کے طور پر اب اس کا معنی قضاءِ حاجت ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی یہی معنی مُراد ہے: جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ۔ آیا تم میں سے کوئی قضاءِ حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہے؛ وجہ نقل یہ ہے کہ عام طور پر قضاءِ حاجت کے لئے لوگ باہر کسی پست زمین میں جاتے، تاکہ پردہ حاصل ہو جائے۔ پھر عرف عام میں خود قضائے حاجت کو غائط کہا جانے لگا کیونکہ اہلِ عرب کی عادت ہے کہ جس چیز کا سُننا اور دیکھنا ناپسند کرتے ہیں، اس کو بطور کنایہ کے ذکر کرتے ہیں۔

اِس حدیث میں بوقتِ قضاءِ حاجت کے آدابِ قبلہ کا بیان ہے۔ یعنی جب کوئی شخص پیشاب، پاخانہ کرنے کے لئے صحراء یا بیت الخلاء میں جائے تو نہ قبلہ کی طرف منہ کرے اور نہ پیٹھ قبلہ کی طرف کرے۔۔۔ اس حدیث میں مطلق حکم ہے صحرا ہو یا بیت الخلاء میں جاتے اور یہی مذہب امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور آپ نے فرمایا بوقتِ قضائے حاجت مشرق کی طرف منہ کر لیا کرو۔ مغرب کی جانب یہ حکم اہلِ مدینہ اور اُن کے لئے ہے، جس جگہ سے قبلہ یا جنوب کی طرف ہے یا شمال کی طرف؛ اور جس جگہ سے قبلہ مشرق کی طرف ہے یا مغرب کی طرف، اُن کے لئے حکم اس کے برعکس ہے۔ یعنی وہ قضاءِ حاجت (بول و براز) کے وقت شمال، جنوب کی طرف کریں۔

اس حدیث میں جس جگہ قضاءِ حاجت کے آداب کا بیان ہے اُس جگہ احترامِ قبلہ کا بھی بیان ہے کہ اس خاص وقت میں احترامِ قبلہ کے پیشِ نظر قبلہ کی جانب منہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ان کی قبر کے توسّل سے استسقاء کیا جاتا ہے۔ (اسد الغابہ ج۲ ص۸۱-۸۲)

حضرت ابو ایوب انصاری نے امیر معاویہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے عہد میں ۵۱ھ میں قسطنطنیہ پر حملہ کے وقت شرکت کی، وہیں وفات پائی اور قلعہ کے نزدیک دفن کئے گئے۔ مجاہد نے کہا وہاں کے لوگ جب قحط میں مبتلا ہوتے، تو اُن کی قبرِ مبارک کھول دیتے، تو بارش ہو جاتی۔ (اسد الغابہ ج۵ ص۱۴۴)

اور پشت نہ کرنی چاہیئے۔ اسی احترام کے پیشِ نظر یہ حکم ہے کہ نہ قبلہ کی جانب تھوکے، اور نہ پاؤں پھیلا کر بیٹھے اور نہ ہی قبلہ کی جانب پاؤں پھیلا کر لیٹے، ہاں واعظ کے لئے اجازت ہے کہ بوقتِ وعظ قبلہ کی طرف پشت کرے اور لوگوں کی طرف مُنہ کر کے خطاب کرے۔ اسی طرح سے بھی اجازت ہے کہ جب میت کو قبرستان یا جنازہ پڑھنے کے لئے لے جا رہے ہوں تو حکم ہے کہ میت کا سر اس طرف ہونا چاہیئے جدھر جا رہے ہوں، چاہے اس کے پاؤں قبلہ کی جانب ہوں، یہ مجبوری ہے، اسی طرح اگر کوئی بیمار ہو اور وہ لیٹ کر نماز پڑھ رہا ہو، اس وقت بھی بہتر یہی ہے کہ وہ اس طرح سیدھا لیٹے کہ چہرہ اور مکمل جسم قبلہ کی جانب ہو، اس وقت بھی مجبوراً پاؤں قبلہ کی جانب ہو جائیں گے، احتراماً ذرا پاؤں کو اونچا کرے، اس مسئلہ میں مشہور چار مذاہب ہیں۔

مذہبِ امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اس مسئلہ میں مذہب یہ ہے کہ مُطلقاً وقت قضاء حاجت، استقبال قبلہ اور استدبار منع ہے، چاہے جنگل ہو یا کھُلی فضا میں اور چاہے بیت الخلا اور بستیاں اور تعمیر شدہ جگہوں میں قضاء حاجت کرے اور یہی مذہب ہے امام مجاہد اور ابراہیم نخعی، اور سفیان ثوری اور ابوثور کا اور یہی مذہب ہے راوی حدیث ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اُن کی دلیل یہی حدیث ہے کہ اس میں حکم مطلق اور عام ہے اور قاعدہ ہے کہ مطلق اپنے اطلاق پر اور عام اپنے عموم پر جاری ہوتا ہے۔ راوی حدیث نے بھی اس حدیث سے یہی معنی اخذ کئے ہیں، جیسا کہ بخاری اور مؤطا امام مالک میں ہے کہ راوی حدیث ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ملکِ شام میں آئے، تو وہاں قبلہ کی جانب بیت الخلاء بنے ہوئے تھے، ہم وہاں قضاء حاجت کے وقت رُخ بدل کر بیٹھتے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتے۔ ثابت ہوا اس طرح بیت الخلا بنانے بھی منع ہیں جن میں استقبال و

استدبار قبلہ کی جانب ہوتا۔ مسلکِ امام اعظم (رحمۃ اللہ تعالیٰ) کی تائید و تصدیق ان احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

(۱) عبداللہ بن حارث بن جزء کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں:

اَنَا اَوَّلُ مَنْ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا یَبُوْلَنَّ اَحَدُکُمْ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَۃِ

میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ تم میں سے کوئی بھی ہرگز قبلہ کی جانب منہ کرکے پیشاب نہ کرے

(۲) معقل بن ابی معقل کی حدیث جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ بِاَنْ نَّسْتَقْبِلَ الْقِبْلَتَیْنِ بِبَوْلٍ وَّغَائِطٍ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ بول و براز کے وقت ہم قبلتین کی طرف منہ کریں۔

اِس حدیث میں قبلتین سے مراد قبلۂ اول بیت المقدس اور کعبہ پاک ہے، کیونکہ مدینہ منورہ میں اگر بیت المقدس کی طرف مُنہ کیا جائے، تو پُشت خانہ کعبہ کی طرف ہوتی اس طرح خانہ کعبہ کی جانب استدبار ہوجائے گا۔ بعض نے فرمایا کہ قبلۂ اول کے احترام کے پیشِ نظر اس وقت بھی قضائے حاجت کے وقت استقبال و استدبار نہ کرنا چاہیے۔

(۳) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث، جس میں ذکر فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ نَھَانَا اَنْ نَّسْتَقْبِلَ الْقِبْلَۃَ بِغَائِطٍ وَّبَوْلٍ۔

ہمیں سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بول و براز کے وقت استقبالِ قبلہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

(۴) حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکارِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَۃِ الْوَالِدِ اُعَلِّمُکُمْ فَاِذَا اَتٰی اَحَدُکُمُ الْغَائِطَ فَلَا یَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَۃَ وَلَا یَسْتَدْبِرْھَا۔

میں تمہارے لئے والد کے قائم مقام ہوں، تمہیں تعلیم دیتا ہوں، جب تم میں سے کوئی بول و براز کے لئے آئے تو وہ قبلہ کی طرف مُنہ نہ کرے اور نہ ہی اس کی طرف پشت کرے

یہ تمام احادیثِ مبارکہ عمدۃ القاری سے نقل کی گئی ہیں۔ ان سب میں حکم مطلق ہے، صحرا کی تقیید نہیں ہے، اور یہی امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مذہب ہے

دوسرا مذہب یہ ہے کہ مطلقاً استقبال واستدبارِ قبلہ بوقتِ قضائے حاجت جائز ہے۔ یہ مذہب عروہ بن زبیر اور ربیعہ اور داؤد ظاہری کا ہے۔ ان کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع فرمایا کہ ہم بوقتِ قضائے حاجت استقبال و استدبار قبلہ کریں۔ پھر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کو وصال سے ایک سال قبل دیکھا ہے کہ وقتِ قضاءِ حاجت استقبالِ قبلہ فرمائے ہوئے ہیں۔ اس مذہب والے ابو ایوب انصاری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی حدیث کو منسوخ اور اس حدیث کو ناسخ سمجھتے ہیں۔ اس کا جواب آگے نقل کیا جائے گا۔

تیسرا مذہب صحراء کے بیت الخلاء میں استقبالِ قبلہ جائز نہیں ہے اور استدبار جائز ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ سے بھی اس طرح کی ایک روایت ہے۔

چوتھا مذہب یہ کہ صحرا اور کھلی فضاء میں استقبال و استدبار جائز نہیں اور بیت الخلاء اور آبادی میں استقبال و استدبار جائز ہے۔

یہ ہے مذہب امام شافعی اور اسحاق اور امام احمد (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا۔ ان کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں، ایک دن میں اپنے مکان کی چھت پر گیا تو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دو اینٹوں پر قضاءِ حاجت کرتے دیکھا، جبکہ بیت المقدس کی طرف منہ مبارک کئے ہوئے تھے

کہ یہ حدیث عموم نہی کی مخصص ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ابو ایوب (رضی اللہ عنہ) والی حدیث کی ناسخ ہے، لیکن یہ درست نہیں ہے کہ تخصیص و نسخ کا دعوٰی اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جب تطبیق ممکن نہ ہو۔ ان میں تطبیق ممکن ہے، وہ اس طرح کہ یہ آپکا فعل مبارک ہے اور وہ آپ کا قول مبارک ہے ۔۔۔ اور ۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب قول و فعل میں تعارض ہو تو ترجیح قول کو ہوتی ہے، کیونکہ فعل میں احتمالِ خصوصی اور احتمالِ عذر بھی ہوسکتا ہے، یعنی ہوسکتا ہے کہ یہ حکم آپ کے ساتھ ہو یا بوجہ کسی مجبوری کے ہو یا راوی حدیث کو غلط فہمی ہوگئی ہو، کیونکہ اس مخصوص حالت میں عام شخص کو بغور نہیں دیکھا جاسکتا، چہ جائیکہ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کو انہوں نے اچانک دیکھا، تو اپنے غور و فکر سے قیاس کرکے بیان کردیا۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

اور یہی جواب دوسرے مذہب میں مذکور حدیث کا ہوگا۔

دوسرا جواب: قاعدہ یہ ہے کہ جب حلت و حرمت میں تعارض آئے تو حرمت کو ترجیح دی جائے گی، لہٰذا ان روایات کو ترجیح ہوگی، جن میں مطلقاً منع فرمایا گیا ہے۔ (جو مذہب اول میں مذکور ہوا)

تیسرا جواب: اُمت کو سمتِ قبلہ کی طرف استقبال و استدبار سے آپ نے فرمایا ہے، اور سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے عین قبلہ ہوتا ہے۔ آپ عین قبلہ کی طرف منہ نہ فرماتے تھے، اگرچہ سمتِ قبلہ کی طرف منہ مبارک ہوجائے کیونکہ آپ کے لئے حجابات نہیں ہیں۔ آپؐ قبلہ کو مشاہدہ فرماتے ہوئے عین قبلہ کی طرف رُخ نہ فرمایا سمتِ قبلہ ہونے کی وجہ سے راوی کو غلط فہمی ہوگئی ہے (یہ بھی تطبیق کی ایک صورت ہے۔

قضاءِ حاجت کے آداب جب کوئی شخص قضائے حاجت کرنا چاہے تو اگر صحرا میں ہو تو دور مقام میں چلا جائے جہاں لوگ

اسے نہ دیکھیں۔ اگر آبادی میں ہو تو پردہ کرے یا کسی گڑھے وغیرہ میں چلا جائے اور زمین سے قریب ہو کر شرمگاہ سے کپڑا اُٹھائے، جیسا کہ ابوداؤد شریف میں ہے: ننگے سر قضاءِ حاجت نہ کرے اور نہ ہی اس وقت کوئی بات کرے۔ بائیں ہاتھ سے استنجا کرے اور فارغ ہونے کے بعد مٹی یا صابن سے ہاتھ دھوئے۔ استنجا کے لئے مٹی کے ڈھیلے استعمال کرے ہڈی۔ گوبر وغیرہ سے پرہیز کرے اور غسل خانہ میں وضو نہ کرے۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی بھی شخص غسل خانہ میں پیشاب نہ کرے، پھر وہاں غسل بھی نہ کرے۔ یہ اس وقت ہے جبکہ غسل خانہ میں پانی جمع ہو جاتا ہو، ورنہ حرج نہیں۔ انگوٹھی پہنی ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہو تو اُس کو اتار دے۔ سورج اور چاند کی طرف منہ نہ کرے۔ کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرے اور نہ ہی راستہ میں اور سایہ، کھڑے پانی، پھلوں کے گرنے کی جگہ اور نہروں کے کناروں پر پیشاب نہ کرے۔ (تفہیم البخاری جلد اوّل صـ۳۸۶)

بیت الخلاء جاتے وقت کیا پڑھے

حدیث ۲۵: عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ قَالَ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔

(بخاری شریف جلد اوّل صـ۲۶ مسلم شریف جلد اوّل صـ۱۶۳)

حلِ لغات
اَلْخُبُثِ: جمع ہے خبیث کی، مذکر شیاطین کو کہتے ہیں۔
اَلْخَبَائِثِ: جمع ہے خبیثہ کی، مؤنث شیاطین کو کہتے ہیں۔

ترجمہ: سیدنا انس[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

---

[1] ان کے حالات، حاشیہ ۲ حدیث کے مقام پر دیکھے جائیں، منہ ۱۲

جب حضور نبی کریم صلّی اللہ تعالٰی علیہ وسلّم بیت الخلاء میں داخل ہونے کا ارادہ فرماتے تو یہ پڑھتے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔
"اے اللہ! میں نر جنوں اور مادہ جنوں سے پناہ مانگتا ہوں۔"

تشریح اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مستحب و مسنون یہ ہے کہ جب بندہ بیت الخلاء جائے، تو مذکورہ بالا استعاذہ پڑھے کیونکہ ان مقامات میں شیطان حاضر ہوتے ہیں' اس لئے ان میں داخل ہونے سے قبل استعاذہ پڑھے تاکہ ان کے شر سے محفوظ ہو جائے حضور سیدِ عالم صلّی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا: "اِن حشوش میں جن حاضر ہوتے ہیں۔"

اِذَا دَخَلَ سے مُراد یہ ہے کہ جب داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ کیونکہ داخل ہونے کے بعد زبان سے اللہ تعالٰی کا ذکر نہ کرنا مستحب ہے۔ اس طرح عبدالعزیز کی روایت اِذَا اَرَادَ اَنْ یَّدْخُلَ سے موافقت ہو جائے گی جیسے قرآن پاک میں اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ سے مراد ہے "جب قرأت کا ارادہ کرے۔"

بیت الخلاء سے مُراد عام ہے وہ تعمیر شدہ بیت الخلا ہو، یا صحرا میں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تعمیر شدہ میں داخل ہوتے وقت پڑھنا ہے اور صحرا میں بیٹھنے سے پہلے پڑھنا ہے۔ (فتح الباری)

الخُبُث و الخبائث لفظ خُبُث میں خا اور با دونوں پر ضمہ مروی ہے۔ خطابی فرماتے ہیں کہ با کو ساکن کر کے پڑھنا جائز نہیں ہے، لیکن شارح مسلم امام نووی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اہلِ معرفت کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ با ساکن ہے، کیونکہ قانون بھی ہے کہ فُعُل میں، فُعْل پڑھا جا سکتا ہے جیسے کہ کُتُبٌ کو کُتْبٌ پڑھا جا سکتا ہے۔ ہاں ترکِ تخفیف اُولیٰ ہے تاکہ مصدر سے اشتباہ نہ ہو۔ (فتح الباری)

ابو عبداللہ بخاری علیہ الرحمہ نے فرمایا اگر خُبث مخفف ہو خُبُث سے تو اس کا معنیٰ وہ ہے جو بندہ نے حل لغات میں ذکر کیا ہے، اور خُبث مفرد ہو تو اس کا معنیٰ جیساکہ ابنِ عربی علیہ الرحمہ نے فرمایا: امرِ مکروہ (ناپسندیدہ) ہو گا۔ فرمایا، اگر مکروہ کلام ہو تو مراد گالی وغیرہ، اور اگر مکروہ مِلّت ہو تو کفر اور اگر طعام سے ہو تو حرام اور اگر مشروب سے ہو تو نقصان دہ مُراد ہو گا۔ اِس معنی پر پھر خبائث سے مُراد گناہ یا مطلق مذموم افعال مراد ہوں گے تاکہ تناسب حاصل ہو جائے۔

(فتح الباری جلد اوّل ص ۲۱۳ تا ص ۲۱۴)

مسائل (۱) اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے کا جب ارادہ ہو تو استعاذہ پڑھے اور اس کے استحباب پر اجماع ہے چاہے تعمیر شدہ مکان ہو یا صحراء (جنگل وغیرہ) ہو، اگر تعوذ بھُول گیا، اور داخل ہو گیا، تو سیدنا ابنِ عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) وغیرہ نے فرمایا کہ داخل ہونے کے بعد پڑھنا مکروہ ہے، اور سیدنا ابنِ عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے پڑھنے کی اجازت دی ہے۔

(۲) بیت الخلاء میں داخل ہونے کے بعد پڑھنے میں آثار مختلف ہیں۔ اس اثر سے جواز معلوم ہوتا ہے اور اس حدیث سے منع معلوم ہے، جس میں یہ ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام بئرِ جمل کی طرف تشریف لا رہے تھے کہ ایک شخص سے مُلاقات ہو گئی اُس نے سلام عرض کیا، تو آپ نے جواب نہ دیا، یہاں تک کہ دیوار سے تیمم فرمایا، تو جواب دیا۔ معلوم ہوا بے وضو ذکر کرنا آپ نے پسند نہ فرمایا۔ اس مسئلہ میں علماء کے ارشادات بھی مختلف ہیں۔ ابنِ عباس، عطاء، مجاہد، شعبی کا قول یہ ہے کہ وہ خلاء کے وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ناپسند کرتے ہیں۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، خلاء میں اللہ تعالیٰ کا ذکر زبان سے نہ کرے بلکہ دل میں ذکر کر سکتا ہے۔

ایک جماعت نے ذکر کی اجازت بھی دی ہے ۔ مروی ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بیت الخلاء میں ذکر لیتے تھے، اور عرزمی فرماتے ہیں کہ میں نے شعبی سے پوچھا کہ اگر مجھے بیت الخلاء میں چھینک آجائے، تو کیا میں اللہ تعالیٰ کی حمد کروں؟ تو آپ نے منع فرمایا۔ ارشاد فرمایا: فارغ ہو کر حمد کرے ۔ پھر راوی کہتے ہیں: میں نے یہی مسئلہ امام نخعی سے پوچھا، تو آپ نے فرمایا حمد کرلے ۔ میں نے ان کو قول شعبی کی خبر دی، تو انہوں نے فرمایا: تو حمد اوپر چڑھتی ہے، نیچے نہیں اترتی۔ ابن بطال کہتے ہیں اس حدیث میں اس کی دلیل ہے، جو ذکر کے جواز کا قول کرتے ہیں ۔ (عمدۃ القاری)

آثار و اقوال مختلف ہیں، اس قاعدہ کے تحت کہ جب جواز و کراہت میں تعارض ہو تو احتیاطاً کراہت کو ترجیح ہوتی ہے، اس لئے مناسب یہی ہے کہ بیت الخلاء میں زبان سے ذکر نہ کرے، اسی لئے مستحب یہ ہے کہ جس انگوٹھی میں اللہ تعالیٰ کا نام کندہ ہو، اسے پہن کر بیت الخلاء میں نہ جائے ۔

اَحَبَّ بعض النَّاس اَن لا یدخل الخلاء بالخاتم فیہِ ذکر اللہ۔
بعض لوگوں نے یہ پسند کیا ہے کہ ایسی انگوٹھی پہن کر جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا نام ہو، بیت الخلاء میں نہ جائے ۔" (کہ ادب و احترام کا یہی تقاضا ہے)
امام بخاری (رحمۃ اللہ تعالیٰ) فرماتے ہیں کہ یہ قول حرمت کے فتویٰ کے بغیر درست ہے ۔ خلاصہ یہی ہے کہ بیت الخلاء میں زبان سے ذکر نہ کرنا مستحب و بہتر ہے۔

(۳) اس حدیث میں لفظ استعاذہ لفظ اعوذ کے ساتھ ہے اور ایک روایت میں ہے فَلْیَتَعَوَّذْ بِاللہِ۔ یہ ان تمام الفاظ کو شامل ہے جس میں استعاذہ ہو جیسے اَعُوْذُ بِکَ ۔ اَسْتَعِیْذُ بِکَ ۔ اَعُوْذُ بِاللہِ ۔ اَسْتَعِیْذُ بِاللہِ ۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ ۔ اور اس کی امثال ۔

(۴) حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا استعاذہ فرمانا اظہارِ عبودیت ہے، اور تعلیمِ اُمت ہے، ورنہ جن و انس سے محفوظ و معصوم ہیں۔ آپ نے تو عفریتِ جن کو مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا تھا۔

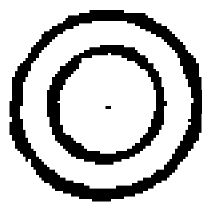
(۵) علماء کرام نے فرمایا: تعوذ کے ساتھ بسم اللہ بھی کہے۔ عبد العزیز بن صہیب علیہ الرحمہ کی روایت میں:۔

اِذَا دَخَلْتُمُ الْخَلَاءَ فَقُوْلُوْا جب خلاء میں جانے کا ارادہ ہو تو کہو:۔
بِسْمِ اللّٰہِ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔ بسم اللہ اعوذ باللہ من الخبث والخبائث۔

اور سعید بن زید نے ابن عدی کی کتاب میں فرمایا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے، تو وہ پڑھتے:
بِسْمِ اللّٰہِ۔ پھر پڑھتے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ۔
اِن روایات سے معلوم ہوا کہ تعوذ کے ساتھ بِسْمِ اللّٰہِ بھی پڑھنی چاہیے۔ (عمدۃ القاری جلد دوم، صـ۲۷۱، صـ۲۷۲)

بیت الخلاء سے فارغ ہونے کے بیت الخلاء سے بایاں پاؤں باہر رکھتے اور یہ دعا پڑھے:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَخْرَجَ عَنِّیَ الْاَذٰی وَعَافَانِیْ۔
(میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں) تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، جس نے مجھ سے تکلیف دہ چیز کو خارج کر دیا اور مجھے عافیت عطا فرمائی۔

(واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب!)



آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بصرِ مبارک کا بیان

حدیث ۲۶: عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ھَلْ تَرَوْنَ قِبْلَتِیْ ھٰھُنَا فَوَاللّٰہِ مَا یَخْفٰی عَلَیَّ خُشُوْعُکُمْ وَرُکُوْعُکُمْ اِنِّیْ لَاَرَاکُمْ مِنْ وَّرَآءِ ظَھْرِیْ۔

(بخاری شریف جلد اوّل صفحہ ۵۹، مسلم جلد اوّل صفحہ ۱۸۰)

حلِ لغات: تَرَوْنَ: دیکھتے ہو تم۔ قِبْلَتِیْ: میرے سامنے۔ مَا یَخْفٰی: پوشیدہ نہیں ہے۔ خشوع: عجز و انکسار۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم میرے سامنے کو دیکھتے ہو اس جگہ پس اللہ تعالیٰ کی قسم مجھ پر تمہارا خشوع اور رکوع مخفی نہیں ہے۔ بے شک میں البتہ تمہیں اپنے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔''

تشریح: اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے باب عظۃ الامام اور باب دلائل النبوۃ میں ذکر فرمایا ہے۔ آپ نماز پڑھا کر فارغ ہوتے، تو آپ نے صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا، کیونکہ بعض سے رکوع و خشوع میں کمی واقع ہوئی کہ خدا تعالیٰ کی قسم مجھ پر تمہارا رکوع و خشوع مخفی نہیں ہے۔ جیسے میں سامنے دیکھتا ہوں، ویسے ہی میں اپنے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔

بعض روایات میں رکوع و سجود کا ذکر ہے، بعض میں ظَھْرِیْ کی جگہ بَعْدِیْ کا لفظ ہے۔ اس حدیث سے جس جگہ یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ امام اگر مقتدیوں میں کوئی

غلطی، کوتاہی دیکھے، تو اس کو متنبہ کرنا چاہیے۔ اس جگہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادراک اور رویت عامہ یعنی ہر طرف دیکھنا ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آگے پیچھے، اوپر نیچے، روشنی تاریکی میں یکساں دیکھتے تھے بعض حضرات نے اس سے مراد لیا ہے کہ بطریق وحی یا الہام ان کے افعال پر آپ کو مطلع کر دیا جاتا ہے، لیکن شارح بخاری علامہ عینی علیہ الرحمہ نے اس کا رد فرمایا کہ مِنْ وَّرَاءِ ظہری فرمانے کا کوئی مطلب نہ ہوگا، بلکہ آپ نے فرمایا کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ آپ کا تمام اطراف کی طرف یکساں دیکھنا آپ کے خصائص و معجزات سے ہے، اسی لئے امام بخاری نے اس حدیث پاک کو دلائل النبوۃ کے باب میں بھی ذکر کیا ہے اور اس سے مذہب اشاعرہ کی تائید ہوتی ہے کہ وہ رویت میں آمنا سامنا، جہت اور مکان کی شرط نہیں لگاتے اور نہ ہی عضوِ مخصوص آنکھ کی، وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ چین کا اندھا اندلس کے مکانات کو دیکھ لے۔

آپ کے دیکھنے کی کیفیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھے دیکھنا۔ بعض فرماتے ہیں: کانت لہٗ عین خلف ظہرہ۔

"آپ کے پیچھے کی جانب ایک آنکھ تھی جس کے ساتھ اپنے پیچھے آپ ہمیشہ دیکھتے تھے" بعض فرماتے ہیں کہ آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان سوئی کے ناکہ کی مثل دو آنکھیں تھیں، ان سے آپ دیکھتے، کوئی کپڑا وغیرہ حجاب نہ ہوتا۔ بعض فرماتے ہیں کہ ان کے افعال سامنے کی دیوار پر منقش ہو جاتے تو آپ سر کی آنکھوں سے مشاہدہ فرما لیتے بہرحال جیسے بھی ہو، آپ آگے پیچھے یکساں دیکھتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی سر کی آنکھوں میں یہ قوت ہو کہ بیک وقت تمام اطراف میں دیکھے اور علامہ کاظمی علیہ الرحمہ نے حدیث معراج میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلبِ اطہر میں دو آنکھیں تھیں، جس سے آپ دیکھتے اور دو کان تھے، جس سے آپ سنتے تھے۔ پھر تو یہ مسئلہ اور

آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ جیسا سر کی آنکھوں کا ادراک دائمی ہے، اسی طرح قلبِ انور کی آنکھوں کا ادراک دائمی ہوگا۔

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام حاضر ناظر ہیں

اس حدیث میں لفظ خشوع ہے، جو دل کی کیفیت کا نام ہے تو معلوم ہوا کہ قلوب کی کیفیتیں بھی نگاہِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

ایک روایت میں ہے: اِنِّیْ لَاَنْظُرُ اِلٰی مَا وَرَائِیْ کَمَا اَنْظُرُ اِلٰی مَا بَیْنَ یَدَیَّ۔ "بے شک میں اپنے پیچھے ایسے دیکھتا ہوں، جیسا کہ آگے سے دیکھتا ہوں۔" (دلائل النبوۃ ص۲۷۷، زرقانی علی المواہب ج ۴ ص۸۲)

ایک اور روایت میں ہے: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَرٰى فِى اللَّيْلِ فِى الظُّلْمَةِ كَمَا يَرٰى فِى النَّهَارِ۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رات کے اندھیرے میں بھی ایسا ہی دیکھتے جیسا کہ دن کی روشنی میں۔

(خصائصِ کبریٰ جلد اوّل ص۶۱ ۔ زرقانی جلد ۴ ص۸۲)

اِن روایات کے بعد علامہ زرقانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

(ترجمہ) "پس معنیٰ یہ ہے کہ آپ کا روشن دن اور اندھیری رات میں دیکھنا برابر ہے، اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو باطن کی اطلاع اور دل کی باتوں کا پورا پورا ادراک عطا فرما دیا تو ایسا ہی آپ کی آنکھوں کو بھی (ظاہری و باطنی) ادراک عطا فرما دیا، چنانچہ آپ اپنے پیچھے بھی اسی طرح دیکھتے، جیسا کہ آپ اپنے آگے سے دیکھتے تھے۔ (زرقانی)

یہی وہ مبارک و مقدس آنکھیں ہیں، جو ساری کائنات کا مشاہدہ فرما رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا (الاحزاب: پ۲۳) — اے نبی! بے شک ہم نے آپ کو حاضر و ناظر بنا کر بھیجا ہے ۔

اس آیتِ کریمہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد فرمایا اور شاہد کے معنیٰ ہے حاضر و ناظر۔ امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

اَلشُّهُوْدُ وَالشَّهَادَةُ الْحُضُوْرُ مَعَ الْمُشَاهَدَةِ اِمَّا بِالْبَصَرِ اَوْ بِالْبَصِيْرَةِ۔ مفردات ص۲۶۹ — شہود اور شہادۃ کے معنیٰ ہے حاضر ہونا مع ناظر ہونے کے بصر کے ساتھ ہو، یا بصیرت کے ساتھ ۔

جب ثابت ہوا کہ شاہد کا معنیٰ حاضر و ناظر ہے، اب دیکھئے آپ کس کس کے ناظر ہیں؟ اسی آیتِ کریمہ کے تحت تفسیر ابوسعود اور تفسیر رُوح المعانی اور تفسیر جمل میں ہے:

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا عَلٰى مَنْ بُعِثْتَ اِلَيْهِمْ تُرَاقِبُ اَحْوَالَهُمْ وَتُشَاهِدُ اَعْمَالَهُمْ — ہم نے آپ کو حاضر و ناظر بنا کر بھیجا ان سب پر جن کی طرف آپ رسول بنا کر بھیجے گئے۔ آپ ان کے احوال کی نگہبانی کرتے ہیں، اور ان کے اعمال کا مشاہدہ فرماتے ہیں۔

یہی مضمون تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک اور تفسیر جلالین میں بھی ہے:۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس کس کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے؟ تو خود حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

اُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً۔ (مسلم شریف) — میں تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

جب ثابت ہوا کہ آپ تمام مخلوق کی طرف مبعوث ہوتے ہیں پچھلی تفاسیر سے معلوم ہوا کہ آپ جس کی طرف مبعوث ہوتے، اُس کے ناظر بھی ہیں۔ لہٰذا معلوم معلوم ہوا کہ آپ تمام مخلوق کے ناظر ہیں۔ یہی معنیٰ ہے آپ کے حاضر و ناظر

ہونے کا کہ آپ اپنے روضۂ انور میں موجود ہیں اور تمام مخلوق کے ناظر ہیں۔ اس معنیٰ میں ہم اہلِ سنّت کا آپ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ ہے۔ یہ معنیٰ نہیں ہے کہ آپ ہر جگہ موجود ہیں، تاہم آپ مختار ہیں، جہاں چاہیں تشریف لے جائیں۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ:

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ رَفَعَ لِيَ الدُّنْيَا وَاَنَا اَنْظُرُ اِلَيْهَا وَاِلٰى مَا هُوَ كَائِنٌ فِيْهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ كَاَنَّمَا اَنْظُرُ اِلٰى كَفِّيْ هٰذِهٖ۔ (زرقانی ج ۷، ص ۲۰۴)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک اللہ نے میرے لیے دُنیا کے حجابات اٹھا دیئے ہیں، تو میں دُنیا اور جو کچھ اس میں قیامت تک ہونے والا ہے، سب کو ایسے دیکھ رہا ہوں جیسے کہ اپنی ہتھیلی کو۔

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِيَ الْاَرْضَ حَتّٰى رَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا۔ (مسلم شریف)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو سمیٹ دیا (یعنی سمیٹ کر مثلِ ہتھیلی کر دیا) یہاں تک کہ میں نے زمین کے تمام مشارق و مغارب کو دیکھ لیا (یعنی ساری زمین کا مشاہدہ کر لیا)

ان روایات سے ثابت ہوا کہ نگاہِ نبوت سے کائنات کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے، آپ مثلِ کفِ دست دیکھ رہے ہیں — حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

مَا مِنْ شَيْءٍ لَمْ اَكُنْ اُرِيْتُهٗ اِلَّا رَاَيْتُهٗ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا حَتَّى الْجَنَّةِ وَالنَّارِ۔ (بخاری ج ۱، ص ۱۸)

"کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ہونے والی ہو مگر میں نے اس کو اس مقام پر دیکھ لیا ہے یہاں تک کہ جنت و دوزخ کو بھی۔"

فائدہ: جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے اور دوزخ ساتوں زمینوں کے نیچے معلوم ہوا کہ نگاہِ مصطفےٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی رسائی تحت الثریٰ سے لے کر عرشِ علیٰ تک ہے، بلکہ اس سے بھی وراء الوریٰ تک۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ فرماتے ہیں

سرِ عرش پر ہے تیری گزر، دلِ فرش پر ہے تیری نظر
ملکوت و ملک میں کوئی شے نہیں، وہ جو تجھ پہ عیاں نہیں

جنگِ موتہ، جو ملکِ شام میں ہو رہی تھی، اُس کے سارے حالات حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ہی بیٹھے بٹھائے صحابۂ کرام کو بتائے (بخاری مشکوٰۃ)

جب حضرت یعلیٰ بن منبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگِ موتہ کی خبر لے کر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ نے فرمایا: جنگ کے تفصیلی حالات پہلے میں تجھ کو بتاؤں یا تو بتائے گا؟ اُس نے عرض کیا: آپ ہی بتائیں آپ نے جو کچھ وہاں ہوا، جو جو کسی پر گزرا، جس جس طرح کوئی شہید ہوا، سب تفصیلاً سُنا دیا۔ حضرت یعلیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سُن کر کہا: خدا تعالیٰ کی قسم! آپ کے بیان اور اصل واقعات میں سرِ مُو فرق نہیں ہے۔ (بیہقی، ابونعیم، خصائصِ کبریٰ ص $\frac{۲۵۹}{۱}$)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنِّیْ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ۔ بے شک میں دیکھتا ہوں، جو تم نہیں دیکھتے۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ۔ مشکوٰۃ) (ماخوذ از ذکرِ جمیل ملخصًا)

دائمی ادراک

ان روایات سے حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام کائنات کو مشاہدہ کرنا اور تحت الثریٰ سے لے کر عرشِ عُلا تک دیکھنا ثابت ہوتا ہے۔ بعض حضرات اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ بطورِ معجزہ کبھی کبھی ہوتا تھا آپ کا یہ ادراک دائمی نہ تھا، اِن سے دریافت یہ کرنا چاہیے کہ ان روایات میں کونسا لفظ ہے جو ادراک دائمی نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اپنے پاس سے قید لگانے کا

آپ کو کس نے حق دیا ہے ؟ تمام خلق کا مشاہدہ، یہ ایک نعمت ہے اور کیا کوئی محب اپنے محبوب کو نعمت دے کر واپس لے لیتا ہے ؟ خدا تعالیٰ محب ہے، اور آپ اس کے محبوب ہیں ۔ قانونِ محبت کے خلاف ہے نعمت دے کر واپس لے لینا ۔ ویسے بھی مولیٰ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے :

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ۔ اگر تم شکر کرو گے تو میں نعمت کو بڑھاوں گا۔

کیا کوئی یہ تصور کر سکتا ہے کہ آپ نے نعمت ملنے پر شکر نہ کیا ہوگا؟ آپ تو فرماتے ہیں:

اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا ۔ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں ؟

جب آپ شکر گزار رہیں، تو یقیناً بقیناً نعمت میں اضافہ ہوگا، نہ کہ نعمت واپس لے لی جائے ۔ ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ ادراک ہمیشہ کے لئے ہوتا تھا، اور ہمیشہ کے لئے ہے ۔ نیز قرآن کریم میں اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ قیامت کے دن رسول تمہارے حق میں گواہ ہوں گے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تمام اُمت کے گواہ ہیں، اس لئے ضروری ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت تک کے تمام اُمتیوں اور اُن کے احوال و اعمال کو دیکھ کر گواہی دیں گے ۔ گو گواہی اگرچہ سُن کر بھی دی جاتی ہے، لیکن گواہی میں اصل یہ ہے کہ دیکھ کر گواہی دی جائے اور کامل گواہ وہی ہوتا ہے جو واقعہ کو دیکھ کر گواہی دے ۔ الحمد للہ! وہ ایسے گواہ ہیں کہ روزِ محشر اپنی امت کی گواہی دیں گے ۔ آخرت میں انبیاء سابقین کی گواہی دیں گے ۔ میدانِ محشر میں جب کفار انبیاء کرام علیہم السلام کی ہر حجت و دلیل کا انکار کر دیں گے، تو انبیاء کرام علیہم السلام کا واحد سہارا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہوگی ۔ کیسا عجیب وقت ہوگا، جب کفار نبیوں کو جھٹلائیں گے اور سب نبیوں کی نگاہیں آپ کے چہرۂ اقدس کی طرف لگی ہوئی ہوں گی ۔ اس وقت حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اٹھیں گے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں گواہی دے کر

ان کی صداقت پر مُہر لگا دیں گے۔ مولیٰ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؕ

وہ کیسا سماں ہوگا، جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور ان تمام گواہوں پر آپ کی شہادت لائیں گے۔

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ گواہی سُن کر بھی ہو جاتی ہے، جب آپ نے خُدا تعالیٰ کی ذات و صفات کی گواہی دیکھ کر دی ہے، تو امت کے احوال کو دیکھ کر گواہی دیں گے۔

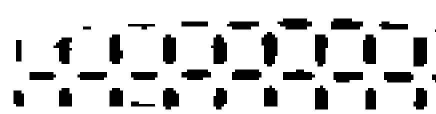
حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

ترجمہ: "یعنی تمہارے رسول تمہارے اوپر گواہ ہیں، کیونکہ وہ نورِ نبوّت سے ہر دیندار کے دین پر مطلع ہیں کہ وہ میرے دین کے کس درجہ پر پہنچا ہوا ہے اور اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے اور جس حجاب کی وجہ سے وہ دین میں ترقی نہ کر سکا وہ کون سا ہے؟ پس وہ تمہارے گناہوں اور ایمان کے درجات اور تمہارے اچھے بُرے اعمال اور اخلاص و نفاق کو پہچانتے ہیں۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے گواہ ہونے کی بحث میں یہ بات بالکل بے غبار ہو کر سامنے آ گئی کہ حضور رحمتِ عالم، رسولِ محتشم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں ہر چیز کو ہر جہت سے دیکھنے کی صفت دائمی تھی۔ وہ جب حیاتِ ظاہری سے اس کائنات پر جلوہ افروز تھے، اُس وقت بھی سب کو دیکھ رہے تھے اور اب جبکہ قبرِ انور میں ہیں، اب بھی سب کو ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

هٰكَذَا فِیْ شَرْحِ مُسْلِمٍ لِلسَّعِیْدِیْ۔

هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔



رکوع و سجود میں امام سے پہلے سر اٹھانے کی ممانعت

حَدِیث ۲۷: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَمَا یَخْشٰی اَحَدُکُمْ اَوْ اَلَا یَخْشٰی اَحَدُکُمْ اِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ قَبْلَ الْاِمَامِ اَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ رَأْسَهٗ رَأْسَ حِمَارٍ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ صُوْرَتَهٗ صُوْرَةَ حِمَارٍ۔ (بخاری جلد اوّل ص۹۶، مسلم جلد اول ص۱۸۱)

حلّ لغات اَمَا یَخْشٰی: کیا ڈرتا نہیں ہے؟ اَحَدُکُمْ: تم میں سے کوئی ایک۔ حِمَارٍ: گدھا۔

ترجمہ: "حضرت سیدنا ابوہریرہ[۱] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی شخص ڈرتا نہیں کہ جب وہ اپنا سر امام سے پہلے اٹھائے، تو اللہ تعالیٰ اس کا سر گدھے جیسا کردے یا اُس کی صورت گدھے کی صورت جیسی کردے۔"

تشریح اِس حدیث میں امام سے پہلے سر اٹھانے کی ممانعت کا بیان ہے اور امام بخاری نے باب کا عنوان باندھا ہے: "امام سے پہلے سر اٹھانے کے گناہ کا بیان"۔ جب اس میں وعید شدید ہے۔ تو معلوم ہوا امام کا تقدم گناہ ہے۔ یہ حدیث مختلف الفاظ سے صحاح ستہ میں مذکور ہے۔ بعض گدھے کے سر کی طرح، بعض میں گدھے کی صورت کی طرح، بعض میں کتے کے سر کی طرح ان روایات کو بعض نے مجاز پر محمول کیا ہے کہ گدھے کی طرح اس کی بلادت وحماقت

[۱] آپ کے حالات حدیث ۹ کے حاشیہ پر دیکھے جائیں۔ ۱۲ منہ

ہے اور جاہل ہے نماز کے فرائض سے اور امام کی متابعت کے حکم سے جس طرح گدھے میں سوجھ بوجھ کم ہوتی ہے اور عناد کی عادت ہے، کیونکہ اس کا حال یہ ہے جب اس کو کھینچا جاتے تو غمگین ہوتا ہے اور جب اس کو روکا جائے تو چھلانگیں لگاتا ہے قائد و حابس کی موافقت نہیں کرتا، ایسا ہی حال ہے امام کی موافقت نہ کرنیوالوں کا۔ لیکن فتح الباری اور عمدۃ القاری میں ہے کہ بہتر یہ ہے کہ حدیث کو اپنے ظاہر حال پر محمول کیا جائے، کیونکہ اس میں یہ لفظ ہیں کہ کیا وہ ڈرتا نہیں ہے کہ اس کی شکل تبدیل ہو جائے۔ اگر بلادت و حماقت میں تشبیہ مقصود ہو تو پھر اس طرح ہونا چاہیے تھا کہ اس کا سر گدھے جیسا ہے یا اس کی صورت گدھے جیسی ہے۔

لیکن جب حدیث کو ظاہر پر محمول کیا جائے گا، تو سوال واقع ہوگا کہ اس امت میں مسخ نہیں ہے یعنی شکل کا تبدیل ہونا، تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ جو مسخ نہ ہونے کا حکم ہے وہ عمومی طور پر، یعنی سب کی شکل تبدیل کر دی جائے، ایسا نہ ہوگا کسی کی شکل کا تبدیل ہو جانا اس کے منافی نہیں ہے اور اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ ضرور اس کی شکل تبدیل ہی ہو جائے گی، بلکہ یہ کام ایسا ہے کہ اس کا فاعل مستحق ہے اور اس کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں اس کی شکل تبدیل نہ کر دی جائے، کسی فعل کا ممکن ہونا اس کے وقوع کو مستلزم نہیں ہے، کیونکہ ہر وعید خدا تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، چاہے عذاب کو مؤخر فرمادے اور چاہے معاف فرمادے۔ کلیۃً مسخ کی ممانعت کا ذکر بھی نہیں ہے، بلکہ حدیث میں ہے: سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ اس امت کے آخر میں مسخ (شکل کا تبدیل ہو جانا) خسف (زمین میں دھنس جانا) اور قذف ہوگا۔ آپ کے علاوہ بھی کئی صحابہ کرام علیہم الرضوان سے مروی ہے۔ (کذا فی العینی)

حدیث کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت میں اس کو یہ عذاب ہوگا۔ مجازی معنیٰ نہ لینے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعض روایات میں کتے کی طرح کا بیان ہے اور کتا وصف

بلادت وحماقت کے ساتھ متصف نہیں کیا جاتا۔ جزوی مسخ کے وقوع پر یہ بھی دلیل ہے، اہل تشیع کی ایک جماعت جو صحابہ کرام کو سبّ وشتم (گالی گلوچ) کرتی تھی، اُن کو گدھے اور خنزیر کی شکلوں میں تبدیل کر دیا گیا اور ماں باپ کا نافرمان اور اُن کو گدھا، خنزیر اور کلب کہہ کر پکارنے والے کی شکل تبدیل ہو گئی۔ (کذا فی عمدۃ القاری)

لہٰذا حدیث اپنے ظاہر پر محمول کرنی چاہیے اور امام سے تقدم کرنے والے کو ڈرتے رہنا چاہیے کہیں اس کی شکل تبدیل نہ کر دی جائے۔ فتح الباری والوں نے لکھا ہے کہ اس کا سبب مقتدی کا جلدی کرنا ہے، اس کا علاج یہ بتایا ہے کہ اس کو اپنے قلب کو حاضر کرنا چاہیے کہ آخر سلام تو امام کے ساتھ ہی پھیرنا ہے، تو پھر رکوع و سجود میں امام سے پہلے سر اٹھانے کا کیا فائدہ؟

مسائل اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ امام کی متابعت لازم ہے اور اس سے افعال میں تقدم ناجائز، گناہ اور مکروہ تحریمی ہے، بلکہ بعض ائمہ کے نزدیک اس کو نماز دہرانا ہو گی۔ بہر حال اس کی نماز ناقص ہو گی جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، تو اُس نے آپ سے پہلے رکوع کیا اور پہلے ہی رکوع سے سر اٹھا لیا، تو جب آپ نماز سے فارغ ہوئے، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اس طرح کرنے والا کون تھا؟ تو اس شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) میں تھا، تو آپ نے فرمایا:

اِتَّقُوْا خِدَاجَ الصَّلٰوۃِ اِذَا رَکَعَ الْاِمَامُ فَارْکَعُوْا وَاِذَا رَفَعَ الْاِمَامُ فَارْفَعُوْا (عمدۃ القاری)

ناقص نماز سے بچو۔ جب امام رکوع کرے تو تم کرو، جب امام سر اٹھائے، تو تم سر اٹھاؤ۔

اس میں حضور سیدِ عالم نبی مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمال شفقت کا بیان ہے اپنی اُمت کے ساتھ اور احکام کا بیان، اور اس کا بیان ہے جس پر ثواب کے خفا کا

مترتب ہے، اور اس میں وعید شدید کا بیان ہے، جو امام سے قبل سر اُٹھائے۔
سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا جو امام سے پہلے افعال
کر رہا تھا، تو آپ نے اس کو فرمایا: لَا وَحْدَكَ صَلَّيْتَ وَلَا بِإِمَامِكَ اقْتَدَيْتَ
"نہ تو نے اکیلے نماز پڑھی اور نہ تو نے امام کی اقتدا کی۔"

بلکہ امام احمد علیہ الرحمہ تو یہ فرماتے ہیں کہ اس کی نماز ہی نہیں ہے، کیونکہ اگر نماز ہوتی، تو ثواب کی اُمید ہوتی، ایسی نماز پر تو عقاب کا ڈر ہے۔

ایک روایت میں ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ مَرْفُوْعًا اَلَّذِیْ یَخْفِضُ وَیَرْفَعُ قَبْلَ الْاِمَامِ اِنَّمَا نَاصِیَتُهٗ بِیَدِ شَیْطَانٍ۔

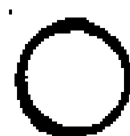
سیدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعًا روایت ہے، جو امام سے پہلے رکوع و سجود میں جاتا ہے یا سر اُٹھاتا ہے، اِس کے سر کے بال شیطان کے ہاتھ میں ہیں۔

(فتح الباری جلد دوم ص۱۵۲)

اِن روایات سے ثابت ہوا کہ مقتدی کو امام کی متابعت کرنی چاہیے یعنی تمام افعال و اقوال میں امام کے پیچھے پیچھے اور اس کی اقتداء اور پیروی میں نماز ادا کرنی چاہیے، خاص کر تکبیر تحریمہ اور کسی نے امام کی تکبیر سے پہلے کہہ لی، تو اس کی اقتداء درست نہ ہوگی، اور نماز نہ ہوگی۔

بعض حضرات نے اس حدیث کو تناسخ کے جواز پر دلیل بنایا ہے۔ یہ ان کے دعویٰ کی دلیل نہیں ہو سکتی، اس میں بطورِ عذاب مسخ کا بیان ہے نہ کہ تناسخ کا اور اُن کا یہ مذہب مردود ہے بغیر دلیل و بُرہان کے باطل دعاوی پر مبنی ہے۔

کذا فی عمدۃ القاری، (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب!)



نماز میں صفیں سیدھی کرنا

حدیث ۲۸: عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَوُّوا صُفُوْفَكُمْ فَاِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَةِ الصَّلٰوةِ۔

(بخاری جلد اوّل ص۹۶، مسلم جلد اوّل ص۱۸۱)

حلِ لغات: سَوُّوا: سیدھی کرو تم۔ صفوف: جمع ہے صَف کی، (یعنی اپنی صفوں کو)

ترجمہ: "سیدنا انس[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنی صفیں سیدھی رکھو کیونکہ صفوں کو سیدھی رکھنا نماز کو قائم کرنے سے ہے۔"

تشریح اس حدیث میں نماز میں صفوں کے درست اور سیدھی رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ تسویۃ الصفوف کا معنی یہ ہے: نماز میں ایک سمت پر برابر کھڑا ہونا، کوئی بھی آگے پیچھے نہ ہو اور درمیان میں خالی جگہ نہ چھوڑنا بھی تسویۃ الصفوف سے ہے۔ بعض روایات میں اقیموا صفوفکم ہے۔ اس کا معنی بھی یہی ہے، یعنی صفوں کو سیدھی رکھنا۔ اس حدیث کے ماقبل امام بخاری نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی، اس میں ہے کہ اقامتِ صَف، یعنی نماز میں صَف سیدھی رکھنا نماز کا حُسن ہے۔ بعض روایات میں من تمام الصلوٰۃ ہے، یعنی نماز کے پورا ہونے سے ہے اور یہ روایت مختلف الفاظ، مختلف اسناد سے مروی ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اقامتِ صلوٰۃ کے بعد لوگوں کی طرف

---

[1] آپ کے حالات حدیث ۶ کے حاشیہ پر دیکھے جائیں۔ ۱۲ منہ

متوجہ ہو کر فرمایا:

لَتُسَوُّنَّ صُفُوفَكُمْ اَوْلَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوهِكُمْ۔ (بخاری) تم اپنی صفوں کو ضرور سیدھا کرو گے' یا اللہ تعالیٰ تمہارے چہرے بدل دے گا

اس میں وعید شدید ہے، صفیں سیدھی نہ کرنے میں چہروں کے بدلنے کا خطرہ ہے۔ بعض نے اس حدیث کو اپنے ظاہر پر محمول کیا ہے، یعنی صفیں سیدھا نہ کرنے کے جرم میں چہرے حقیقۃً بدل دیئے جائیں گے، چہرے کو پچھلی جانب کر دیا جائے گا، جیسا کہ امام کی مخالفت پر وعید فرمائی گئی کہ اس کا سر گدھے کی طرح کر دیا جائے گا اور یہ سزا دنیا میں بھی ہو سکتی ہے اور آخرت میں بھی اور مسئلہ ہے کہ تمام وعیدات کا نفاذ مولیٰ تعالیٰ کی مشیت پر ہے چاہے وہ عذاب میں مبتلا فرمادے اور چاہے اپنے فضل وکرم سے معاف فرمادے۔ معلوم ہوا کہ صفیں سیدھی نہ کرنا بہت بڑا جرم ہے' اور چہروں کے بدلنے کا خطرہ ہے' اور یہ وعید اُس کے لئے ہے' جو صفیں سیدھی نہ کرے' اس میں بیان ہے جیسا جرم ویسی سزا کا جرم ہے کھڑے ہونے مخالفت' یعنی آگے پیچھے کھڑے ہونا اور سزا بھی چہرے میں مخالفت' یعنی چہرے کو پیچھے کی طرف کر دینا، اس کو ظاہر پر محمول کرنے کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں لفظ ہیں اولتطمسن الوجوہ یعنی چہرے مسخ کر دیئے جائیں گے، اگرچہ اس کی سند ضعیف ہے۔

شارح مسلم امام نووی علیہ الرحمہ نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارے درمیان عداوت اور بغض اور دلوں میں مخالفت پیدا فرمادے گا، جیسا کہ محاورہ ہے:

تَغَيَّرَ وَجْهُ فُلَانٍ عَلَيَّ۔ یعنی "فلاں کی جانب سے مجھے کراہت (ناپسندیدگی) ظاہر ہوتی ہے"۔ اس لیے کہ صفوں میں مخالفت' ظاہری مخالفت ہے اور ظاہری مخالفت' باطن کے اختلاف کا سبب ہوتی ہے، یعنی قلبی مخالفت اِس کی تائید ابوداؤد کی روایت ہے' جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

اَوْ لِيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں مخالفت ڈال دیگا۔

ہمارا حال آجکل اولاً تو اکثر لوگ نماز ہی نہیں پڑھتے، جو کہ ایمان کے بعد تمام فرائض سے اہم فریضہ ہے، اور جو پڑھتے ہیں، ان میں اکثر جماعت کا خیال نہیں رکھتے اور جماعت کا اہتمام نہیں کرتے، جبکہ جماعت سنّتِ مؤکدہ ہے اور واجب کے قریب۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا حکم ہے:

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ "یعنی نماز با جماعت ادا کرو۔"

اور جو جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں، تو صفوں کے سیدھا رکھنے اور صفوں کے درمیان خالی جگہ نہ چھوڑنے کا خیال نہیں فرماتے، کوئی آگے کھڑا ہوتا ہے کوئی پیچھے، ابھی اگلی صف میں جگہ باقی ہوتی ہے، تو پھر پچھلی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص جن مساجد میں قالین وغیرہ ڈالے ہوئے ہوتے ہیں، اس میں خاص کر صفوں کو سیدھا رکھنے کا خیال بہت کم ہوتا ہے، ایسے ہی گرمیوں میں پنکھے وغیرہ کی لالچ پر آگے جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے اور سردیوں دھوپ وغیرہ کی لالچ میں خالی جگہ چھوڑ دی جاتی ہے حالانکہ اگلی صف میں جگہ ہوتے ہوئے پیچھے کھڑا ہونا مکروہ ہے اور خالی جگہ کو پُر کرنا بہت اہم اور لازم ہے، حتیٰ کہ حکم ہے کہ نمازیوں کی گردن پھلانگ کر بھی اگلی صف کو پورا کرنے کے لئے آگے جانا پڑے، پھر بھی جائے اور صف کو پورا کرے۔

حدیث سے مسائل اس حدیث میں حکم ہے صفیں سیدھی کرنے کا، یہ امامِ اعظم، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک نماز کی سنّت ہے اور ابنِ حزم کا زعم ہے کہ یہ واجب ہے، کیونکہ آپ نے فرمایا اقامتِ صلوٰۃ سے ہے اور اقامتِ صلوٰۃ فرض و واجب ہے اور جو فرض سے ہو وہ بھی فرض ہوتا ہے، لیکن یہ دلیل اُن کی کمزور ہے، کیونکہ بعض روایات میں حُسنِ صلوٰۃ سے ہے اور بعض روایات میں تمام صلوٰۃ سے۔

جب روایات میں اختلاف ہے، تو وجوب پر دلالت نہ ہوگی علامہ عینی فرماتے ہیں:
لَاخِفَاءَ اَنَّ تَسْوِیَۃَ الصَّفِّ لَیْسَتْ مِنْ حَقِیْقَۃِ الصَّلٰوۃِ اِنَّمَا
ھِیَ مِنْ حُسْنِھَا۔ یعنی مخفی نہ رہے کہ نماز میں صف سیدھی کرنا نماز کے ارکان سے
نہیں ہے، بلکہ نماز کا حُسن اور اُس کا کمال ہے مجاہے واجب ہو یا سنّت یا مستحب
تاہم شارح بخاری بدرالدین عینی علیہ الرحمہ نے فرمایا: تسویۃ الصفوف کا حکم بصیغہ امر ہے
اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے، خصوصاً جبکہ وعید کے ساتھ مقرون ہو، لہٰذا حدیث
سے ثابت ہوتا ہے کہ نفس تسویۃ الصفوف واجب ہے لیکن نماز کے واجبات سے نہیں
ہے، یعنی صف سیدھی نہ کرنا ترکِ واجب ہے اور سخت گناہ ہوگا اگرچہ نماز ہو جائے
اور نماز کا اعادہ لازم نہ ہوگا، اس کی تائید میں وہ حدیث بھی ہے جو سیّدنا حضرت انس
رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ مدینہ منورہ میں آئے تو اصحاب نے سوال کیا
کہ آپ ہم سے کونسی شے منکر، یعنی خلافِ شرع امر دیکھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:
اور تو کچھ بھی نہیں، صرف تم نماز میں صفیں نہیں سیدھی کرتے ۔ !

پھر حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس معاملے میں بہت سختی فرماتے۔
آپ ایک شخص کے ذمہ لگاتے کہ وہ پہلے صفیں درست کرے ۔ جب وہ کہتا کہ صفیں
درست ہو گئیں، تب وہ نماز شروع فرماتے اور حضرت علی اور حضرت عثمان غنی
رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے کہ آپ بھی صفوں کی درستگی کا بہت خیال
فرماتے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے اے فلاں آگے ہو اور اے فلاں تو پیچھے
ہو۔ بہرحال صفیں درست اور سیدھی کرنا بہت اہم مسئلہ ہے، والنّاس عنہا غافلون۔
ایک مسئلہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام نماز کی اقامت کے بعد لوگوں سے بات
کرسکتا ہے، جیسا کہ روایت میں آیا کہ حضور سید عالم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اقامت کے
بعد لوگوں کی طرف متوجّہ ہو کر صفوں کے درست کرنے کا حکم فرمایا۔

اور یہ بھی ثابت ہوا کہ امام کو مقتدیوں کی نماز کا خیال رکھنا چاہیے اور اُن کو مسائل سے آگاہ کرنا چاہیے اور نماز شروع کرنے سے پہلے صفوں کو درست کر لینا چاہیے، جیسا کہ سیّدنا عمر و سیّدنا عثمان و سیّدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے افعال سے مروی ہے۔ بلکہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَوِّي صُفُوْفَنَا اِذَا قُمْنَا لِلصَّلٰوةِ وَاِذَا اسْتَوَيْنَا كَبَّرَ لِلصَّلٰوةِ۔

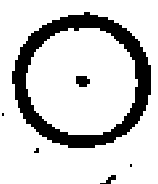
(ابوداؤد، بحوالہ جلد ۵، ص۲۵۴)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو درست فرماتے۔ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہوتے۔ جب ہم درست کھڑے ہو جاتے تو آپ نماز کی تکبیر فرماتے۔

یہ بھی مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق اور حضرت بلالِ حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہما صف درست نہ ہونے پر تعزیر فرماتے، یعنی مارتے تھے۔

لہٰذا ان روایات سے ثابت ہوا کہ امام صاحب کی بھی ذمہ داری ہے کہ پہلے صفیں درست اور سیدھی کروائے، پھر نماز شروع کرے۔ بلکہ مسجد میں ایسا انتظام کیا جائے کہ صف خود بخود سیدھی ہو، صفیں سیدھی بچھائی جائیں۔ اگر قالین ہو تو صف کے قائم ہونے کی جگہ لکیر کھینچی جائے اور انتظام ہونے کے بعد بھی خیال رکھا جائے، کیونکہ لوگ پھر بھی کوتاہی کرتے ہیں۔ نمازیوں کی ایسی تربیت کی جائے کہ انہیں خود ہی اس کی اہمیت کا احساس پیشِ نظر رہے۔

هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ بِحَقِيْقَةِ الْحَالِ عِلْمُهٗ اَجَلُّ وَاَتَمُّ۔



امام کا نماز خفیف پڑھانا اور مقتدیوں کا خیال رکھنا

حدیث ۷۹: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ لِلنَّاسِ فَلْیُخَفِّفْ فَاِنَّ مِنْهُمُ الضَّعِیْفَ وَالسَّقِیْمَ وَالْکَبِیْرَ وَاِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ لِنَفْسِهٖ فَلْیُطَوِّلْ مَا شَآءَ۔

(بخاری جلد اول ص۹۷، مسلم جلد اول ص۱۸۸)

حلِ لغات فَلْیُخَفِّفْ: تخفیف کرے۔ اَلضَّعِیْف: کمزور۔ سَقِیْم: بیمار۔ اَلْکَبِیْر: بوڑھا۔ فَلْیُطَوِّلْ: لمبا کرے۔

ترجمہ: ”سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو تخفیف کرے (یعنی زیادہ لمبی نماز نہ پڑھائے) اور جب تم میں سے کوئی تنہا نماز پڑھے تو جس قدر چاہے لمبی کرے۔“

تشریح اس مضمون کی احادیث بخاری و مسلم نے متعدد تخریج فرمائی ہیں، اور بیہقی و طبرانی کی بعض روایتوں میں ”والصغیر والکبیر“ اور بعض میں ”والحامل والمرضع“ ہے، اور ایک روایت میں ”العابر السبیل“ کے الفاظ بھی مروی ہیں صغیر و کبیر، چھوٹا بڑا، حامل، مرضع، حمل والی، دودھ پلانے والی۔ العابر السبیل۔ مسافر۔ مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی شخص امامت کرائے، تو ارکان کے اتمام اور تعدیل کا خیال رکھتے ہوئے نماز میں تخفیف کرے، کیونکہ نمازیوں میں کوئی کمزور، بوڑھا، بیمار، حاملہ، دودھ پلانے والی۔ العابر السبیل (یعنی مسافر)، ضرورت والا ہو سکتا ہے اور اس کو

لہ آپ کے حالات حدیث ۹ کے حاشیہ میں پڑھیں۔ ۱۲ منہ

لمبی نماز پڑھانے میں تکلیف محسوس ہوگی، اسی لئے آپ نے سیدنا معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تطویل نماز سے سختی سے منع فرمایا، آپ عشاء کی نماز مسجد بنی سلمہ میں پڑھاتے تھے۔ تو آپ نے لمبی سورۃ شروع فرمائی۔ بعض روایات میں ہے بقرہ بعض میں ہے: اقتربت الساعۃ۔ بعض میں سورۃ النساء کا ذکر ہے۔ بہرحال جب آپ نے لمبی سورۃ پڑھنی شروع فرمائی۔ ایک شخص جماعت سے الگ ہوگیا اور اس نے اکیلے نماز ادا کی۔ جب سیدنا معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پتہ چلا، تو آپ نے اس کا ذکر سخت الفاظ سے کیا اور کہا کہ وہ منافق ہے۔ اصحابِ معاذ نے اس کو پوچھا: کیا تو منافق ہوگیا کہ تو نے تنہا نماز پڑھی ہے۔ اس نے کہا نہیں، تو۔ اس شخص نے حضور سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت کی کہ ہم دن کے کام کاج میں تھکے ماندے ہوتے ہیں۔ بعض نے باغ میں پانی لگایا ہوا ہوتا ہے اس کو بند کرنا ہوتا ہے بعض نے پانی لگانا ہوتا ہے، تو آپ نے حضرت معاذ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو فرمایا: فتان، فتان یا فرمایا فاتنا، فاتنا، فاتنا (راوی کو شک ہے) مفہوم یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: تو لوگوں کو مشکل میں ڈالتا ہے اور تین دفعہ فرمایا اور ان کو سمجھایا کہ نماز میں تخفیف کرے اور اوساط مفصل سے سورتیں پڑھا کرے۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے کہ آپ فجر کی نماز مسجدِ قبا میں پڑھا رہے تھے۔ تو آپ نے ایک لمبی سورۃ پڑھنی شروع کردی، تو ایک انصار کا لڑکا نماز باجماعت سے الگ ہوگیا، تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس نوجوان پر ناراض ہوئے، تو آپ اس لڑکے کی شکایت لے کر سرکار (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پاس گئے اور وہ لڑکا آپ کی شکایت لے کر سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس گیا، تو بیان سن کر آپ سخت غضب ناک ہوئے اور آثارِ غضب چہرۂ مبارک سے نمودار ہوئے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ فَاِذَا صَلَّيْتُمْ فَاَوْجِزُوْا فَاِنَّ خَلْفَكُمُ الضَّعِيْفَ وَالْكَبِيْرَ وَالْمَرِيْضَ وَذَا الْحَاجَةِ -

بے شک بعض تمہارے نفرت میں ڈالنے والے ہیں - جب نماز پڑھاؤ تو اختصار کرو، کیونکہ تمہارے پیچھے کمزور، بوڑھے بیمار اور حاجت مند بھی ہوتے ہیں -

بخاری شریف میں اشد غضب کے الفاظ ہیں - فتح الباری والے لکھتے ہیں کہ آپ کے شدید غضب کی وجہ سے یا تو نصیحت کی مخالفت ہے یا جس امر کا سیکھنا ضروری ہے اس کے تعلّم (سیکھنے) میں کوتاہی کی وجہ سے، اور یہ بھی احتمال ہے مسئلہ کی اہمیت کی وجہ سے اظہار غضب ہوا تاکہ مسئلہ توجہ سے سنا جائے اور پھر اس طرح نہ کہا جائے بہر حال ثابت ہوا کہ امام کو مقتدیوں کا لحاظ کرتے ہوئے نماز میں تخفیف کرنی چاہیئے، لیکن یہ ضروری ہے ارکان نماز کے اتمام اور تعدیل کا لحاظ ضرور رکھے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ایک شخص جلدی جلدی اور تعدیل ارکان کے نماز پڑھی، تو آپ نے اس کو دوبارہ نماز پڑھنے کا فرمایا، لہٰذا تمام ارکان صحیح ادا کرے، لمبی قرأت نہ کرے، بہت زیادہ لمبی رکوع و سجود کی تسبیحات نہ پڑھے - جب تنہا نماز پڑھ رہا ہو، تو جس قدر چاہے قرأت کرے اور جتنی چاہے تسبیحات پڑھے اور جتنی چاہے لمبی نماز پڑھے، لیکن آجکل اس کے برعکس ہوتا ہے - بعض ائمہ نماز جماعت میں تطویل کرتے ہیں اور جب اکیلے پڑھتے ہیں، تو تخفیف کرتے ہیں اور بعض ائمہ اتنی تخفیف کرتے ہیں کہ تعدیل کا بھی لحاظ نہیں رکھتے، اس طرح نہ ہونا چاہیے - نماز میں تخفیف بھی کریں اور تعدیل ارکان بھی کریں -

افراط و تفریط کے درمیان نہ بہت لمبی نماز پڑھائیں اور نہ ہی بہت مختصر - ہمارے اسلاف نماز با جماعت میں بقدر ضرورت تخفیف فرمایا کرتے تھے - حضرت ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز عشاء پڑھی، آپ نے مختصر نماز پڑھائی - حضرت سعد رضی اللہ عنہ جب نماز پڑھاتے تو رکوع و سجود

میں تخفیف فرماتے اور گھر میں اکیلے پڑھتے تو رکوع و سجود لمبا کرتے۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ خفیف نماز پڑھاتے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رکوع و سجود پورا کرتے ہوئے نماز مختصر پڑھاتے۔ آپ کو عرض کیا گیا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ایسے ہی تھی، تو آپ نے فرمایا: ہاں! جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ زخمی ہوئے تو حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نمازِ فجر دو مختصر سورتوں یعنی سورۂ کوثر اور سورۂ نصر سے پڑھائی۔ ان آثار کو عینی نے بحوالہ ابن ابی شیبہ شرحِ بخاری میں نقل فرمایا۔

لہٰذا جب امام کو معلوم ہو کہ نمازیوں کوئی سخت بیمار ہے یا ضرورت مند ہے، تو رکوع و سجود کے اتمام کا لحاظ رکھتے ہوئے مختصر قرآت سے نماز پڑھا دے۔

اِس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امورِ دُنیا کی حاجت بھی ایک عذر ہے۔ نمازِ خفیف ہی پڑھائے۔ آج کل کے دور میں ہر شخص بے حد مصروف ہے اور کاروبار میں انتہائی مشغول ہے۔ ائمہ مساجد کو چاہیے کہ ان امور کا خاص خیال رکھیں، جو وقت مقرر کیا ہوا ہے بروقت نماز پڑھائیں۔ چند منٹ پہلے مسجد میں آجائیں اور مقررہ وقت پر نماز پڑھائیں اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچ جائیں گے۔ لوگ معمولی تاخیر بھی برداشت نہیں کرتے۔ اگر کسی وقت ایسا ہو جائے کہ امام نے تاخیر سے نماز پڑھائی تو اگر کسی نے تنقید کر دی، تو ان روایات کو سامنے رکھ کر حلم و حوصلہ کے ساتھ برداشت کرے۔

یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ بعض دفعہ حضور سیدِ دوعالم، شفیعِ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ مغرب سورۃ اعراف (سوا پارہ)، سورۃ انعام (پون پارہ) بھی پڑھی، یعنی نمازِ مغرب میں تقریباً دو پارے پڑھے، جبکہ نماز مغرب کا وقت بھی کم ہوتا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا اعجاز تھا کم وقت میں آپ زیادہ پڑھ لیتے تھے۔

اور مُلا علی قاری علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی قرأت اور آپ کے پیچھے نماز پڑھنے میں صحابہ کرام کو اس کیف و سُرور آتا تھا کہ کمزوروں کو اپنی کمزوریاں بھُول جاتی تھی۔ بیماروں کو اپنا مرض بھُول جاتا تھا اور ضرورتمندوں کو اپنے کام بھُول جاتے تھے، اور اُن کی آرزو یہ ہوتی تھی کہ اگر ہماری عمر قیامت تک بھی ہو، تو وہ ساری عمر حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا میں ایک رکعت پڑھنے میں گزر جائے۔

اور کچھ عجب نہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی برکت سے کمزوروں کی کمزوری جاتی رہی ہو اور مریضوں کی بیماری ختم ہوگئی ہو، اور حاجت مندوں کے کام بن جاتے ہوں، کمزور ان کے پیچھے نماز پڑھتے ہوں، تو توانا بن کر نکلتے ہوں، بیمار صحت یاب ہوں، اور ضرورت مندوں کے کام بن جاتے ہوں۔ (بحوالہ شرح مسلم جلد اوّل للسعیدی صـ۶۶۰)

تاہم آپ اس طرح کبھی کبھی فرماتے تھے۔ عام عادتِ مبارکہ نماز میں تخفیف ہی تھی معلوم ہوا کہ مقتدیوں کی رعایت سے نماز میں قرأت کم کرنا نہ صرف جائز، بلکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنّتِ مُبارکہ اور آپ کو پسند بھی ہے۔

هٰذا ما عندی، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اعضأ سجدہ کا بیان

حدیث ۳۰: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ اُمِرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّسْجُدَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَعْضَاءٍ وَلَا یَکُفَّ شَعَرًا وَلَا ثَوْبًا اَلْجَبْھَۃِ وَالْیَدَیْنِ وَالرُّکْبَتَیْنِ وَالرِّجْلَیْنِ۔

(بخاری جلد اوّل صـ۱۱۲، مُسلم جلد اوّل صـ۱۹۳)

حلِّ لُغات: اُمِرَ: حکم دیئے گئے۔ لَا یَکُفَّ: نہ لپیٹے۔ اَلْجُبْھَۃِ: پیشانی
رُکْبَتَیْنِ: دونوں زانو، رِجْلَیْنِ: دونوں پاؤں۔

ترجمہ: "حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ سات اعضاء پر سجدہ فرمائیں اور بالوں کو نہ لپیٹیں اور نہ ہی کپڑے کو اکٹھا کریں، وہ سات اعضاء پیشانی۔ دونوں ہاتھ، دو گھٹنے، اور دونوں پاؤں ہیں۔"

تشریح: اِس حدیث میں سات اعضاء پر سجدہ کا حکم ذکر ہوا اور اس کے بعد والی حدیث میں سات ہڈیوں پر کا لفظ ہے۔ اِن ہڈیوں سے مُراد بھی وہ ہی اعضاء ہیں، جو اوپر والی حدیث میں مذکور ہوئے۔ اور اس حدیث میں لفظ اُمِرَ اور بعد والی حدیث میں لفظ اُمِرْنَا ہے۔ جس سے معلوم ہوا صِرف یہ حکم آپ کے لئے ہی نہیں، بلکہ آپ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی اُمت کے لئے بھی ہے، ویسے بھی جو حکم آپ کے لئے ہو، وہ آپ کی اُمّت کے لئے بھی ہوتا ہے۔ جب دلیل خصوص نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ سجدہ میں سات اعضاء چہرہ، دونوں ہاتھ، دونوں زانو، دونوں پاؤں لگانے کا حکم ہے۔ اِن اعضاء میں سے اگر کوئی عضو نہ لگا، تو سجدہ ناقص ہوگا اور نماز ناقص ہوگی۔ اِس حدیث میں کَفِّ ثَوْب اور شعر (بال) کی ممانعت کا بھی حکم ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اِختلافِ ائمہ: امام احمد[1] اور اسحاق نے اِس حدیث سے استدلال کیا ہے اگر اعضاء سبعہ سے کسی عضو پر سجدہ کرنا ترک کر دیا تو وہ سجدہ کفایت نہ کرے گا اور سجدہ ادا نہ ہوگا اور یہی امام شافعی کا اصح قول ہے۔[2]

---

[1] ان کے حالات، حدیث ۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

[2] عینی شرح بخاری، جلد ۶، ص ۹۰

اِس حدیث میں ناک کا ذکر نہیں ہے اور ایک حدیث میں ناک کا بھی ذکر ہے۔
اِس میں اختلاف ہے کہ ناک کا لگانا بھی سجدہ میں فرض ہے یا نہیں؟ تو ایک گروہ نے فرمایا ہے جب پیشانی پر سجدہ کیا اور ناک نہ لگایا تو بھی کافی ہوگا، یعنی سجدہ کا فرض ادا ہو جائے گا اور یہ مذہب ابنِ عمر اور عطاء اور حسن اور ابن سیرین اور دیگر کثیر فقہائے سے مروی ہے اور ایک گروہ نے فرمایا کہ اگر ناک پر سجدہ کیا اور ماتھا نہ لگایا تو بھی کافی ہوگا اور یہ قول ہے امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جیسا کہ ہدایہ اور اُس کی شرح فتح القدیر میں ہے کہ امامِ اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک پیشانی اور ناک میں سے ایک پر اختصار جائز ہے، کیونکہ مشہور روایت میں جبہۃ کی جگہ وجہہ کا لفظ ہے، اور مکمل چہرہ تو بالاتفاق مراد نہیں ہے، بلکہ بعض حصہ چہرہ کا اور ٹھوڑی اور رخسار بالاتفاق خارج نہیں، باقی ناک اور پیشانی میں سے ایک پر سجدہ کفایت کرے گا اور فرض ادا ہو جائے گا، لیکن صاحبین کے نزدیک سجدہ میں دونوں یعنی پیشانی اور ناک لگانا ضروری ہیں۔ بلا عذر اگر ایک پر اختصار کیا، تو کافی نہ ہوگا، لیکن صاحب فتح القدیر نے اس قول سے اختلاف کیا ہے اور نہایہ شرح ہدایہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ پیشانی لگانے سے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فرض ادا ہو جائے گا۔ صرف صاحبین کا اختلاف ہے کہ بلا عذر ناک پر اختصار کرنا جائز نہیں ہے، ہاں عذر کے وقت تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ناک پر اختصار بلا کراہت جائز ہوگا اور بلا عذر صرف ناک لگانا امام صاحب کے نزدیک اگرچہ کافی ہے، لیکن شدید مکروہ ہے۔
شارح مسلم علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے لکھا ہے کہ امام مالک علیہ الرحمہ کے نزدیک اگر پیشانی پر سجدہ کیا اور ناک نہ لگی، تو کوئی حرج نہیں اور اگر ناک پر سجدہ کیا اور پیشانی نہیں لگی، تو سجدہ نہ ہوگا، ان کا استدلال بھی اسی حدیث سے ہے۔
(بحوالہ ہدایۃ المجتہد لابن رشد)

امام شافعی کے نزدیک سجدہ میں ناک اور پیشانی دونوں کا لگانا واجب ہیں۔ ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پیشانی کے ساتھ ناک کا بھی ذکر کیا ہے اور وہ پیشانی اور ناک دونوں کو ملا کر ایک عضو قرار دیتے ہیں تاکہ اعضاء کی تعداد سات سے زیادہ نہ ہو۔ تاہم ان کا ایک قول امام اعظم علیہ الرحمہ کے موافق بھی ہے اور یہی مختار ہے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے سجدہ کیا اور ناک کو نہ لگایا۔

(شرح مسلم جلد اوّل ص۱۶۸ بحوالہ المہذب لابی اسحاق ابراہیم بن علی شافعی)

بہر حال کامل سجدہ سات اعضاء کو لگانے سے ہی ہوگا۔ اگر بلا عذر ناک نہ لگائی تو امام صاحب کے نزدیک بھی نماز مکروہ تحریمی ہوگی اور بعض کے نزدیک نماز ہی نہ ہوگی۔ اسی طرح دونوں ہاتھ، دونوں زانو، دونوں پاؤں لگانے بھی ضروری ہیں۔ اگر کسی نے سجدہ میں دونوں پاؤں نہ لگائے تو سجدہ نہ ہوگا اور نماز ہی نہ ہوگی۔

فضائلِ سجدہ

امام بخاری نے باب فضل السجود میں ایک طویل حدیث ذکر فرمائی ہے، جس میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے گا اور فرشتوں کو حکم فرمائے گا: جہنم سے ان کو نکال دو۔ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، فرشتے ان کو نکالیں گے اور اُن کو سجود کے نشانات سے پہچانیں گے کیونکہ نشاناتِ سجود کو آگ نہ جلائے گی اور اللہ تعالیٰ نے آگ پر حرام فرمایا ہے کہ نشانِ سجود کو کھائے۔ معلوم ہوا کتنی شان ہے اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہونے کی کہ اگر شامتِ اعمال کی وجہ سے آگ میں جانا بھی پڑا، پھر بھی اعضاء سجود جلنے سے محفوظ ہوں گے اور آثارِ سجود روشن ہوں گے۔ ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا:

اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ اِذَا سَجَدَ -

ص۸۸

"یعنی بندہ اپنے رب کے بہت قریب ہوتا ہے جب سجدہ کرتا ہے۔" (عینی شرح بخاری)

سُبحان اللہ! بندہ کو سجدہ میں اپنے مولیٰ تعالیٰ کا خصوصی قربِ خاص حاصل ہوتا ہے بندہ کے لئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ اُس کو مولا کریم کا قربِ خاص حاصل ہو جائے اور وہ آپ کے حکم کے مطابق سجدہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

مسلم شریف میں ہے معدان بن طلحہ یعمری بیان کرتے ہیں کہ میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غلام حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملا اور میں نے ان سے عرض کیا، مجھے ایسا عمل بتلائیے، جس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دے یا یہ کہا کہ مجھے وہ عمل بتلائیے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہو؟ حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ سوال کیا، وہ خاموش رہے۔ میں نے سہ بارہ سوال کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات پوچھی تھی، تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے لئے کثرتِ سجود کو لازم کر لو، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک سجدہ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارا درجہ بلند کرے گا اور تمہارا ایک گناہ مٹائے گا۔ حضرت معدان کہتے ہیں کہ اس کے بعد میری ملاقات حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ میں نے اُن سے بھی یہی سوال کیا تو انہوں نے حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ والا جواب دیا۔ کیا شان ہے اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہونے کی کہ ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک گناہ مٹتا ہے اور کثرتِ سجود محبوب ترین عمل ہے اور جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے۔ مولیٰ تعالیٰ ہم سب کو کثرتِ سجود اور کثرتِ نماز کی توفیق بخشے۔

سجدہ مسنونہ کا طریقہ

سجدہ میں جب جائے تو زمین پر پہلے گھٹنے رکھے، پھر ہاتھ، پھر ناک پھر پیشانی رکھے اور جب سجدہ سے اُٹھے، تو عکس کرے، یعنی پہلے پیشانی، پھر ناک، پھر ہاتھ پھر گھٹنے اُٹھائے۔ (عالمگیری) اُٹھتے وقت زمین پر ٹیک لگا کر نہ اُٹھے، بلکہ سیدھا پاؤں پر دباؤ ڈال کر اُٹھ کھڑا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب سجدہ کو جاتے، تو پہلے گھٹنے رکھتے پھر

ہاتھ اور جب اُٹھتے تو پہلے ہاتھ پھر گھٹنے اُٹھاتے۔ اصحابِ سُنن اربعہ اور سُنن دارمی نے اِس حدیث کو وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

مرد کے لیے سجدہ میں سُنّت یہ ہے کہ بازو کروٹوں سے جُدا ہوں اور پیٹ رانوں سے اور کلائیاں زمین پر نہ بچھائے، مگر جب صف میں ہو تو بازو کروٹوں سے (اچھی طرح) جُدا نہ ہوں گے۔ (عالمگیری۔ ہدایہ) حدیث میں جس کو بخاری و مسلم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "سجدہ میں اعتدال کرے، اور کتے کی طرح کلائیاں نہ بچھائے۔

صحیح مسلم میں ہے حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جب تو سجدہ کرے تو ہتھیلی کو زمین پر رکھ دے، اور کہنیاں اُٹھالے۔ ابو داؤد نے حضرت امّ المومنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے، تو دونوں ہاتھ کروٹوں سے دُور رکھتے، یہاں تک کہ ہاتھوں کے نیچے سے اگر بکری کا بچّہ گزرنا چاہتا تو گزر جاتا اور مسلم کی روایت بھی اس کی مثل ہے۔ دُوسری روایت بخاری و مسلم کی حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یُوں ہے کہ ہاتھوں کو کشادہ رکھتے، یہاں تک کہ بغل مُبارک کی سپیدی ظاہر ہو جاتی۔

عورت سمٹ کر سجدہ کرے، یعنی بازو کروٹوں سے ملا دے اور پیٹ ران سے اور ران پنڈلیوں سے اور پنڈلیاں زمین سے (دونوں پاؤں داہنی طرف نکال دے۔)

مسائلِ سجدہ پیشانی کا زمین پر جمنا سجدہ کی حقیقت ہے اور پاؤں کی ایک انگلی کا پیٹ زمین پر لگنا شرط ہے۔ تو اگر کسی نے اس طرح سجدہ کیا کہ دونوں پاؤں زمین سے اٹھے رہے، نماز نہ ہوئی، بلکہ اگر صرف انگلی کی نوک زمین سے لگی، جب بھی نہ ہوئی۔ اس مسئلہ سے بہت لوگ غافل ہیں۔ (درمختار۔ فتاویٰ رضویہ)

مسئلہ: سجدہ میں دونوں پاؤں کی دسوں انگلیوں کے پیٹ زمین پر لگنا سنت ہے اور ہر پاؤں کی تین تین انگلیوں کے پیٹ زمین پر لگنا واجب اور دسوں کا قبلہ رو ہونا سُنّت ہے۔ (فتاویٰ رضویہ)

مسئلہ: اگر کسی عذر کے سبب پیشانی زمین پر نہیں لگا سکتا تو صرف ناک پر سجدہ کرے، پھر بھی فقط ناک کی نوک لگنا کافی نہیں، بلکہ ناک کی ہڈی زمین پر لگنا ضروری ہے۔ (عالمگیری - ردّالمحتار)

مسئلہ: رُخسارہ یا ٹھوڑی زمین پر لگانے سے سجدہ نہ ہوگا، خواہ عذر کے سبب ہو یا بلا عُذر، اگر عذر ہو تو اشارہ کا حکم ہے۔

مسئلہ: ہر رکعت میں دو بار سجدہ کرنا فرض ہے۔

مسئلہ: کسی نرم چیز مثلاً گھاس، روئی، قالین وغیرہ پر سجدہ کیا تو اگر پیشانی جم گئی، یعنی اتنی دبی کہ اب دبانے سے نہ دبے، تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ (عالمگیری) بعض جگہ جاڑوں میں مسجد میں پیال (دھان کا بھُس) بچھاتے ہیں۔ ان لوگوں کو سجدہ کرنے میں اس کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ اگر پیشانی خوب نہ دبی تو نماز ہی نہ ہوئی اور ناک ہڈی تک نہ دبی، تو مکروہ تحریمی، واجب الاعادہ ہوئی۔

مسئلہ: عمامہ کے پیچ پر سجدہ کیا، اگر ماتھا خوب جم گیا، سجدہ ہو گیا، اور ماتھا نہ جما، بلکہ چھُو گیا کہ دبانے سے دبے گا، یا سر کا کوئی حصّہ لگا تو سجدہ نہ ہوا۔ (دُرِّ مختار)

(نوٹ: یہ مسائل بہارِ شریعت حصّہ سوم سے درج کئے گئے ہیں۔ مزید نماز کے مسائل کے لئے حصّہ سوم و چہارم کا مطالعہ کیا جائے۔)

کفِ شعر یعنی نماز اس طرح پڑھنا کہ بالوں کا جُوڑا بنایا ہو، اس سے بھی سرکار علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے منع فرمایا ہے۔ یہ متعدد

روایات میں ہے کہ کفِ شعر نہ کیا جائے۔ ابوداؤد میں سندِ جید سے مروی ہے کہ حضرت ابورافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دیکھا کہ آپ نماز اس حال میں پڑھ رہے ہیں کہ آپ نے اپنی زلفوں کا اپنی گردن پر جوڑا بنایا ہوا ہے، تو آپ نے وہ جوڑا کھول دیا۔ اور آپ (حضرت ابورافع) نے فرمایا میں نے سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ وہ کِفل الشیطان ہے، یعنی شیطان کا حصّہ، یا فرمایا: مقعد الشیطان ہے یعنی شیطان کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔

اِس سے معلوم ہوا اس طرح نماز پڑھنا نہایت ناپسندیدہ عمل اور مکروہ ہے۔

اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے عبداللہ بن حارث کو اس حال میں نماز پڑھتے دیکھا کہ ان کے بال معقوص ہیں، (جوڑا بنایا ہوا) تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، ان کے پیچھے کھڑے ہوگئے اور اُن کو کھولنا شروع فرمایا اور ساتھ ہی ایک روایت سرکارِ ابدقرار صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمائی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے حال میں نماز پڑھنا آپ کو ناپسند ہے۔ اس کے بعد علامہ عینی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

فَدَلَّ الْحَدِيْثُ عَلٰى كَرَاهَةِ الصَّلٰوةِ وَهُوَ مَعْقُوْصُ الشَّعْرِ۔

"حدیث نے دلالت کی اس بات پر کہ اگر کسی نے بالوں کا جوڑا بنا کر نماز ادا کی، تو اس کی نماز مکروہ ہوگی۔" آگے فرماتے ہیں۔

اِتَّفَقَ الْجُمْهُوْرُ مِنَ الْعُلَمَآءِ اَنَّ النَّهْيَ لِكُلِّ مَنْ يُّصَلِّيْ كَذَالِكَ سَوَاءٌ تَعَمَّدَهٗ لِلصَّلٰوةِ اَوْكَانَ كَذَالِكَ قَبْلَهَا لِمَعْنًى اٰخَرَ۔

جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اس طرح نماز پڑھنا منع ہے، چاہے نماز کے لئے ہی قصداً ایسا کیا ہو، یا نماز سے پہلے کسی اور غرض کے لئے ایسا کیا گیا ہو، ہر حال میں اس طرح نماز ادا کرنا منع ہے

اور فرماتے ہیں:۔

وَالْعَقْصُ اَنْ یَّجْمَعَ شَعْرَہٗ عَلٰی وَسْطِ رَأْسِہٖ وَیَشُدُّہٗ بِخَیْطٍ اَوْ بِصَمْغٍ لِیَتَلَبَّدَ۔	عقص کا معنی یہ ہے کہ سر کے وسط میں بالوں کو اکٹھا کر لیا جائے اور دھاگہ سے باندھ لے یا گوند سے چپکا لیا جائے۔

اِن روایات سے معلوم ہوا کفِ شعر یعنی بالوں کو لپیٹ کر یا جوڑا بنا کر نماز پڑھنا مکروہ ہے اور امام حسن بصری علیہ الرحمہ سے حکایت ہے کہ یہ کراہتِ تحریمی ہے اور نماز واجب الاعادہ ہے تاہم علماء سے مکروہ تنزیہی کا بھی قول مروی ہے۔ بہر حال مطلقاً کراہت پر اتفاق ہے، آگے اختلاف کراہتِ تحریمی یا کراہتِ تنزیہی میں ہے۔ حضرت سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اس حال میں سجدہ کر رہا ہے کہ اس کے بالوں کا جوڑا بنایا ہوا ہے تو آپ نے فرمایا: "جوڑا کھول دے تاکہ بال بھی سجدہ کریں"۔

(یہ تمام مضمون عینی جلد ۶ صـ۹۱ پر درج ہے۔)

فتح الباری والے فرماتے ہیں کہ حضرت ابو رافع اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے عمل سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عین نماز کی حالت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جائز ہے کہ انہوں نے عملاً نمازی کا جوڑا کھول دیا اور جوڑا بنانے سے منع فرمایا اور حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کا عمل بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ انہوں نے بھی نماز کی حالت میں تبلیغ فرمائی۔

آجکل فیشن کا دور ہے طرح طرح سے فیشنی بال بنائے جاتے ہیں اور خلافِ سنت انگریزی طرز پر بال رکھے جاتے ہیں۔ اِس طرح کے بال بنانا سخت منع ہے اور تقلید نصاریٰ ہے اور ایسی حالت میں نماز کا مکروہ ہونا واضح ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ اکثر حضرات داڑھی منڈواتے یا کترواتے ہیں یہ بھی حرام ہے۔

اور ایک مشت یعنی چار انگل کی مقدار داڑھی رکھنا واجب ہے،
لیکن بعض حضرات کو ایسا کرتے بھی دیکھا ہے کہ داڑھی کٹواتے تو نہیں ہیں، لیکن داڑھی کے بال گرہ سے ہیں اور موڑ موڑ کر اس طرح بنا لیتے ہیں کہ داڑھی چھوٹی معلوم ہو، یہ بھی سخت منع ہے اور کٹانے کے حکم میں داخل ہے اور اس طرح نماز پڑھانا مکروہ ہے۔ ہمارے بعض ائمہ بھی بہت کوتاہی کرتے ہیں، کچھ داڑھی کٹاتے ہیں، اور کچھ داڑھی کو گرہ سے ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے۔ بالخصوص ائمہ حضرات کو اس کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

کفِ ثوب لغوی معنیٰ ہے کپڑا موڑنا، جمع کرنا، ضم کرنا، ملانا، لیکن اصطلاحِ شرع میں کپڑے کا موڑنا اور سجدہ میں جاتے وقت اپنے کپڑے کو اُوپر کی طرف کھینچنا ہے۔ اس حدیث میں مذکور ہیں، جس طرح کفِ شعر کی ممانعت ہے ایسے ہی کفِ ثوب کی بھی ممانعت ہے۔ کفِ ثوب میں تعمیم ہے، خواہ نیفے کی جانب کپڑا اگھرسا ہو یا پائنچے کی جانب سے کپڑا لپیٹا ہو یا کلائیوں پر کپڑا سمیٹا ہوا ہو۔ مطلق کفِ ثوب ان سب صورتوں کو شامل ہے اور ان جیسی سب صورتیں منع اور مکروہ ہیں۔
بعض حضرات کا پاجامہ یا شلوار اتنی لمبی ہوتی ہے کہ ٹخنے کے نیچے تک جاتے ہیں، اور نماز پڑھتے وقت ٹخنوں کے اوپر کرنے کے لئے شلوار یا پاجامہ کو نیفے کی جانب سے گھرس لیتے ہیں یا پائنچے کی جانب سے لپیٹ لیتے ہیں، یہ شدید مکروہ ہے۔ ٹھیک ہے ٹخنے کے نیچے تک کپڑا ہونا مکروہ ہے، لیکن یہ اس سے بھی زیادہ کراہت ہے۔
اصل بات یہ ہے کہ اتنی لمبی شلوار وغیرہ سلوانی ہی نہ چاہیے کہ ٹخنے سے نیچے رہے کیونکہ یہ صرف نماز کی حالت میں ہی خرابی نہیں، بلکہ عام حالت میں بھی یہ ایسی ہی خرابی ہے جتنی نماز کی حالت میں، کیونکہ جس حدیث میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے وہ ہر حالت کو شامل ہے، خواہ نماز میں یا غیر نماز میں، پھر جب شلوار وغیرہ لمبی ہوتی ہے

تو پھر یہ تکلفات کرنے پڑتے ہیں کبھی پائنچے کی جانب سے کپڑا لپیٹنا یا نیفے کی جانب سے کپڑا اُڑسنا اور کفِ ثوب کرنا۔ جس سے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ اس مذکورہ حدیث کے علاوہ بھی امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مجھے کفِ ثوب اور کفِ شعر سے منع فرمایا گیا اور ترمذی شریف میں بھی اس حدیث کی تخریج امام ترمذی نے فرمائی ہے اور یہ فرمایا: هٰذا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ نماز میں کفِ ثوب، چاہے نیفے کی جانب، چاہے ٹخنے کی جانب، چاہے کہنیوں پر کپڑا لپیٹنا سب صورتیں منع اور مکروہ ہیں اور فقہاء کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے، یہ کراہتِ تحریمی اور گناہ ہے۔

اقوال فقہاء کرام

دُرِ مختار میں ہے: وَكُرِهَ كَفُّهُ اَىْ دَفْعُهُ كَتَشْمِيرِ كُمٍّ اَوْ ذَيْلٍ۔ اس کے تحت علامہ شامی فرماتے ہیں: كما لو دخل فى الصلوٰة وهو مشمر كمه او ذيله واشار بذالك الى ان الكراهة لا تختص بالكف وهو فى الصلوٰة ـ ص ۵۹۸ ج ۱)

ترجمہ: "کفِ ثوب مکروہ ہے، یعنی کپڑے کا اٹھانا، اگرچہ کپڑا مٹی سے بچانے کے لئے کیا ہو جیسے آستین اور دامن کو موڑنا — اگر ایسی حالت میں نماز میں داخل ہوا کہ اس کی آستین یا اس کا دامن موڑا ہوا تھا اور اس قول سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ موڑنا حالتِ نماز کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، خواہ نماز شروع کرنے سے پہلے یا دورانِ نماز ہو، سب صورتوں میں مکروہ ہے۔"

جوہرہ نیرہ میں ہے: ولا يكف ثوبه الخ اپنے کپڑے کو نہ موڑے اور کفِ ثوب یہ ہے کہ سجدہ کرتے وقت اپنے سامنے سے یا پیچھے سے اپنا کپڑا اٹھانا

اکثر نمازیوں کی عادت ہے کہ سجدہ میں جاتے وقت اپنا کپڑا دونوں ہاتھوں سے اوپر کو اُٹھاتے ہیں، یہ بھی کفِ ثوب ہے اور یہ بھی شدید مکروہ ہے۔

عالمگیری میں ہے، یُکْرَہُ لِلْمُصَلِّیْ اَنْ یَّکُفَّ ثَوْبَہٗ۔

"یعنی نمازی کے لئے کفِ ثوب مکروہ ہے"

(عموماً مطلقاً مکروہ بول کر فقہاء مکروہ تحریمی مُراد لیتے ہیں)

علامہ شامی نے آستین پر کپڑا موڑنے کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے کہ نصف کلائی سے کم ہو تو نماز مکروہ تنزیہی ہوگی اور نصف کلائی یا اس سے اوپر تک آستین مڑی ہو، تو نماز مکروہ تحریمی ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کفِ ثوب تو دونوں صورتوں میں ہے، پھر حکم میں اختلاف کیوں؟ تو اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان فرمائی کہ عام طور پر وضو کرنے کے بعد بے توجہی اور بے پرواہی کی وجہ سے آستین تھوڑی سی مڑی رہ جاتی ہے، لہٰذا ابتلا عام (عموم بلوٰی) کی وجہ سے کراہت میں تخفیف ہے[1]

علامہ مولانا غلام رسول صاحب سعیدی شرح مسلم جلد اوّل ص ۱۸۳۶ پر فرماتے ہیں: احناف کی کتب میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے فقہاء حنفیہ کا کپڑا لپیٹنے میں (کلائی پر) اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اگر نمازی کہنیوں تک آستین چڑھائے تو مکروہ نہیں اور بعض کے نزدیک مطلقاً مکروہ ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن فقہاء نے نمازی کے کپڑا لپیٹنے یا سمیٹنے کو مکروہ قرار دیا ہے، اس سے مراد مکروہ تحریمی ہے اور جن فقہائے نے کراہت کی نفی کی ہے اس نفی سے مُراد بھی مکروہ تحریمی کی نفی ہے، مگر مکروہِ تنزیہی ان کے نزدیک بھی ثابت ہے۔

علامہ ابن عابدین نے اس مضمون کی تصریح فرمائی ہے۔

کپڑا لپیٹنے میں آستینوں کو چڑھانا، پائنچوں کو لپیٹنا اور نیفے کے قریب

---

[1] یہ تمام حوالہ جات رسالہ کفِ ثوب مصنفہ علامہ عطاء المصطفٰے مطبوعہ بزم انوار المدینہ کراچی سے نقل کئے گئے ہیں۔

شلوار یا پاجامہ کو اُڑس لینا یہ سب شامل ہیں، اور یہ مکروہ تحریمی ہے۔ (شرح مسلم جلد اوّل صفحہ ۶۸۴)
عوام تو عوام، خواص بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ عام طور پر علماء کرام کو دیکھا جاتا ہے کہ اُن کی شلوار بھی لمبی ہوتی ہے، اور ٹخنوں کے نیچے ہوتی ہے، اور نماز کے وقت نیفے کے قریب اوپر کو اڑس لیتے ہیں۔ آپ حوالہ جات سے پڑھ چکے ہیں۔ اس طرح مکروہِ تحریمی ہے اور مکروہ تحریمی گناہ ہوتا ہے، اور نماز ناقص ہو جاتی ہے۔ جب اس حال میں نماز پڑھائے گا، تو مقتدیوں کی نماز بھی مکروہ ہوگی اور ان کی ذمہ داری بھی ایسے امام پر ہوگی، اگرچہ مقتدی بھی مکروہ کے مرتکب ہوں گے۔
کونسی مصیبت ہے کہ شلوار لمبی سلائی جائے اور نماز کے وقت ایسا تکلّف کیا جائے جو رافع کراہت نہ ہو، بلکہ شدید کراہت کا موجب ہو۔ اپنے قد کے مطابق ہی شلوار یا پاجامہ سلوانا چاہیئے۔ مولا تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق بخشے۔ آمین!

آپ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی چند خصوصیات کا بیان

حدیث ۲۱۱: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْکَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ فَبَیْنَا اَنَا نَائِمٌ اُتِیْتُ بِمَفَاتِیْحِ خَزَائِنِ الْاَرْضِ فَوُضِعَتْ فِیْ یَدِیْ۔ (البخاری صفحہ ۱۰۱۸ ـ مسلم صفحہ ۱۹۹)

حلِ لغات
بُعِثْتُ: میں بھیجا گیا۔ نُصِرْتُ: میری مدد کی گئی
رُعْب: دبدبہ۔ نَائِمٌ: سونے والا۔
مَفَاتِیْح: چابیاں۔ وُضِعَتْ: رکھ دی گئیں۔

ترجمہ: سیّدنا ابو ہریرہ[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ بے شک رسول اللہ

---

[1] ان کے حالات حدیث ۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جامع باتوں کے ساتھ بھیجا گیا اور ہیبت سے میری مدد کی گئی جبکہ میں سو رہا تھا، تو میرے پاس زمین کے خزانوں کی چابیاں لائی گئیں، تو میرے ہاتھ میں رکھ دی گئیں۔"

تشریح اس حدیث میں سیدِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی تین خصوصیات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ بعض روایات میں چار کا ذکر ہے بعض میں چھ کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ دیگر روایات میں مذکورہ کے علاوہ خصوصیات کا بھی ذکر ہے۔ شارحِ بخاری علامہ بدر الدین عینی علیہ الرحمہ نے جلد ۴ صـ ۸ میں ان روایات کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا:

اِذَا تَاَمَّلْتَ وَجَدْتَ هٰذِهٖ الْخِصَالَ اِثْنَتَیْ عَشْرَةَ خَصْلَةً وَیُمْكِنُ اَنْ تُوْجَدَ اَكْثَرُ مِنْ ذَالِكَ عِنْدَ اِمْعَانِ النَّظْرِ۔

"جب تو غور کرے (ان روایات میں) تو ۱۲ خصوصیات پائے گا اور ممکن ہے کہ گہری نگاہ کرنے سے ان سے بھی زائد پائی جائیں۔"

جن بارہ۱۲ خصوصیات کی طرف علامہ نے اشارہ فرمایا ہے، وہ یہ ہیں:۔

(۱) ہماری صفوں کا صفوفِ ملائکہ کی طرح ہونا (۲) تمام زمین کا مسجد ہونا، مٹی کا طہور ہونا (جامع باتوں کا ملنا (۴) ایک ماہ کی مسافت سے آپ کی ہیبت، (۵) زمین کے خزانوں کی چابیاں ملنا (۶) سورۂ بقرہ کی آخری آیات، (۷) خاتم النبیین ہونا (۸) کوثر کا عطا ہونا (۹) احمد کا نام (۱۰) غنائم کا حلال ہونا (۱۱) شفاعتِ کبریٰ (۱۲) آپ کی اُمت کا خیرُ الامم ہونا ـــ بلکہ حضرت ابوسعید نیشاپوری علیہ الرحمہ نے شرف المصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ساٹھ خصوصیات کا ذکر فرمایا ہے۔

جن روایات میں تین، چار، پانچ، چھ کا عدد ذکر کیا گیا، وہ برائے حصر نہیں ہے

کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ کسی امر پر عدد کی تنصیص ماسوا کی نفی نہیں کرتی، مثلاً کوئی کہے کہ میرے پاس دس روپے ہیں، اس عدد سے زائد کی نفی نہ ہوگی، کیونکہ زائد میں کم بھی ہوتے ہیں (ہزار ہا خصوصیات ہیں، جو حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ملیں، کسی اور کو نہ ملیں (مرأۃ) لہٰذا عدد والی روایت ان احادیث کے خلاف نہیں، جن میں اور خصوصیات کا بھی ذکر ہے۔

اب ان خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے، جن کا اس حدیث میں ذکر ہے:

(۱) جامع باتوں میں قرآن پاک بھی ہے جس میں عبارت قلیلہ کے باوجود معانی کثیرہ جزیلہ ہیں۔ ایک ایک کلمہ اور آیت میں بہت اسرار و رموز ہیں — خود قرآن کریم میں ہے کہ اس میں ہر شے کا واضح بیان ہے۔ اسی لئے مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے:

جَمِیْعُ الْعُلُوْمِ فِی الْقُرْاٰنِ، وَلٰکِنْ تَقَاصَرَ عَنْہُ اَفْہَامُ الرِّجَالِ۔

"تمام علوم قرآن میں ہیں، لیکن لوگوں کے فہم ان تک رسائی سے قاصر ہیں۔"

اس کے انوار و مضامین کی روشنی دیکھنی ہو تو تفسیر کبیر۔ روح المعانی، اور رُوح البیان وغیرہ کو دیکھیں — اور احادیث مبارکہ اور آپ کے ارشادات بھی جوامع الکلم سے ہوتے ہیں۔ عام طور پر، ایک ایک جملہ کثیر معانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ دیکھو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اعمال کا اعتبار نیتوں سے ہے، دین کی حقیقت خیر خواہی ہے، مومن کامل وہ ہے جو بیکار اور غیر مفید باتیں چھوڑ دے۔" چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، مگر ساری شریعت و طریقت ان میں بھری ہوئی ہے۔ بعض محدثین کرام نے ایسی مختصر حدیثیں کتابی شکلوں میں جمع فرمادی ہیں۔ (مرأۃ جلد ۸، صفحہ ۱)

(۲) آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہیبت و دبدبہ اور آپ کے رعب سے امداد

اس حدیث میں تو مطلق ہے، لیکن امام بخاری علیہ رحمۃ الباری نے کتاب التیمم میں حدیث کی تخریج فرمائی ہے، جس میں مذکور ہے ایک ماہ کی مسافت سے آپ کا رعب اور دبدبہ دشمن پر طاری ہو جاتا۔ صاحبِ فتح الباری نے لکھا ہے کہ ایک ماہ کے فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ اس وقت دشمنوں کے بلاد اور شہرِ مدینہ سے ایک ماہ کی مسافت پر تھے، اگر دُور سے دشمن آتا تو ابھی ایک ماہ کی مسافت پر ہوتا، تو اس کے دل میں قدرتی طور آپ کا رُعب طاری ہو جاتا، اگر وہ لڑائی کریں بھی، تو آپ سے مرعوب ہو کر، یہ آپ کی خصوصیت ہے، یہ معجزہ کسی اور نبی کو نہیں ملا۔ علامہ عینی نے حضرت سائب بن یزید المعروف بابن اُخت النمر کی روایت میں بیان فرمایا کہ آپ نے فرمایا:

نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ شَهْرًا اَمَامِيْ وَشَهْرًا خَلْفِيْ۔

"میری رُعب سے مدد کی گئی ایک ماہ سامنے کی مُسافت سے اور ایک ماہ پیچھے کی مسافت سے"
طبرانی کی روایت میں ہے: شہرًا اور شہرین ایک ماہ یا دو ماہ کی مسافت۔

جب آپ کا رُعب کفّار کے دلوں میں اتنی دُور سے ڈال دیا جاتا ہے، تو آپ کے قریب والا کتنا مرعوب ہو گا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اکیلے سو رہے ہیں، ایک کافر تلوار لے کر آ کھڑا ہوا مگر قتل نہ کر سکا، تھر تھرا کر گر گیا۔ (مرآۃ)

ہیبتِ حق است، ایں از خلق نیست ۵
ہیبت ایں مَرد صاحب دلق نیست

ابو جہل کے بارے میں مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے قریب ہوا، تو اُلٹے پاؤں بھاگا۔ کسی نے پوچھا تجھے کیا ہوا؟ اُس نے کہا آپ کے اور میرے درمیان آگ کی خندق تھی اور آپ کے پاس آپ کے محافظ کھڑے تھے۔ اگر مزید آگے جاتا، تو مجھے ڈر تھا کہ کہیں آگ میں نہ ڈال دیا جاؤں۔"

اب بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روضۂ اطہر پر پہلی حاضری کے وقت زائر کے دل میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بہت ہیبت ہوتی ہے، وہ اپنے گناہوں اور کوتاہیوں پر شرمسار و نادم ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ مُنہ اور یہ عظیم بارگاہ، لرزتا، کانپتا حاضر ہوتا ہے، بعد میں آپ کی کرم نوازی سے آپ کے ساتھ اُنس و محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۳) آپ کو زمین کے تمام خزانوں کی چابیاں عطا فرما دی گئیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جس کو چابی دے دی جائے، اُس کو مالک و متصرف کر دیا جاتا ہے۔ بعض شارحین نے اس سے مراد فتوحات لی ہیں اور بعض نے زمین کے اندر طرح طرح کی جو کانیں ہیں وہ مراد لی ہیں، جیسے کہ راویٔ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

وَقَدْ ذَهَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنْتُمْ تَنْتَثِلُوْنَهَا

"آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے گئے ہیں اور تم ان خزانوں کو نکال رہے ہو"

سونا، چاندی، تانبا، تیل، پٹرول وغیرہ، لیکن شارحین کا یہ بیان بطورِ تمثیل ہے، ورنہ حدیث کے الفاظ مطلق ہیں، اس لئے اس کو اپنے اطلاق پر ہی رکھا جائے گا اور زمین کے تمام خزانے مراد ہوں گے۔ خیال رہے کہ تمام زمینی، اور دریائی پیداواریں زمینی خزانے ہیں، ان کی چابیاں آپ کو دیئے جانے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو ان سب کا مالک بنا دیا اور مالک بھی اختیار والا کہ آپ لوگوں کو اپنے اختیار سے تقسیم فرما دیں، جیسا کہ خود آپ کا ارشادِ مبارک ہے۔

اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ یعنی "اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور ہم بانٹتے ہیں"

ہلاکت ہو صاحبِ "تقویۃ الایمان" اسماعیل دہلوی کی، جس نے گستاخانہ طرز پر لکھ دیا: "جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مالک و مختار نہیں ہے۔"

مولیٰ تعالیٰ تو فرماتا ہے اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ہم نے تو آپ کو کوثر یعنی بہت کچھ عطا فرمایا

لطیفہ دُنیا کی ساری نعمتوں کو رَب تعالیٰ قلیل فرماتا ہے، مگر جو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کو دیا گیا، وہ کثیر ہی نہیں، بلکہ کوثر ہے، یعنی زیادہ ہی نہیں، بلکہ بہت ہی زیادہ ہے، دُنیا تو میرے آقا (علیہ الصّلوٰۃ والسّلام) کی ملکیت کا ایک کروڑ واں حصّہ ہے۔

ے خالقِ کُل نے آپ کو، مالکِ کُل بنا دیا
دونوں جہاں ہیں آپ کے قبضہ و اختیار میں

سرکارِ ابد قرار احمدِ مختار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم بحکمِ پروردگار کونین کے مالک و مختار ہیں، زمین و زمان کے مالک، کون و مکان اور آسمان کے مالک، اپنے رب کی عطا سے جہان کے احکام کے مالک، انعام کے مالک، جس کو چاہیں، اپنے رب کی عطا سے عطا فرمائیں، جس کے لیے جو چاہیں حلال فرما دیں اور جو چاہیں حرام فرمائیں غرضیکہ دونوں جہان کے شہنشاہ اور کونین کے مالک و مولیٰ ہیں۔

اپنے اختیارات سے حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گواہی کو دو کے قائم مقام کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حیات میں دُوسرا نکاح منع فرما دیا۔

مسند امام احمد بن حنبل میں ہے: ایک نومسلم کا دو نمازوں کے پڑھنے کی شرط پر ایمان قبول فرما لیا۔ اپنے اختیار سے اس کو تین نمازیں معاف فرما دیں۔

جب آپ نے حکم فرمایا کہ حرم مکّہ سے کانٹے نہ توڑے جائیں، نہ یہاں کے شکار کو بھگایا جائے، تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یارسُول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلّم) اذخر کے توڑنے کی اجازت دے دی جائے کیونکہ اس کی شدید ضرورت ہوتی ہے، تو آپ نے اپنے اختیار سے اذخر کی اجازت فرما دی (بخاری)

اسی طرح حضرت سراقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا کہ میں تمہارے ہاتھ میں

بادشاہ کسریٰ کے سونے کے کنگن دیکھتا ہوں۔ جب خلافت فاروقی میں ملک فارس فتح ہوا، تو آپ کی سابقہ خصوصی اجازت سے سونے کے کنگن حضرت سراقہ کے ہاتھ میں پہنا دیئے گئے، حالانکہ مرد کے لیئے سونا پہننا حرام ہے۔

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے اور آپ کے پاس رہتے تھے، اُن کے نکاح کا پیغام حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیا۔ سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت معزز خاتون تھیں، انہوں نے اور اُن کے بھائی عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ عام رسم و رواج کے مطابق اس پیغام سے معذرت کی، کیونکہ وہ قریشی تھیں اور حضرت زید رضی اللہ عنہ قریشی نہ تھے اور نکاح میں عموماً کفو کا خیال رکھا جاتا ہے، اس وقت سُورۃ احزاب کی آیت، وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ۔ (الآیۃ) نازل ہوئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو کچھ اختیار نہیں ہے، جب اللہ اور اُس کا رسُول کسی اَمر کا فیصلہ سُنا دے۔ وہ سمجھ گئے اور وہ فوراً حاضر ہو کر آپ کا پیغام قبول کیا اور نکاح ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسلمانوں کی جان و مال اور اولاد کے مالک ہیں اور ایسے مالک ہیں کہ اُن کے حکم کے مقابلہ میں کسی کو اپنی جان و مال اور اولاد کا کچھ اختیار نہیں، دیکھو نکاح میں بالغہ لڑکی کی اجازت اور اُن کے ماں باپ کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔ یہ کیسا نکاح ہے کہ اس میں کسی کی ناراضی کا اعتبار نہ کیا گیا۔ وجہ یہی ہے کہ سارے مسلمان مرد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غلام ہیں اور مسلمان عورتیں لونڈیاں۔ آپ سب کے مالک و مولیٰ۔ آقا و مولیٰ کو اختیار ہوتا ہے کہ جہاں چاہے لونڈی کا نکاح کر دے۔

مشکوٰۃ باب السجود میں ہے: ایک دفعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خوش ہو کر فرمایا: سَلْ کچھ مانگ لو! انہوں نے عرض کیا:

اَسْئَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِی الْجَنَّةِ۔ یعنی "میں آپ سے مانگتا ہوں کہ جنت میں آپ کا ساتھ ہو" ارشاد فرمایا، اَوْ غَیْرَ ذَالِكَ "کچھ اور مانگنا ہے" عرض کیا: بس یہی!

اس حدیث سے تین طرح سے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بادشاہت اور سلطنت ثابت ہوتی ہے۔ اوّلاً حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: مانگ لو، یہ نہ فرمایا کہ فلاں چیز مانگو اور یہ وہی کہہ سکتا ہے جس کے قبضہ و اختیار میں سب کچھ ہو۔ (کذا فی المرقاۃ لملا علی قاری اور اشعۃ اللمعات حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہما اللہ)

دوسرے حضرت ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی خوب سوچ سمجھ کر وہ چیز مانگی جو بے مثل ہے۔ یعنی جنت اور جنت کا صدر اعلیٰ علیین یعنی سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مرافقت، اور آپ کے لفظ یہ ہیں: اَسْئَلُكَ "میں آپ سے مانگتا ہوں" یہ نہ کہا کہ میں خدا سے مانگتا ہوں، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی یہ نہ فرمایا کہ تم مشرک ہو گئے اور ظاہر بات ہے کہ چیز کے مالک سے ہی مانگی جاتی ہے۔ ثابت ہوا کہ آپ ہر چیز کے مالک ہیں۔

تیسرے اس طرح کہ حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کا جواب میں ارشاد فرمایا: کچھ اور مانگ لو۔ معلوم ہوا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام جنت کے علاوہ کچھ اور دینے کے بھی مالک ہیں۔

ضروری نوٹ: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مالکِ دو جہاں ہونے کا نہ تو یہ مطلب ہے کہ رب تعالیٰ کسی چیز کا مالک نہ رہا اور نہ یہ مطلب ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رب تعالیٰ کی مثل، مالک ہیں جس سے لازم آجائے کہ عالم کے دو مستقل مالک ہیں؛ بلکہ رب تعالیٰ کی ملکیت حقیقی، ذاتی قدیم، ازلی، ابدی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت عطائی اور حادث ہے جیسے دنیوی بادشاہ اپنی سلطنت کے مالک، ہم لوگ اپنے گھر بار کے مالک۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ رب تعالیٰ ان چیزوں کا مالک نہ رہا، بلکہ وہ حقیقی مالک ہم مجازی؛ اس کی ملکیت ذاتی ہماری عطائی۔ اسی طرح آپ کا دونوں جہانوں کا مالک ہونا عطائی اور خداوند قدوس جل وعلا کی ملکیت ذاتی

؎ مالکِ کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں اُن کے خالی ہاتھ میں

انبیاء کرام کی قبور کو مسجد (سجدہ گاہ) بنانے پر لعنت کا بیان

حدیث ۳۲: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَاتَلَ اللّٰهُ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِهِمْ مَسَاجِدَ۔

(بخاری شریف جلد اوّل ص۶۲ مسلم شریف جلد اوّل ص۲۰۱)

حل لغات: قَاتَلَ: تباہ کرے۔ اِتَّخَذُوْا: بنایا۔ مَسَاجِدَ: سجدہ گاہ۔

ترجمہ: "سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کو تباہ و برباد کرے۔ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔"

تشریح اس حدیث کو امام بخاری نے باب الصلوٰۃ فی البیعۃ میں تخریج فرمایا" اور لفظ قَاتَلَ کے ساتھ جو قَتَلَ کے معنی میں ہے، یہود و نصاریٰ پر بددعا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اُن کو تباہ و برباد کرے اور مسلم نے لفظ لَعَنَ کی تخریج کی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ان پر لعنت ہو۔ بعض محدثین نے فرمایا کہ قَاتَلَ سے مراد بھی لَعَنَ ہے۔ بہرحال یہود و نصاریٰ کے اس فعل پر کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ناراضی کا اظہار فرمایا اور لفظ قَاتَلَ یا لفظ لَعَنَ سے ان پر بددعا فرمائی۔ اس سے مراد عین قبر پہ مسجد بنانا ہے یا اِس طرح کہ قبر کی جانب بلا حائل سجدہ ہو کہ انہوں نے اسی طرح انبیاء کرام کی قبور کو سجدہ گاہ بنایا یا قبر پہ سجدہ ہوتا یا قبر کی جانب اور اُن کے اوائل نے بھی اس طرح کیا کہ اپنے عبادت خانوں میں صالحین کی تصاویر اور مجسمے بناڈالے"

تاکہ لوگ ان کی تصاویر سے مانوس ہوں اور انہیں دیکھ کر ان کے اعمالِ صالحہ یاد کریں اور ان کی طرح عبادت میں کوشش کریں۔ (ان کی نیت تو درست تھی) ان کے بعد ناخلف لوگ آئے جو اُن کی مُراد کو نہ پا سکے اور شیطان نے اُن کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈال دیا کہ تمہارے اسلاف ان تصاویر کی پرستش کرتے تھے اور ان کی تعظیم کرتے تھے۔ (کذا فی فتح الباری والعینی)

تو حضور سیّدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اپنی مرضِ موت میں سختی سے منع فرمایا، تاکہ آپ کی ذات کے ساتھ اس طرح نہ کیا جائے، نہ تصویر اور مجسّمہ بنایا جائے اور نہ ہی آپ کی قبرِ انور کو سجدہ گاہ بنایا جائے، اسی لیۓ آپ نے تصویر کے بارے میں بہت سختی سے ممانعت فرمائی اور تصویر بنانے اور بنوانے والوں پر لعنت فرمائی۔ اور صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین اور تابعین عظام نے آپ کی قبرِ انور پر جب مسجد میں اضافہ کی ضرورت لاحق ہوئی، اونچی اور گول اردگرد دیواریں بنادیں تاکہ عوام اس ممنوع فعل کو شروع نہ کردیں اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبرِ انور کو سجدہ گاہ نہ بنالیں، بعد میں دو بڑی دیواریں اس طرح بنادی گئیں کہ اب ممکن ہی نہیں کہ کوئی آپ کی قبرِ مبارک کی جانب منہ کرکے نماز پڑھے۔ اب چہار اطراف سے قبرِ مبارک گنبدِ خضرا کے اندر ہے اور اردگرد دیواروں سے محاط ہے، لہٰذا اگر نماز اس طرح پڑھی جائے کہ روضہ انور سامنے آجائے، جیسا کہ جماعت کے وقت عام ہوتا ہے، اس میں کوئی حرج اور قباحت نہیں ہے، کیونکہ آگے دیوار کا پردہ ہے، عین قبر کی طرف منہ نہیں ہوتا۔

اللہ والوں کے پاس مسجد بنانا اِس حدیث سے بعض حضرات نے اللہ والوں کے قریب مساجد بنانے سے منع کیا اور یہود و نصاریٰ کے مشابہت قرار دیا، حالانکہ اِن میں کوئی مشابہت نہیں ہے، انہوں نے قبور کو سجدہ گاہ بنایا اور اب اہل اللہ کے قرب میں مساجد اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ ان قبور کی جانب سجدہ نہیں ہوتا

علامہ عینی جلد ۴ صفحہ ۱۹۲ اور فتح الباری جلد اول صفحہ ۴۳۸ میں فرماتے ہیں :-

قَالَ الْبَيضَاوِىُّ لَمَّا كَانَت	علامہ بیضاوی نے کہا جبکہ یہود و نصاریٰ
اَلْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى يَسْجُدُوْنَ	انبیاء کرام علیہم السلام کی قبروں کو تعظیمًا
لِقُبُوْرِ الْاَنْبِيَاءِ تَعْظِيْمًا	سجدہ کرتے تھے اور نماز میں اُن کی جانب توجہ
لِشَانِهِمْ وَيَجْعَلُوْنَهَا قِبْلَةً	کرنے اور ان کو انہوں نے بُت بنا لیا،
يَتَوَجَّهُوْنَ فِى الصَّلٰوةِ نَحْوَهَا	تو آپ نے ان پر لعنت فرمائی، اور
وَاتَّخَذُوْهَا اَوْثَانًا لَعَنَهُمُ النَّبِىُّ	مسلمانوں کو اس عمل سے روکا ۔ پر
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنَعَ الْمُسْلِمِيْنَ	جو کسی مرد صالح کے جوار میں مسجد
عَنْ مِثْلِ ذَالِكَ فَاَمَّا مَنِ اتَّخَذَ	بنائے اور اس کے قرب سے برکت
مَسْجِدًا فِىْ جِوَارِ صَالِحٍ وَقَصَدَ	کا ارادہ کرے نہ کہ اس کی تعظیم،
التَّبَرُّكَ بِالْقُرْبِ مِنْهُ لَا لِلتَّعْظِيْمِ	اور اس کی جانب توجہ کا (علی وجہ العبادۃ)
لَهٗ وَلَا لِلتَّوَجُّهِ اِلَيْهِ فَلَا	پس وہ اس وعید مذکور میں داخل
يَدْخُلُ فِى الْوَعِيْدِ الْمَذْكُوْرِ ۔	نہیں ہے ۔

اِسی مضمون کو ملا علی قاری حنفی علیہ الرحمہ نے شرح مشکوۃ مرقاۃ میں اور دیوبندیوں کے محدث انور شاہ کشمیری نے فیض الباری میں ذکر کیا ہے، مردِ صالح کے قرب میں مسجد بنانے کی ممانعت کس طرح ہوگی جبکہ کعبہ مکرمہ (جس سے بڑی دنیا میں کوئی مسجد نہیں ہے) کے قرب میں حضرت اسماعیل اور حضرت سیدہ ہاجرہ علیہما السلام کی قبریں ہیں ۔ محمد جار اللہ لکھتے ہیں :-

مِنْ فَضَائِلِ الْحَجَرَاتِ	حطیم کعبہ کے فضائل میں سے یہ ہے کہ
فِيْهِ قَبْرُ اِسْمَاعِيْلَ وَاُمِّهٖ	اِس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور
هَاجَرَةَ (الجامع اللطيف صفحہ ۸۹)	اُن کی والدہ کی قبریں ہیں ۔

کعبہ کے بعد سب سے بڑی مسجد، مسجدِ نبوی ہے اور اس کے جوار میں روضۂ انور ہے اور حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مزار پُرانوار کے ساتھ شیخین کی قبور ہیں۔

سب سے بڑا حوالہ صالحین کے قرب میں مسجد بنانے کا قرآن پاک میں ہے کہ اصحاب کہف کے قریب اہلِ توحید اور مسلمانوں نے مسجد بنائی۔

قَالَ الَّذِیْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤی اَمْرِهِمْ — جو لوگ ایمان بالآخرت کو منوا چکے تھے،
لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیْهِمْ مَّسْجِدًا (سورۃ کہف) — اُنہوں نے کہا ہم اس جگہ پر مسجد بنائیں گے۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں اور علامہ ابو سعود حنفی نے تفسیر ابو سعود میں اور علامہ آلوسی نے تفسیر رُوح المعانی میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ وہ مسجد بنانے والے مسلمان اور آخرت پر ایمان رکھنے والے تھے۔

ان مُستند تفاسیر کے حوالے سے واضح ہو گیا، جو مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں لکھا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مرادِ "سچے پیروانِ مسیح" کے مقابلہ میں اس وقت کے عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہ تھے، بغیر کسی حوالہ کے، وہ ان کی خیال آفرینی اور طبع زاد تفسیر ہے اور غلط ہے۔

ایک اشکال کا جواب

یہودی اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ کرتے تھے لیکن عیسائیوں کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور اُن کی قبر ہی نہیں ہے۔ پھر حدیث شریف کا معنیٰ کس طرح درست ہوگا کہ یہود اور عیسائیوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ بات یہ ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بت بنا کر اس کی پرستش کرتے اور اپنی قبروں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بت (بشکل صلیب) بنا کر نصب کرتے ہیں اور اس حدیث میں قبروں پر بت بنانے اور اُن کی پرستش پر بھی وعید ہے، اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے ساتھ عیسائیوں کا بھی بالتبع ذکر کر دیا کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بُت اور تصویریں بنانے اور ان کی پرستش میں عیسائی بھی یہود کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ (واللہ تعالیٰ و رسولہٗ اعلم)

(ملخصًا ماخوذ از شرح مسلم للسعیدی جلد ۲ صـ۸۴ تا صـ۸۶)

یومِ جمعہ کے غسل کا بیان

حدیث ۳۳: عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْغُسْلُ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ مُحْتَلِمٍ۔

(بخاری جلد اوّل ص۱۱۸، مسلم جلد اوّل صفحہ ۲۸۰)

حلِّ لغات: وَاجِب: ثابت۔ مُحْتَلِم: بالغ۔

ترجمہ: "حضرت سیدنا ابو سعیدؓ[1] خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وہ حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: جمعہ کے دن کا غسل ہر بالغ پر واجب (ثابت) ہے۔"

تشریح: اس حدیث مبارک میں جمعہ کے دن کا غسل کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ہر بالغ پر جمعۃ المبارک کے دن کا غسل واجب ہے۔

غسلِ جمعہ کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

جمعہ کی وجہ تسمیہ: جاہلیت کے دور میں اس دن کا نام عروبہ تھا۔ بعد میں اس کا نام جمعہ ہوا۔ فتح الباری میں اس کی مختلف وجوہ لکھی گئی ہیں۔ بعض فرماتے ہیں اس کا نام جمعہ اس لئے ہوا کہ اس میں خلقت آدم کو جمع کیا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس لئے کہ آپ کے جدِ امجد حضرت کعب بن لوئی اس دن میں اپنی قوم

---

[1] حضرت ابو سعید سعد بن مالک بن سنان خدری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی حدیث کے علماء، فضلاء، حفاظ میں سے تھے۔ یوم الخندق ۱۳ برس کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے لائے گئے۔ غزوہ بنی مصطلق میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ۷۴ھ میں فوت ہوئے۔ (اسد الغابہ ج ۵ ص۲۱۱)

کو جمع فرماتے اور اُن کے سامنے تقریر فرماتے، جس میں انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں خبر دیتے اور یہ بتلاتے کہ آپ ان کی اولاد سے مبعوث ہوں گے اور انہیں آپ کی اتباع اور آپ پر ایمان لانے کی نصیحت فرماتے، تاہم یہ نام جاہلیت کے زمانہ میں مشہور نہ ہوا۔ اس نام کو شہرت اسلام کے دَور میں حاصل ہوئی۔

حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضور سیدِ عالم رسولِ معظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مدینہ شریف میں تشریف فرما ہوئے اور حکمِ جمعہ کے نازل ہونے سے پہلے اہلِ مدینہ جمع ہوئے۔ پس انصار نے کہا: بے شک یہود کے لئے ہفتہ کا دن ہے جس میں وہ عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں، ایسے ہی نصاریٰ کے لئے اتوار کا دن ہے۔ ہم کو بھی چاہیے کہ ایک دن عبادت کے لئے مقرر کر لیں، اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں، نماز پڑھیں اور شکر کریں، تو انہوں نے یوم عروبہ کو مقرر کر لیا اور سیدنا اسعد بن زرارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جمع ہوتے، تو انہوں نے ان کو نماز پڑھائی۔ بعد میں اس دن میں نمازِ جمعہ پڑھنے کی فرضیت کے حکم کا نزول ہوا۔ (فتح الباری)

حدیث شریف میں یہ بھی ہے کہ پہلا جمعہ مبارکہ مدینہ منورہ میں پڑھایا گیا۔ (شرح مسلم للسعیدی)

فضائلِ جمعہ و یومِ جمعہ

علامہ ابنِ قیّم لکھتے ہیں کہ امام حاکم اور امام ابنِ حبّان نے اپنی اپنی صحیح میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ حضرت اوس بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب سے افضل دن جمعہ ہے، اسی دن حضرت آدم علیہ السلام تخلیق کئے گئے اور اسی دن فوت ہوئے، اسی دن صور پھونکا جائے گا، اسی دن قیامت قائم ہوگی۔ اسی دن مجھ پر درود شریف بکثرت پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود شریف مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کیا:

یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) آپ پر درود شریف کیسے پیش کیا جائے گا حالانکہ آپ فوت ہو چکے ہوں گے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین پر اجسادِ انبیاء کا کھانا حرام کر دیا ہے۔ (شرح مسلم للسعیدی، جلد دوم ص۶۲۱)

فائدہ: اس حدیث میں جمعہ کے دن کی فضیلت اور کثرتِ درود کا حکم جگہ بیان ہوا اس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ جل وعلا کے تمام پیارے انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں، خصوصاً سید الانبیاء حضرت احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ۔۔۔ جو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مُردہ کہتا ہے، (معاذ اللہ) وہ خود مُردہ ہے۔

معراج شریف کی رات حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دیکھا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری شرح مشکوٰۃ مرقاۃ میں فرماتے ہیں: انبیاء کرام علیہم السلام کا مختلف مقاموں میں مختلف اوقات میں موجود ہونا بھی جائز اور حدیث سے ثابت ہے۔ (حاشیہ مشکوٰۃ ص۱۲۱)

ابن ماجہ، ابولبابہ بن عبدالمنذر اور سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی، فرماتے ہیں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کہ جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ سے بھی بڑا ہے۔ اس میں پانچ خصلتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اسی دن میں انہیں زمین پر اتارا اور اسی میں انہیں وفات دی اور اسی میں ایک ساعت ایسی ہے کہ بندہ اس وقت جس چیز کا سوال کرے وہ اسے دے گا، جب تک کہ حرام کا سوال نہ کرے اور اسی دن میں قیامت قائم ہو گی۔ کوئی فرشتہ مقرب آسمان اور زمین اور ہوا اور پہاڑ اور دریا ایسا نہیں کہ جمعہ کے دن سے ڈرتا نہ ہو۔

فائدہ: اس ساعتِ مستجابہ کے بارے میں مختلف روایات ہیں، ان میں دو قوی ہیں، ایک یہ کہ امام کے خطبہ کے لئے بیٹھنے سے ختم نماز تک ہے اور دوسری

یہ کہ وہ جمعہ کی پچھلی ساعت ہے۔ ترمذی سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں، جمعہ کے دن جس ساعت کی خواہش کی جاتی ہے اسے عصر کے بعد سے غروبِ آفتاب تک تلاش کرو۔ (بہارِ شریعت)

اِسی لئے بعض بزرگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ جمعہ کے دن عصر سے لے کر مغرب تک اوراد و وظائف اور ذکر و فکر اور مراقبہ و دُعا میں مشغول رہتے ہیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃُ الْجُمُعَۃِ اَغَرُّ وَیَوْمُ الْجُمُعَۃِ اَزْھَرُ۔

رُسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کی رات روشن ہے اور جمعہ کا دن چمکدار ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَمُوْتُ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ اَوْ لَیْلَۃَ الْجُمُعَۃِ اِلَّا وَقَاہُ اللّٰہُ فِتْنَۃَ الْقَبْرِ۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی مسلمان جمعہ کے روز یا جمعہ کی رات میں نہیں مرتا، مگر اللہ اس کو قبر کے فتنہ سے بچاتا ہے۔"

(ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ شریف)

ایک روایت میں یہ بھی ہے جس کو جمعہ کے دن موت آئے گی، وہ شہید کے حکم میں ہوگا۔ یہ دن مسلمانوں کی عید کے دن کے برابر ہے۔ (بہارِ شریعت)

مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں، جس نے اچھی طرح وضو کیا اور پھر جمعہ کو آیا اور (خطبہ) سنا اور چپ رہا، اس کی (اُن گناہوں کی) مغفرت ہو جائے گی ایسے گناہوں کی جو اس جمعہ اور دوسرے جمعہ کے درمیان ہیں اور تین دن۔ اور جس نے کنکر چھوا، اس نے لغو کیا یعنی خطبہ سننے کی حالت میں اتنا کام بھی لغو میں داخل ہے کہ کنکری پڑی ہو، اُسے ہٹا دے۔

ابنِ حبان اپنی کتاب (صحیح) میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پانچ چیزیں جو ایک دن میں کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو جنتی لکھ دے گا۔ (پانچ چیزیں یہ ہیں:) جو مریض کو پوچھنے جائے اور جنازہ میں جائے، روزہ رکھے اور غلام آزاد کرے اور جمعہ کو جائے۔

ترمذی بافادہ تصحیح وتحسین راوی کہ یزید بن ابی مریم کہتے ہیں: میں جمعہ کو جاتا تھا۔ عبایہ بن رفاعہ بن رافع ملے، انہوں نے کہا تمہیں بشارت ہو کہ تمہارے یہ قدم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہیں۔ میں نے ابوعبیس کو کہتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس کے قدم اللہ تعالیٰ کی راہ میں گرد آلودہ ہوں، وہ آگ پر حرام ہیں۔

جمعہ چھوڑنے پر وعیدیں

حضور نبیٔ مکرم سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہاں نمازِ جمعہ پڑھنے کی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، وہاں تارکِ جمعہ کے لئے سخت وعیدیں بھی بیان فرمائی ہیں:

مسلم، ابوہریرہ وابن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے اور ابن ماجہ و نسائی بسندِ ابنِ عباس وابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے راوی کہ حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں البتہ لوگ جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں، یا اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کردے گا، پھر وہ غافلین میں سے ہو جائیں گے۔

حضور سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں، جو تین جمعے سستی کی وجہ سے چھوڑ دے، اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر کر دے گا۔

(ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی، ابن ماجہ و بہارِ شریعت)

مسلم شریف میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں نے قصد کیا کہ ایک شخص کو نماز پڑھانے کا حکم دوں اور جو لوگ

جمعہ سے پیچھے رہ گئے، اُن کے گھروں کو جلا دوں۔

ابنِ خزیمہ اور ابنِ حبان کی ایک روایت میں ہے جو تین جمعے بلا عذر چھوڑے وہ منافق ہے اور رزین کی روایت میں ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے بے علاقہ ہے۔

(ماخوذ از بہارِ شریعت)

غور فرمائیں بلا وجہ جمعہ چھوڑنے پر کتنی وعیدیں ہیں کتنی شدید تنبیہ ہے۔ مُہر لگنا، غافلین سے ہونا، گھر کو جلانے کا ارادہ فرمانا، خدا تعالیٰ سے بے علاقہ اور منافق ہونا (نفاقِ عملی) ہمارے معاشرہ میں عام نمازوں میں سُستی کی طرح جمعہ شریف میں بھی سُستی کا مشاہدہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ مولا تعالیٰ ہمیں نمازوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ جمعہ شریف پر بھی پابندی نصیب فرمائے اور منافقت اور غفلت سے محفوظ فرمائے۔

مسائلِ جمعہ

جمُعہ فرض عین ہے اور اس کی فرضیت ظہر سے زیادہ مؤکد ہے اور اس کا منکر کافر ہے۔ اس کی فرضیت کا ثبوت قرآن اور احادیثِ مبارکہ اور اجماعِ امت سے ہے۔ جمعہ کی فرضیت کا حکم مدینہ پاک میں نازل ہوا۔

جمُعہ کے صحیح ہونے کی شرائط

(۱) شہر یا فنائے شہر (۲) سُلطان یا اُس کا نائب (۳) اذنِ عام (۴) وقتِ ظہر (۵) جماعت (۶) خطبہ۔

جمُعہ کے وجوب کی شرائط

(۱) مرد ہونا (۲) آزاد ہونا (۳) مقیم ہونا، یعنی مُسافر نہ ہو۔ (۴) تندرست ہونا (۵) انکھیارا ہونا (۶) ٹانگوں کا سلامت ہونا (۷) بالغ ہونا۔

مزید تفصیل کے لئے "بہارِ شریعت" حصہ چہارم کا مطالعہ کیا جائے۔

اس حدیث سے بظاہر غُسل کا وُجوب ثابت ہو رہا ہے اور ایک حدیث

غُسلِ جُمُعہ میں صیغۂ امر بھی ہے فَلیَغتسِل اس سے فرقہ ظاہریہ نے جُمُعہ کے غسل کے وجوب کا قول کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ شروع میں غسلِ جمعہ کا وجوب تھا پھر اس کا وجوب منسوخ ہو گیا اور استحباب باقی ہے تفصیل یہ ہے کہ شروعِ اسلام میں لوگ بہت ہی غریب تھے اور اپنا کاروبار خود کرتے اور موٹے صوف کے کپڑے پہنا کرتے تھے اور وہ جمعہ شریف کے دن مسجد پاک میں آتے، تو گرمی کی شدت کے باعث پسینہ سے اُن کے کپڑوں سے بُو آنے لگتی۔ اس لئے حضور سیدِ عالم نبیِٔ مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جب جمعہ کے لئے آؤ تو غسل کر کے آؤ، مگر یہ سبب زائل ہو گیا اور لوگ جب خوشحال ہو گئے۔ تو غسل کا وجوب بھی منسوخ ہو گیا۔ کیونکہ حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس نے جمعہ کے دن کا وضو کیا، اچھا ہے اور جس نے غسل کیا، تو غسل کرنا افضل ہے۔ اِس حدیث کو امام ترمذی علیہ الرحمہ نے حسَن کہا ہے، لہٰذا جس حدیث میں صیغہ امر ہے، اس امر کو استحباب پر محمول کیا جائے گا اور اس حدیث میں لفظ واجب بمعنیٰ ثابت ہو گا یا ابتدا اسلام پر وجوب محمول ہو گا۔

وجوب کے منسوخ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے جو حدیث بخاری شریف میں بھی موجود ہے کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جمعۃ المبارک کے روز خطبہ دے رہے تھے اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اثناء خطبہ تشریف لائے۔ امیر المومنین نے فرمایا: اے عثمان! اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اذان کے بعد وضو کر کے آگیا ہوں۔ امیر المومنین نے فرمایا: "صرف وضو ہی کر کے آئے ہو؟" اگر جمعہ شریف کے روز غسل واجب ہوتا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صرف وضو ہی پر اکتفا نہ کرتے۔ پھر امیر المومنین خاموش نہ رہتے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غسل کرنے پر مجبور کرتے، جبکہ مہاجرین و انصار سب موجود تھے۔

تو معلوم ہوا کہ جمعہ کے روز غسل کرنا واجب نہیں۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے۔ فلیغتسل والا، امر استحبابی ہے۔

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے مؤطا میں اپنے اسناد کے ساتھ ابراہیم نخعی سے روایت کی کہ حماد نے کہا میں نے ابراہیم نخعی سے پوچھا کہ جمعہ کے روز پچھنے لگوانے کے بعد، اور عیدین میں غسل کرنا کیسا ہے؟ انہوں نے فرمایا:

غسل کر لینا اچھا ہے، اگر نہ بھی کیا جائے، تو کوئی حرج نہیں۔

میں نے کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ جو جمعہ پڑھنے جائے، وہ غسل کرے۔ ابراہیم نخعی علیہ الرحمہ نے فرمایا "ہاں ضرور فرمایا ہے، لیکن آپ کا یہ ارشاد امور واجبہ سے نہیں ہے" یہ ایسا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَسْتَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ۔ یعنی جب بیع کرو، تو گواہ بنالو۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ "جس نے جمعہ کے دن غسل کیا وہ بہتر ہے اور جس نے غسل نہ کیا، اس کیلئے غسل ضروری بھی نہیں"۔ الحاصل شروع اسلام میں جمعہ کے لئے غسل واجب تھا، پھر منسوخ ہوگیا۔

صاحب ہدایہ نے کہا: جمعہ کے روز غسل میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ اسی غسل کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھے، حتی کہ اگر جمعہ کی نماز سے پہلے، غسل کے بعد بے وضو ہو جاتے یا جمعہ کی نماز کے بعد غسل کرے تو اسے پورا ثواب نہ ملے گا، جو غسل کے بعد نماز پڑھنے میں حاصل ہوتا ہے۔ صاحب ہدایہ نے اس قول کی تصحیح کی ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک فجر کے بعد کافی ہے۔ [1]

حضرت حسن بن زیاد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں "یہ غسل یوم جمعہ کی فضیلت کیلئے ہے" اور مبسوط میں ہے کہ یہ قول امام محمد علیہ الرحمہ کا ہے اور محیط میں ہے امام ابو یوسف علیہ الرحمہ سے بھی ایک روایت اسی کی مثل ہے۔ کذا فی العینی۔

---

[1] تفہیم البخاری جلد دوم

ایصالِ ثواب کا بیان

حدیث ۳۴: عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمِّیْ اُفْتُلِتَتْ نَفْسُہَا وَاَظُنُّہَا لَوْ تَکَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ فَہَلْ لَہَا اَجْرٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْہَا قَالَ نَعَمْ۔ (بخاری جلد اوّل ص۱۸۶، مسلم جلد اوّل ص۳۲۴)

حلِّ لغات اُمِّیْ: میری ماں۔ اُفْتُلِتَتْ: اچانک فوت ہوگئی۔ تَکَلَّمَتْ: کلام کرتی۔ تَصَدَّقَتْ: صدقہ کرتی۔

ترجمہ: اُمّ المومنین سیدہ عائشہ[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں عرض کی کہ میری والدہ کا اچانک انتقال ہوگیا ہے۔ میرا گمان ہے اگر وہ کلام کرتی، تو صدقہ کرتی۔ کیا اگر میں اُس کی طرف سے صدقہ کروں، تو اسے ثواب ہوگا۔؟ آپ نے فرمایا: ہاں!

---

[1] ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہجرت سے دو سال قبل آپ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا، جبکہ ان کی عمر باختلافِ روایات ۶ یا ۷ سال تھی، اور ۹ سال کی عمر تھی کہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گھر آئیں، ان کی کنیت ام عبداللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرار دی آپ الصدیقۃ المبریۃ البراۃ ہیں۔ اکابر صحابہ آپ سے فرائض کا سوال کیا کرتے تھے۔ آپ افقہ الناس کے گروہ سے تھیں۔ عروہ نے کہا کہ میں نے آپ سے زیادہ عالمِ فقہ، طب اور شعر میں کسی کو نہیں پایا۔ اگر بالفرض آپ کی کوئی بھی فضیلت نہ ہوتی، صرف آیاتِ افک جو آپ کے بارے میں نازل ہوئیں، آپ کی فضیلت اور علوِ مجد کے لئے کافی ہیں۔ آپ کثیر الروایۃ ہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین نے آپ سے روایت کی ہے کہ آپ کی وفات باختلافِ روایات ۵۷ھ، ۵۸ھ، ۱۷ رمضان کو ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر، جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وصال فرمایا ۱۸ سال تھی، بقیع میں رات کو دفن ہوئیں (اسد الغابہ ج ۵، ص۵۰۳)

تشریح و توضیح اس حدیث کو امام بخاری علیہ رحمۃ الباری نے باب موت الفجاءۃ بغتۃ (اچانک موت) میں تخریج کیا۔ آپ کا مقصد اس حدیث کی تخریج سے یہ ہے کہ اچانک موت مکروہ نہیں ہے، کیونکہ جب اس شخص نے اپنی والدہ کے اچانک مرجانے کی خبر دی، تو آپ نے اس پر کراہت کا اظہار نہیں فرمایا۔ (فتح الباری) اگر یہ کہا جائے کہ ابو داؤد نے عبید بن خالد سلمی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "اچانک موت اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔" اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ذکر کی کہ حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم ایک دیوار کے پاس سے تیزی سے گزرے، جو زمین کی طرف مائل تھی اور فرمایا: میں اچانک موت کو برا جانتا ہوں۔ علامہ کرمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے روایت کی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میں گدھے کی موت جیسی موت کو برا جانتا ہوں۔ آپ سے عرض کیا گیا، گدھے کی موت کیسی ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا: "اچانک موت۔"

بخاری کی یہ روایت ان روایات کے متعارض ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری کی روایت کا محمل وہ شخص ہے، جس نے موت کی تیاری کی ہو اور اچانک مرجائے اور دوسری روایات کا محمل وہ شخص ہے، جو تیاری سے غافل ہو، کیونکہ نہ تو اس میں وصیت کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کو توبہ نصیب ہوتی ہے۔" (تفہیم البخاری، جلد ۲)

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے سیدہ عائشہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے: مَوْتُ الْفَجَاءَةِ رَاحَةٌ لِلْمُؤْمِنِ وَاَسَفٌ عَلَى الْفَاجِرِ

اچانک موت مومن (کامل) کے لئے راحت ہے اور فاجر کے لئے غضب ہے۔ (فتح الباری)

آجکل موت کے اسباب بہت زیادہ ہیں، کوئی ایکسیڈنٹ سے مر رہا ہے، تو کسی پر مرضِ دل کا حملہ ہو جاتا ہے، کوئی بیٹھا بیٹھا اچانک مر جاتا ہے نہ وصیت

کا موقع ملتا ہے نہ توبہ کا، اس لئے ہر مسلمان کو چاہیئے موت کے لئے تیار رہے، جو جو وصیت کرنی ہو، اس کو لکھ کر رکھے۔ کسی کا لین دین ہو تو وہ بھی لکھا ہوا ہو، ہر وقت توبہ کرتا رہے، جو اس طرح کرے گا، اوپر والی روایت کے مطابق اچانک موت اُس کے لئے راحت ہو گی، نہ کسی پر وہ بوجھ بنا اور نہ کسی کا محتاج ہوا۔ اس حدیث میں شخص سے مُراد حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور اُن کی والدہ کا نام عمرہ ہے۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ کونسا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا، اَلْمَآءُ۔ یعنی پانی کا، تو آپ نے ایک کنواں کھدوایا اور اس کا نام رکھا اُمّ سعد کا کنواں۔ اور مسلم شریف کی روایت میں ہے: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، بے شک میرا باپ مر گیا ہے اور اس نے مال چھوڑا ہے اور وصیت کچھ نہیں کی، کیا اُس کے لئے کافی ہوگا اگر میں اس کی جانب سے صدقہ کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! (عینی جلد ۸)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ میت کی جانب سے صدقہ کرنا جائز اور اس کا نفع میت کو ہوتا ہے۔ امام احمد نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی عاص بن وائل نے جاہلیت میں نذر مانی کہ سو اُونٹ کی قربانی کرے گا اور وہ نذر پوری کرنے کے بغیر ہی مر گیا۔ اس کے بیٹے ہشام نے اس کی طرف سے پچاس اُونٹ قربان کر دیئے اور عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارادہ کیا کہ اپنے حصے کے پچاس اُونٹ قربان کر دے، لیکن اُنہوں نے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، تو آپ نے فرمایا:

اَمَّا اَبُوْكَ فَلَوْ اَقَرَّ بِالتَّوْحِيْدِ اگر تیرا باپ توحید کا اقرار کرتا اور تو اُس

فَصُمْتَ وَتَصَدَّقْتَ عَنْهُ کی جانب سے روزہ رکھتا اور صدقہ کرتا
نَفَعَهُ ذَالِكَ۔ (عینی ج ۵ ص ۲۲) تو اُس کو نفع ہوتا۔"

معلوم ہوا مسلمان میت کی جانب سے صدقہ اور روزہ جائز ہے اور اُس کو فائدہ ہوتا ہے۔

ایصالِ ثواب

اس حدیث اور مذکورہ بالا روایات متعلقہ ایصالِ ثواب کا جواز ہوتا ہے اور میت کو نفع ہوتا ہے، بشرطیکہ مرنے والا مسلمان اور مومن ہو۔ امامِ اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک عباداتِ مالیہ اور عباداتِ بدنیہ کا ثواب فوت شدہ لوگوں کو پہنچانا جائز ہے اور امام مالک اور امام شافعی علیہما الرحمہ کے نزدیک عباداتِ مالیہ کا ثواب پہنچانا جائز ہے اور عباداتِ بدنیہ میں، ان کے دو قول ہیں۔

ثابت ہوا کہ ائمہ اربعہ کے نزدیک عباداتِ مالیہ کا ایصالِ ثواب بالاتفاق جائز اور نفع مند ہے۔ صرف عباداتِ بدنیہ، بعض ائمہ کا اختلاف ہے، اور ان کا ایک قول جواز کا بھی ہے جیسا کہ محدث امام نووی شافعی رحمۃ اللہ علیہ شارح مسلم لکھتے ہیں:
(شرح مسلم للسعیدی، جلد دوم)

تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنے سے میت کو ثواب پہنچتا ہے اور اس کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح علماء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ میت کو دعا کا فائدہ پہنچتا ہے اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ میت کی طرف سے قرض ادا کیا جائے، تو اس سے قرض ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میت کی طرف سے فرض حج کرنا بھی صحیح ہے اور جبکہ اُس نے نفلی حج کی وصیت کی ہو تو اس کی طرف سے نفلی حج کرنا بھی صحیح ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر میت سے کچھ روزے رہ گئے ہوں، تو اُس کی طرف سے آیا روزے رکھنا صحیح ہے

یا نہیں ؟ ہمارے نزدیک (یعنی شافعیہ کے نزدیک) راجح یہ ہے کہ اس کی طرف سے روزے رکھنا جائز ہے[1]
ہمارے اصحاب کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ قرآن کی تلاوت کا ثواب بھی پہنچتا ہے ..... امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ حج کی طرح تمام عبادات کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ (ملخصاً شرح مسلم جلد اوّل ص ۳۲۴، ماخوذ از شرح مسلم للسعیدی)
اب مزید روایات لکھی جاتی ہیں، جن سے ثابت ہوگا۔ اعمالِ صالحہ کا ثواب اگر میت کو بخشا جائے تو اُن کو ثواب پہنچے گا اور اس کا میت کو بہت نفع ہوگا۔

(۱) ابوداؤد نے ذکر بصرۃ کے باب میں ابراہیم بن صالح کے طریق سے روایت ذکر کی کہ ایک شخص نے کہا، تم میں سے کون اس کی ضمانت دیتا ہے؟ کہ وہ مسجد عشار میں دو یا چار رکعت پڑھے اور کہے کہ یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے ہیں۔
(تفہیم البخاری جلد دوم ص ۴۴۵)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ عباداتِ بدنیہ، مثلاً نماز، روزہ تلاوتِ قرآن کریم وغیرہا کا ثواب بھی اگر ایصالِ کیا جائے تو میت کو پہنچتا ہے۔

(۲) امام ترمذی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی، ایک شخص نے کہا: "یارسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) میری والدہ فوت ہوگئی ہے۔ اگر میں اس کی جانب سے صدقہ کروں، تو یہ اس کو نفع دے گا؟" آپ نے فرمایا: "ہاں!"
(تفہیم البخاری)

(۳) ابوداؤد نے الصدقۃ عن المیت کے باب میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب کوئی شخص فوت

---

[1] احناف کے نزدیک، اگر وصیت ہو تو حج بدل کیا جاسکتا ہے اور روزوں کا فدیہ دیا جائے گا، نیابۃً روزے نہیں رکھے جائیں گے۔ (عامۃ کتب فقہ حنفیہ)

ہو جائے، تو صرف تین عملوں کے سوا اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔
ایک صدقہ جاریہ، دوسرا علم جس سے لوگ نفع اٹھائیں، تیسرا نیک اولاد" (تفہیم البخاری)
معلوم ہوا اموات کو احیاء کی طرف سے نیک اعمال کا ثواب پہنچتا ہے۔
(۴) حضرت ابو بریدہ اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وصیت کی کہ "ان کی قبر پر کھجور کی دو شاخیں گاڑی جائیں"، چونکہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے ان شاخوں کرنے سے ان کو نفع حاصل ہوگا۔ (تفہیم البخاری، جلد دوم صفحہ ۴۴۶)
(۵) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: (ترجمہ) "مُردہ کی حالت قبر میں ڈوبتے ہوئے فریاد کرنے والے کی طرح ہوتی ہے، وہ انتظار کرتا ہے کہ اس کے باپ یا ماں یا بھائی یا دوست کی طرف سے اس کو دعا پہنچے اور جب اس کو دعا کسی کی طرف سے پہنچتی ہے تو اس دعا کا پہنچنا اسے دنیا وما فیہا سے محبوب تر ہوتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ اہلِ زمین کی دعا سے اہلِ قبور کو پہاڑوں کی مثل اجر و رحمت عطا کرتا ہے اور بے شک زندوں کا تحفہ مُردوں کی طرف یہی ہے کہ ان کے لئے بخشش کی دعا مانگی جائے۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۲۰۶)
اس حدیث سے مُردہ کا دعائے بخشش کا منتظر ہونا اور زندوں کے ہدیئے اور تحفے بھی دعائے بخشش کا اس کے لئے مفید و نافع ثابت ہوتا ہے۔ معمولاتِ اہلِ سنت تیسرا (قُل)، ساتواں، دسواں، چالیسواں اور سالانہ ختمات میں دعا، قرآن خوانی ایصالِ ثواب ہی ہوتا ہے، ان میں کونسی قباحت ہے اور مذکورہ احادیث و روایات ان معمولات کی اصل ہیں اور دلیلِ جواز ہیں۔
(۶) ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم) میں اپنے والدین کے ساتھ جب وہ زندہ تھے نیک سلوک کیا کرتا تھا، اب اُن کے ساتھ کیسے نیکی کروں؟" آپ نے ارشاد فرمایا: "اب تیرا ان کے

ساتھ نیکی کرنا یہ ہے کہ تو اپنی نماز کے ساتھ اُن کے لئے بھی (نفلی) نماز پڑھے اور اپنے روزوں کے ساتھ ان کے لئے بھی (نفلی) روزے رکھے۔ (شرح الصدور ص ۱۲۹)

ثابت ہوا عبادات بدنیہ کا بھی ایصالِ ثواب درست اور جائز ہے۔ آجکل جو ایصالِ ثواب کی محافل کو رد کرتے ہیں اور منع کرتے ہیں اور ناجائز و حرام کا فتویٰ دیتے ہیں، اُن کے امام اسمٰعیل دہلوی صراطِ مستقیم ص ۶۴ پر لکھتے ہیں:

نہ پندارند کہ نفع رسانیدن باموات باطعام و فاتحہ خوانی خوب نیست چہ ایں معنی بہتر و افضل است۔

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ مردوں کو اطعام اور فاتحہ خوانی کے ساتھ نفع پہنچانا خوب نہیں ہے، کیونکہ یہ بات بہتر اور افضل ہے۔

مولوی اشرف علی تھانوی نے ایصالِ ثواب کے ایک استفتا کے جواب میں لکھا ہے:

فی شرح الصدور بتخریج الطبرانی عن ابی عمرو قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا تصدق احدکم صدقۃ تطوعا فیجعلھا عن ابویہ فیکون لھما ولاینقص من اجرہ شیئًا۔

شرح صدور میں طبرانی کی تخریج کے ساتھ حضرت ابو عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ سے حضور اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے جب کوئی صدقہ نفلی کرے اور اس کا ثواب والدین کو بخشے تو اُن کو پہنچے گا اور صدقہ کرنے والے کے اجر سے کچھ نہ کم ہوگا۔

یہ حدیث نص ہے اس میں ہے کہ ثواب بخشنے سے عامل کے پاس پورا ثواب رہتا ہے اور صحیح مسلم کی حدیث مَنْ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً (الحدیث) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج ۵، ص ۳۹۹)

جب آپ نے مسئلہ ایصالِ ثواب کو اچھی طرح سے سمجھ لیا، تو یہ بھی جان لیجئے کہ گیارھویں شریف، کونڈوں کا ختم، امام حسین (رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ) کی سبیل، ساتواں، تیجا، چہلم، برسی اور عُرس مبارک وغیرہ یہ سب ایصالِ ثواب کے نام ہیں ——

اور ایصالِ ثواب قرآن وحدیث اور اقوالِ ائمہ سے ثابت ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، تو اب ان کے جواز میں کیا شبہ رہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے "ردالمختار" باب زیارۃ القبور اور رسالہ "ثواب العبادات" مؤلفہ مفتی مولانا محمد شفیع اوکاڑوی اور ایصالِ ثواب کے موضوع پر رسالہ "کشف الحجاب" مؤلفہ مولانا علامہ سید محمد نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

صدقہ کرنے کا بیان

حدیث ۲۵: عَنْ عَدِیِّ بْنِ حَاتِمٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ۔ (بخاری جلد اوّل صفحہ ۱۹۰ مسلم جلد اوّل صفحہ ۳۲۷)

حلِ لغات: اِتَّقُوْا: بچو تم۔ شِقّ: ایک حصہ۔ تَمْرَۃ: ایک کھجور۔

ترجمہ: "عدی[1] بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آگ سے بچو، اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا صدقہ کر کے۔"

---

[1] ابو طریف عدی بن حاتم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ان کا باپ وہی حاتم طائی ہے جس کی سخاوت میں ضرب المثل ہے۔ شعبان ۹ھ اور بروایتے ۱۰ھ میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ پہلے نصرانی تھے ایام ردت میں اسلام پر جمے رہے اور اپنی قوم کو بھی مرتد نہیں ہونے دیا۔ جواد، شریف، بزرگ قوم اور حاضر جواب تھے۔ جب دربارِ رسالت میں حاضر ہوتے حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اکرام فرماتے۔ فتوح عراق، جنگ قادسیہ، مہران اور جنگ جسر میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شام اور دیگر بعض فتوحات میں بھی حاضر رہے۔ جنگِ جمل میں اُن کی ایک آنکھ جاتی رہی اور اُن کا ایک بیٹا محمد شہید ہوا ۔۔۔ اور

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

تشریح و توضیح اس حدیث میں صدقہ کرنے پر اُبھارا ناہے بحسبِ استطاعت چاہے قلیل چاہے کثیر۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بوجھ وغیرہ اُٹھا کر اور مزدوری کر کے صدقہ کرتے۔ ایک صحابی ابوعقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کنوئیں سے ڈول نکال کر مزدوری کی اور اس مزدوری سے ایک صاع صدقہ کیا، تو لوگوں نے کہا: خدا تعالیٰ اس کے ایک صاع کے صدقہ سے غنی ہے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آٹھ ہزار یا چار ہزار کا صدقہ کیا تو لوگوں نے کہا: یہ ریا کار ہے۔ اُس وقت یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔

وَالَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ — یعنی جو لوگ زیادہ صدقہ کرنے والے مومنوں کو اور ان لوگوں کو عیب لگاتے ہیں جو مشکل سے مال حاصل کرتے ہیں۔

معلوم ہوا متصدق چاہے کثیر صدقہ کرے چاہے قلیل اس پر عیب نہیں لگانا چاہیے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صدقہ جہنم سے بچاتا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: "جہنم سے بچو، چاہے کھجور کا صدقہ کر کے۔"

بعض روایات میں ہے "اپنے اور جہنم کے درمیان حجاب کرو، اگرچہ کھجور کے ٹکڑے کے ساتھ۔" عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے اسناد حسن کے ساتھ۔

لِيَتَّقِ اَحَدُكُمْ وَجْهَهٗ بِالنَّارِ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ۔ — چاہیے کہ تم میں سے کوئی اپنے چہرے کو آگ سے بچائے اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا صدقہ کر کے۔

(حاشیہ گزشتہ صفحہ سے) دوسرا بیٹا خوارج کی لڑائی میں شہید ہوا۔ جنگِ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے۔ ۶۷ھ میں اور بقول بعض ۶۸ھ اور بقول بعض ۶۹ھ میں وفات پائی۔ ایک سو بیس برس عمر پائی۔ بعض نے کہا مختار کے عہد میں کوفہ میں وفات پائی۔ بعض نے قرقیسا کا نام لیا، مگر اوّل صحیح ہے۔ (اسد الغابہ، جلد ۳ ص ۲۹۲)

ایک روایت میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ارشاد فرمایا: "آگ سے پردہ کر، اگرچہ ایک کھجور کے ٹکڑے کے ساتھ۔" اسی لئے جب ایک عورت سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس خیرات مانگنے کے لئے آئی اور اُس کے ساتھ دو بچیاں تھیں۔ آپ نے ایک کھجور بطورِ صدقہ عطا کر دی، اُس عورت نے اس کھجور کے دو حصے کر کے اپنی بچیوں میں تقسیم کر دیئے اور خود کچھ نہ کھایا۔

(عمدۃ القاری۔ فتح الباری) اسی حدیث کے تحت فتح الباری میں ہے۔

فی الحدیث الحث علی الصدقۃ بما قلّ وما جلّ وان لا یحتقر ما یتصدق بہ وان الیسیر من الصدقۃ یستر المتصدق من النار (ص ۲۲۵ ج ۲)	حدیث میں صدقہ پر ابھارنا ہے قلیل ہو یا کثیر اور صدقہ کرنے والا جو بھی صدقہ کرے اُس کو حقیر نہ جانے اور تھوڑا صدقہ بھی متصدق کو جہنم سے بچاتا ہے۔

بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے جس کا مفہوم اس طرح ہے "سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے پاک کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کیا اور حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف پاک مال کو قبول فرماتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دائیں دستِ قدرت (جو اُس کی شان کے لائق ہے) میں لیتا ہے، پھر صدقہ کرنے والے کے لئے اُس کو بڑھاتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کا بچہ پالتا ہے، حتیٰ کہ صدقہ پہاڑ جیسا ہو جاتا ہے۔"

کتنا کرم ہے خداوند کریم جل وعلا کا کہ ایک کھجور کے برابر صدقہ کرنے کا اجر و ثواب پہاڑ کے برابر عطا فرماتا ہے لیکن شرط ہے حلال اور پاک کمائی ہو اور اخلاص کے ساتھ ہو، کیونکہ ہر عمل کے مقبول ہونے کے لئے اخلاص شرطِ اوّل ہے۔ ریاکار کا عمل مولا تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوتا بلکہ رد کر دیا جاتا ہے۔ جب اُس نے عمل دکھلاوے کے ارادہ پر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا ہی نہیں، تو اس پر امیدِ اجر و ثواب کس طرح ہو سکتی ہے؟

اُس کو تو صرف دُنیا دی تعریف اور لوگوں سے داد و دہش حاصل کرنا ہے، وہ ہو رہی جاتی ہے۔ مولیٰ تعالیٰ جل شانہٗ اعمالِ صالحہ کی توفیق اور اپنے راہ میں خرچ کرنے کی استطاعت عطا فرمائے اور اخلاصِ عمل بھی۔ اور ریاکاری سے بچائے۔

عورت کا اپنے خاوند کے مال سے خرچ کرنا

حدیث ۳۶: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَنْفَقَتِ الْمَرْاَةُ مِنْ كَسْبِ زَوْجِهَا مِنْ غَیْرِ اَمْرِهٖ فَلَهَا نِصْفُ اَجْرِهٖ۔

(بخاری جلد دوم ص۸۰۸، مسلم جلد اوّل ص۳۳۲)

حلِ لغات: اَنْفَقَتِ: خرچ کرے۔ کَسْبِ زَوْج: خاوند کی کمائی۔

ترجمہ: "سیدنا حضرت ابوہریرہ[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: جب عورت اپنے خاوند کی کمائی سے بغیر اس کے حکم سے خرچ کرے (راہِ خدا میں) تو اس کو آدھا اجر (ثواب) ملے گا۔"

تشریح و توضیح اس حدیث سے معلوم ہوا، جب عورت اپنے خاوند کی کمائی سے کسی محتاج، ضرورت مند پر صدقہ و خیرات کرے تو جہاں اُس کے خاوند کو اجر و ثواب ملے گا، وہاں اس عورت کو بھی اجر و ثواب حاصل ہوگا، لیکن اس جگہ ایک سوال واقع ہوتا ہے کہ بعض احادیث میں ہے کہ عورت کو حق نہیں ہے کہ وہ خاوند کی اجازت کے بغیر صدقہ یا خیرات کرے۔ (اپنی کمائی سے خرچ یا صدقہ کر سکتی ہے) اس مضمون کی حدیث کی تخریج کی ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن کہا اور مذکورہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت اپنے خاوند کے مال سے صدقہ کر سکتی ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ وہ صدقہ کرنے میں مفسدہ نہ ہو یعنی

[1] آپ کے حالات حدیث ۹ کے حاشیہ پر درج ہیں۔ ۱۲ منہ

خاوند کے مال کو ضائع کرنے کی غرض سے صدقہ نہ کرے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ چیز رطب ہو تو صدقہ کر سکتی ہے، یعنی اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو جیسا کہ سبزیات وغیرہ۔ ابوداؤد شریف میں رطب سے مراد روٹی اور سبزی وغیرہ ہے۔۔ اب ان روایات میں تطبیق کس طرح ہو گی؟ اس کے جواب میں علامہ بدر الدین عینی شارح بخاری نے اس طرح تطبیق فرمائی۔ فرماتے ہیں: ان میں تطبیق اس طرح کی جائے گی۔ اس مسئلہ کی صورتیں مختلف ہیں۔ شہروں اور ملکوں کی عادات مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح خاوند کا حال مختلف ہوتا ہے۔ بعض درگزر کرنے والے ہوتے ہیں اور بعض ناپسند کرتے ہیں! در بعض قلیل خرچ کرنے پر راضی ہوتے ہیں اور کثیر خرچ کرنے پر ناراض ہوتے ہیں لہٰذا شہر و ملک کی عادت اور خاوند کی عادت سے اگر معلوم ہو کہ عورت کو خاوند کے مال سے قدرے خرچ کرنے اور صدقہ ہونے میں عرفاً رواج ہے اور خاوند بھی اتنا صدقہ کرنے کو محسوس نہ کرے گا، پھر تو خرچ کرنا جائز اور موجبِ اجر ہو گا اور اگر عرفاً رواج اور خاوند کی عادت سے معلوم ہو کہ وہ اس طرح راضی نہ ہو گا، تو پھر عورت کو خرچ کرنا اور صدقہ کرنا شرعاً جائز نہ ہو گا۔[1] جیسا کہ امام نووی شارح مسلم نے فرمایا کہ خادم، بیوی، مالک اور شوہر کی اجازت کے بغیر صدقہ نہیں کر سکتے۔

اجازت کی دو قسمیں ہیں: ایک صریح، مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں شخص کو اتنی چیز دے دو۔ اور ایک اجازت عرفی، مثلاً خادم یا بیوی کو معلوم ہو کہ مقدار معمولی ہے مثلاً ایک روٹی یا اس کے برابر کسی فقیر کو دے دینے سے مالک یا شوہر کو ناراضگی نہیں ہوتی، تو اتنی مقدار میں دینا جائز ہے۔۔ اور جن احادیث میں جو ذکر ہے کہ شوہر یا مالک کی اجازت کے بغیر صدقہ کرنے سے اجر ملتا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ صریح اجازت اگرچہ نہ ہو، لیکن عرفی اجازت حاصل۔۔ اور اگر مطلقاً اجازت نہ ہو تو پھر

---

[1] عمدۃ القاری، جلد ۸، ص۲۹۲

ان کو صدقہ کرنا جائز نہیں ہے۔ ؎

اِس جگہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث مذکور میں ہے اس کو آدھا اجر ملے گا، جبکہ بخاری شریف کی بعض روایات میں ہے، اس کو کامل اجر ملے گا۔ ان روایات میں تطبیق کس طرح ہو گی؟ اس کا جواب عمدۃ القاری جلد ۱۱ صفحہ ۱۸ میں اس طرح ہے: فرمایا ابن التین نے کہ دونوں حدیثیں متعارض نہیں ہیں۔ آپ کے ارشادِ مبارک لها نصف اجره کا مفہوم اس طرح ہے کہ خاوند کا اجر اور عورت کا مسکین کو عطا کرنے کا اجر دونوں جگہ جمع ہوں گے اور اس مجموعہ سے خاوند کو نصف اجر ملے گا۔ لیکن اپنا اپنا اجر کامل ہو گا، جن روایات میں کامل اجر کا ذکر ہے۔ ان سے مراد اپنا اجر ہے اور جن روایات میں نصف ہے، وہ دونوں کے مجموعہ کا نصف ہے، اور علامہ منذری علیہ الرحمہ نے فرمایا:

هو على المجاز انهما سواء فى المثوبة كل واحد منهما له اجر كامل وهما اثنان فكانهما نصفان۔

یعنی یہ مجاز پر محمول ہو گا کہ بیشک وہ دونوں اجر میں برابر ہوں گے، ہر ایک کو اجر کامل حاصل ہو گا، پس وہ دو اجر ہوئے گویا کہ وہ دو نصف ہوئے۔

بعض نے فرمایا یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ بے شک ان کا دو مثل ہے پس وہ اس کے مشابہ ہو گیا جیسا کہ ایک شئے دو حصوں کی جانب منقسم ہو۔"

الغرض مرد کو کمانے اور عورت کو صدقہ کرنے کا اجر کامل حاصل ہو گا ہر ایک کو اپنے عمل کا پورا پورا اجر ملے گا۔ خداوند کریم سب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

وَاللّٰہُ تعالیٰ اعلم بالصواب

؎ شرح مسلم للسعیدی، جلد دوم، صفحہ ۱۵۹

اُوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے

حدیث ۳۷: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَذَكَرَ الصَّدَقَةَ وَالتَّعَفُّفَ وَالْمَسْئَلَةَ اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى فَالْيَدُ الْعُلْيَا هِيَ الْمُنْفِقَةُ وَالسُّفْلٰى هِيَ السَّائِلَةُ۔

(بخاری، جلد اوّل ص ۱۹۲، مسلم، جلد اوّل، ص ۳۳۲)

حلِ لُغات التعفف: مانگنے سے بچنا۔ الید العُلیا: اُونچا ہاتھ۔ الید السفلیٰ: نیچا ہاتھ۔ المنفقۃُ: خرچ کرنیوالا۔ السائلۃ: مانگنے والا۔

ترجمہ: "حضرت سیدنا ابن عمر[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منبر شریف پر تشریف فرما ہو کر ارشاد فرمایا اور صدقہ اور مانگنے سے بچنے کے متعلق اور (برائی) مانگنے کی ذکر فرمائی کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اُوپر والا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے اور نیچے والا ہاتھ سوال کرنے والا ہے۔"

تشریح و توضیح اس حدیث میں حضور سیدِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منبر پر جلوہ افروز ہو کر صدقہ کے بارے میں سوال سے بچنے پر ترغیب بیان فرمائی اور فرمایا مانگنے سے بچو، مانگنے کی شدید مذمت فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا ہاتھ بُلند اور مانگنے والا ہاتھ نیچا اور بُلند ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے معلوم ہوا بغیر ضرورتِ شدیدہ کے مانگنا ناپسند اور مکروہ ہے

[1] حدیث ۱ حاشیہ میں آپ کے حالات پڑھیں۔

صَدقہ زکوٰۃ تو فرض ہے اور وہ بھی صدقہ ہے، لیکن وہ تو صرف صاحبِ نصاب پر لازم ہوتی ہے، اس کے علاوہ صدقاتِ نافلہ ہوتے ہیں جو کہ صاحبِ نصاب اور نصاب سے کم مالیت والے بھی کر سکتے ہیں، بلکہ بعض صدقات فقراء اور مساکین بھی کر سکتے ہیں، جیسا کہ تسبیحات و تکبیرات بھی صدقہ کا حکم رکھتی ہیں بلکہ کسی سے ہنستے چہرے کے ساتھ ملنا بھی صدقہ ہوتا ہے اور یہ صدقات موجبِ اجر و ثواب اور بلیّات و آفات کے ٹلنے کا سبب ہوتے ہیں، جیسا کہ روایت میں ہے:-

عَلَيْكُمْ بِالصَّدَقَةِ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيَدْرَأُ بِالصَّدَقَةِ سَبْعِيْنَ بَابًا مِّنَ الْبَلَاءِ اَيْسَرُهَا الْجُذَامُ وَالْبَرَصُ۔ (کشف الغمہ)

اپنے اوپر صدقہ لازم کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صدقہ کی برکت سے ستر دروازے بلاؤں کے دفع فرماتا ہے، ان کا معمول اور آسان دروازہ جذام (کوڑھ) برص (سفید داغ) ہے۔

حضرت امیر المومنین علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ حضور سیّد عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بَادِرُوْا بِالصَّدَقَةِ فَاِنَّ الْبَلَاءَ لَا يَتَخَطَّاهَا۔ مشکوٰۃ شریف ص۱۶۷

صدقہ کرنے میں جلدی کرو، بے شک بلائیں اس سے تجاوز نہیں کرتیں۔ (یعنی ٹل جاتی ہیں۔)

ان مبارک حدیثوں سے ثابت ہوا کہ مصائب و بلیّات اور آفات کا واحد علاج صدقہ ہے اور صدقہ کی برکت سے مصیبت ٹل جاتی ہے اور مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ صدقات گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں، جیسا کہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے، جس میں فتنہ کا ذکر کیا گیا حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ مجھے فتنہ کے بارے حدیث یاد ہے، جس طرح آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا تو حضرت عمر فاروق

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تم اس پر جرأت مند ہو، بتاؤ وہ حدیث کیا ہے؟ سیدنا عمر فاروق سے حضرت حذیفہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے کہا: مرد کی بیوی، اولاد اور ہمسایہ میں فتنہ ہوتا ہے اور نماز، صدقہ، اچھی بات اس کے لئے کفارہ ہے ملخصاً۔

معلوم ہوا صدقہ سے گناہ مٹ جاتے ہیں۔

اور صدقات گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں، لیکن جس طرح ہر عمل میں اخلاص شرط ہے۔ اسی طرح صدقات بھی وہی نفع بخش اور فائدہ مند ہوتے ہیں، جس میں اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب ہو اور اُن کو احسان جتلانے اور تکلیف پہنچانے کی وجہ سے ضائع نہ کرلیا ہو، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۔
"اپنے صدقات احسان جتلانے اور تکلیف پہنچانے کے ساتھ باطل نہ کرو۔"

جس پر صدقہ کرے اس کا احسان جانے کہ اس نے صدقہ قبول کرلیا، اس پر احسان جتلانے اور اس کو حقیر جاننے اور اس کو تکلیف و اذیت پہنچانے سے صدقہ کا اجر و ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

سوال کرنے کی مذمت

بغیر حاجت شدیدہ اور سخت مجبوری کے سوال کرنا اور لوگوں سے مانگنا سخت مکروہ اور ناپسندیدہ امر اور موجب ذلت و رسوائی ہے، بلکہ چاہیے اپنے ہاتھ سے محنت و مشقت کر کے گزارہ کرے اور صبر و قناعت کرے، بلکہ اس طرح وقت گزارنا مانگنے کی ذلت سے ہزار ہا درجہ بہتر ہے، جیسا کہ بخاری اور مسلم شریف میں ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَاَنْ يَّاْخُذَ

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری

اَحَدُکُمْ حَبْلَہٗ، فَیَحْتَطِبَ عَلٰی ظَہْرِہٖ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَنْ یَّاْتِیَ رَجُلًا فَیَسْأَلُہٗ اَعْطَاہُ اَوْ مَنَعَہٗ۔ (بخاری جلد اوّل باب استعفاف المسئلۃ)	جان ہے، تم میں سے کوئی شخص رسی پکڑے اور اپنی پیٹھ پر لکڑی کا گٹھا لاد کر لائے اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی شخص کے پاس آئے اور اس سے سوال کرے، وہ اسے دے یا نہ دے۔

معلوم ہوا کہ محنت و مزدوری کر کے کمانا اور کھانا، لوگوں سے مانگنے سے بچنا، بہت بہتر ہے، کیونکہ اس طرح نفس ذلیل و خوار ہوتا اور اس کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ در بدر پھرنا اور گداگری کرنا اور گلیوں میں گھوم کر مانگنا اور طرح طرح کے حیلوں، بہانوں سے مانگنا اور جھوٹ بولنا، کبھی ماں باپ کی بیماری ظاہر کرنا اور کبھی بے گھر ہونے کا بہانہ بنانا اور مال جمع کرنا اور گداگری کو پیشہ بنا لینا بہت ہی معیوب امر اور ذلّت و رسوائی کا باعث اور آخرت میں تباہی و بربادی کا سبب ہے۔ حدیث میں ہے سیّدِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: جو لوگوں سے اپنا مال بڑھانے کے لئے سوال کرتا ہے، وہ اپنے لئے (جہنّم کے) انگاروں کا سوال کر رہا ہے۔ (اب اُس کی مرضی) خواہ کم سوال کرے، یا زیادہ۔ [1]

اسی طرح ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں میں گھومتا رہتا ہے۔ ایک لقمہ یا دو لقمے ایک کھجور یا دو کھجور لے کر چلا جاتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلّم) مسکین کون ہے؟ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: وہ جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو اس کی ضروریات سے اُس کو مستغنی کر دے، اور نہ اس کے آثار سے مسکینی سے فقر کا پتہ چلتے تاکہ اس پر صدقہ کیا جائے، اور نہ وہ لوگوں سے سوال کرتا ہو۔ (بخاری، مسلم)

معلوم ہوا مسکین، فقیر وہ نہیں ہے، جو مروّجہ گداگری کرتا ہے اور در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ ہاں ایسا مسکین ہو جس کی نشاندہی حدیث میں کی گئی ہے جس کو اُس کے

---

[1] مسلم شریف جلد اوّل باب النہی عن المسئلۃ۔

احوال کا پتہ لگ جائے، وہ اس کی مدد کرے اور اس پر صدقہ کرے اور لوگوں سے تعاون کرائے، تو وہ بہت بہتر ہے اور ایسے حاجت مند پر صدقہ کرنے کا بہت اجر و ثواب ہے بغیر ضرورت اور حاجت کے مانگنا قیامت میں ذلت ورسوائی کا سبب ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انسان سوال کرتا رہے گا، حتیٰ کہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔ [1]

ان احادیث و روایات سے ظاہر ہوا لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور مانگنا، اور گداگری کو پیشہ بنانا دنیوی و اُخروی ذلت و رسوائی کا سبب ہوگا اور مالداری کے لئے سوال کرنا ایسا ہے جیسا آگ کے انگاروں کا سوال کرنا اور مانگنے والا کل قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے ایسا ذلیل ورسوا ہوگا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ٹکڑا نہ ہوگا۔ مولیٰ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے صبر و قناعت نصیب فرمائے اور مانگنے کی ذلت و رسوائی سے بچائے۔۔ اس مذکورہ حدیث میں بھی یہی ہے کہ آپ نے صدقہ کرنے پر ابھارا، اور مانگنے کی بُرائی بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا: "اُونچا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔"
خداوند قدوس اپنے راہ میں خرچ کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

اللہ تعالیٰ دیتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بانٹتے ہیں

حدیث ۳۸: عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِيْ وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْاُمَّةُ قَائِمَةً عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ۔
(بخاری شریف جلد اوّل ص۱۶، مسلم جلد اوّل ص۳۳۳)

---

[1] حوالہ مذکورہ

حَلِّ لُغات یُرِدْ، ارادہ فرمائے۔ یُفَقِّهْهُ: سمجھ عطا فرماتا ہے۔
قَاسِمٌ: بانٹنے والا۔ یُعْطِیْ: دیتا ہے۔
لَا یَضُرُّهُمْ: نقصان نہ دے گا۔ یَاْتِیَ: آجائے۔

ترجمہ: "سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے، اُس کو دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے اور میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ عطا فرماتا ہے اور یہ اُمت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہے گی، اُن کی مخالفت کرنے والا اُن کو ضرر نہ دے گا حتیٰ کہ قیامت آجائے۔"

تشریح اس حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ ہر قسم کی بھلائی اور عظیم خیر کا ارادہ فرماتا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ دین کی سمجھ اور بصیرت عطا فرماتا ہے، کیونکہ اس میں لفظ خَیْرًا کی تنکیر عموم کے لئے یعنی ہر قسم کی بھلائی اور تعظیم کے لئے ہے یعنی عظیم خیر۔ معلوم ہوا جس کو دین میں فقاہت نصیب ہو جائے، اس کو عظیم خیر کثیر حاصل ہو جاتی ہے، اس کی دُنیا و دین سنور جاتی ہے اور اُس کو دُنیوی، اُخروی سعادتیں مل جاتی ہیں اور آپ نے فرمایا: "میں تو صرف تقسیم کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔"

اس جگہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے آپ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ اور کلمہ اِنَّمَا حصر کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے آپ صرف قاسم ہی ہیں، حالانکہ آپ رسول، بشیر، نذیر، اس کے علاوہ اور بھی صفات ہیں تو صرف صفت قاسم میں حصر کس طرح درست ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ حصر اضافی ہے۔ اس سامع کے اعتبار سے جو آپ کو معطی اور قاسم سمجھتا ہے یا معطی اور قاسم اعتقاد نہیں کرتا تو اُس کو بطریقہ قصر قلب یا قصر افراد کے سمجھایا جا رہا ہے

کہ میں صرف قاسم ہوں معطی تو اللہ تعالیٰ ہے، اس میں آپ کی دیگر صفات کی نفی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا: میری امت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابند رہے گی، حتّٰی کہ قیامت آجائے معلوم ہوا اجماع اس امت کا حجت ہے اور فرمایا جو ان کی مخالفت کرے گا، وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

(حَتّٰی یَأْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ) سے مراد بعض حضرات نے قیامت لیا ہے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری احادیث میں آتا ہے کہ قیامت اشرار الناس پر قائم ہوگی اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے اہلِ حق قیامت تک رہیں گے، ان میں تطبیق کیسے ہوگی؟ اس کا جواب شارح مسلم علامہ نووی علیہ الرحمہ نے اس طرح دیا ہے یَأْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ سے مراد قربِ قیامت ہے، یعنی جس وقت قیامت کے قریب ایک نرم ہوا چلے گی، اور اس ہوا چلنے پر ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت کا رُوح قبض ہو جائے گا۔ اس کے بعد اشرار رہ جائیں گے، تو قیامت ان پر قائم ہوگی، لہٰذا اس حدیث میں قربِ قیامت مُراد ہے اور دوسری احادیث میں حقیقۃً قیامت مُراد ہے (عینی شرح بخاری ج ۲ ص ۵۲)

لطیفہ: ہوا چلنے والی روایت کو نجدیوں کے امام مولوی اسماعیل دہلوی نے اپنی کتاب "تقویۃ الایمان" میں درج کر کے یہ لکھ دیا ہے کہ آپ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی خبر کے مطابق ہو گیا، یعنی وہ ہوا چل گئی ہے، اس کا مقصد تھا کہ اہلِ سُنّت و جماعت اشرار الناس ہیں، لیکن اس کو سمجھ نہ آئی کہ جب وہ ہوا چل گئی ہے، تو تمام مومنین کے تو ارواح قبض ہو گئے، پھر وہ خود اور اس کے متبعین کس زمرہ اور کس گروہ میں ہوں گے اس میں اس نے خود اپنا اور اپنے متبعین کے کفر کا اقرار کر لیا ہے۔ سچ ہے،

اَلْوھابیۃ قوم لا یعقلون۔

تفقہ فی الدین لفظ تفقہ کا مادہ فقہ ہے، جس کا لغوی معنی فہم (سمجھ، بصیرت) ہے اور اصطلاحی معنی احکامِ شرعیہ فرعیہ کا علم تفصیلی دلائل

سے ہے لیکن اس جگہ لغوی معنی ہی مناسب ہے تاہم علوم دینیہ کے ہر علم کے فہم شامل ہو جائے گے
علامہ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:-

مفہوم الحدیث ان من لم یتفقہ فی الدین ای یتعلم قواعد الاسلام ومایتصل بھا من الفروع فقد حرم الخیر۔ (فتح الباری ج ۱، ص ۱۵۱)

حدیث کا اشارہ اس طرف ہے کہ بیشک جس نے دین میں فقاہت حاصل نہ کی یعنی قوانین اسلامیہ اور جو اس کے ساتھ فرعی مسائل متصل ہیں نہ حاصل کے لئے وہ خیر سے محروم ہو گیا۔

کیا عظمت ہے فقیہ کی کہ اس کو انواع خیر سے کثیر حصہ حاصل ہوتا ہے۔
حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: اَلْفَقِیْہُ ھُوَ الزَّاھِدُ فِی الدُّنْیَا الرَّاغِبُ فِی الْاٰخِرَۃِ الْبَصِیْرُ بِاَمْرِ دِیْنِہٖ الْمُدَاوِمُ عَلٰی عِبَادَۃِ رَبِّہٖ۔ (عینی) "فقیہ وہ ہے جو دُنیا سے بے رغبت ہو، اور آخرت کی جانب راغب ہو، امورِ دینیہ میں بصیر (سمجھدار) اور اپنے رب کی عبادت پر ہمیشگی کرنے والا ہو۔"

ایک روایت میں ہے کہ "فقیہ وہ شخص ہے جس کے دل کی آنکھیں کھُل جائیں اور وہ اپنے رب کو دیکھنے لگے۔" (مرقات۔ تفہیم البخاری)

پس حدیث کا معنی واضح ہو گیا کہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بہتری کا ارادہ فرماتا ہے اسے شریعت، طریقت اور حقیقت کا علم عطا کر دیتا ہے اور اُس کے قلب کی آنکھیں کھول دیتا ہے، اور وہ دل کی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھتا ہے۔ "امام الفقہاء سراج الائمہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دل کی آنکھوں سے ۹۹ بار اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا"، فقیہ کے قلب کی ہر نظر اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔ (تفہیم البخاری)
آپ کی عبادت پر مداومت کا یہ حال ہے کہ آپ نے کئی سال عشاء کے وضو سے

فجر کی نماز ادا کی، ساری ساری رات عبادت میں گزار دیتے اور سارا دن دین کے مسائل کے استنباط و استخراج اور فقہ کی تعلیم میں گزارتے۔ فقیہ کی شان میں سرکارِ دو عالم شفیع اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فَقِیْہٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطٰنِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ (مشکوٰۃ۔ کشف الغمہ) ایک فقیہ عالم ہزار عابد سے شیطان پر بہت سخت ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ عالم کا درس دینا اور ایک ساعت یعنی ایک گھڑی ساری رات کو زندہ کرنے سے بہتر ہے۔ (مشکوٰۃ)

معلوم ہوا کہ عالم عابد سے بہتر ہے۔ سیدنا حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرسلاً روایت ہے کہ رسولِ خدا، سرورِ انبیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بنی اسرائیل کے دو شخصوں کے بارے میں پوچھا گیا۔ ایک اُن میں سے عالم تھا، جو فرض نماز پڑھتا تھا۔ پھر بیٹھ جاتا تھا اور لوگوں کو بھلائی کی باتیں سکھاتا تھا، اور دوسرا شخص سارا دن روزے رکھتا اور ساری رات عبادت میں کھڑا رہتا۔ ان میں سے کون افضل ہے؟ حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس عالم کی فضیلت، جو فرض پڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کو نیکی کی باتیں سکھاتا ہے اس عابد پر، جو سارا دن روزہ رکھتا ہے اور ساری رات عبادت کرتا ہے، ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ آدمی پر۔ (مشکوٰۃ ص ۳۶)

سُبحان اللہ! کیا عظمت و شان ہے اور کیا فضیلت ہے عالم اور فقیہ کی کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں جیسی فضیلت مجھ کو تمہارے ادنیٰ پر ہے ایسی فضیلت عالم اور فقیہ کی صائم النہار اور قائم اللیل شب زندہ دار عابد پر ہے، یعنی عالم بہت فضیلت و شان والا ہے اور کیوں نہ ہو کہ عالم غلط کاموں اور محرمات سے خود بھی بچتا ہے اور دوسروں کو بھی بچاتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کی اشاعت و تبلیغ فرماتا ہے اور وہ کام کرتا ہے جس کے لئے انبیاء و رسل مبعوث ہوتے ہیں، اسی لئے ارشاد فرمایا گیا:

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاء۔ "علماء انبیاء کے علوم کے وارث ہیں۔"
عابد صرف اپنے آپ کو ہی بچاتا ہے اور ہر وقت شیطان کے حملوں کے خطرات میں رہتا ہے کسی وقت بھی شیطان اُس کو گمراہ کر سکتا ہے، لیکن عالم کو وہ نورِ بصیرت حاصل ہوتا ہے، جس سے وہ شیطان کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے اور علم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کی حفاظت کرتا ہے جیسا کہ سیدنا علی المرتضیٰ شیرِ خدا کرم اللہ وجہہ الکریم کا ارشادِ مبارک ہے:

رَضِیْنَا قِسْمَۃَ الْجَبَّارِ فِیْنَا   لَنَا عِلْمٌ وَّ لِلْجُہَّالِ مَالٌ

"ہم خداوند قدوس جبار کی تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے ہمیں علم عطا فرمایا اور جاہلوں کو مال" اور فرماتے ہیں علم کو مال پر چند وجوہ سے فضیلت ہے۔ علم انبیاء و اولیاء کی وراثت اور مال فرعون، ہامان اور شداد کی وراثت۔ مال خرچ کرنے سے کم ہو جاتا ہے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ مال دار کو مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے، مگر علم خود صاحبِ علم کی حفاظت کرتا ہے۔ تمام لوگ مالداروں کی طرف محتاج نہیں ہوتے، مگر کوئی ایسا آدمی نہیں، جو صاحبِ علم کی طرف محتاج نہ ہو۔ (تفسیر عزیزی ملخصاً ماخوذ از مواعظِ رضویہ)

إِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ اس حدیث میں آپ نے فرمایا: "اللہ دیتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں۔ بعض شارحین نے حدیث کے سیاق کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں علم و وحی کی تقسیم علی السّویہ سب کو برابر کرتا ہوں۔ اس کی فہم و فقاہت اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور جس کو فقاہت اور سمجھ زیادہ عطا فرماتا ہے، وہ مسائل کا زیادہ استخراج کر لیتا ہے اور جس کو سمجھ کم ملے وہ قلیل مسائل کا استنباط کرتا ہے۔ آپ کی تبلیغ برابر ہے اور بعض نے مورد حدیث کے اعتبار سے مال و دولت مراد لیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں، مال و دولت تقسیم کرنے والا ہوں اور کمی بیشی، اللہ تعالیٰ کی عطا کے اعتبار سے اور اس کے حکم کے مطابق جس کو زیادہ دینے کا

حکم ہوتا ہے، اُس کو زیادہ، اور جس کو کم دینے کا حکم ہوتا ہے، اس کو کم دیتا ہوں جیساکہ قرآن کریم میں بھی ہے" جس کو چاہے رزق زیادہ عطا فرمائے اور جس کو چاہے کم عطا فرمائے" لیکن حدیث کے الفاظ مطلق ہیں اور اہلِ معانی کا قاعدہ ہے کہ جس فعل متعدی کا مفعول ذکر نہ کیا جائے، اس سے عموم مراد ہوتا ہے، حدیث شریف کے یہ الفاظ ہیں: إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي ۔ نہ تو قَاسِمٌ مفعول بہ مذکور ہے اور نہ ہی يُعْطِي کا مفعول کہیں مذکور ہے، تو اس قاعدہ کے مطابق معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے عطا فرماتا ہے اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے تقسیم فرماتے ہیں۔ بخاری شریف میں ہے

يَقْضِي اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّهٖ مَا يَشَآءُ ۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان پر جو چاہتا ہے، فیصلہ فرماتا ہے۔

اس کی تائید ربیعہ بن اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث بھی کرتی ہے جس میں انہوں نے آپ سے جنت میں مرافقت کا سوال کیا اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قبول فرما کر جنت عطا فرمائی اور اس کی شرح میں بعض محدثین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام خزانے اور جنت حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دستِ اقتدار میں دے دیئے ہیں، جسے چاہیں جو چاہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم سے عطا فرمائیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: مجھے زمین کے خزانوں کی چابیاں عطا کی گئی ہیں (تفہیم البخاری)

ے خالقِ کُل نے آپ کو مالکِ کُل بنا دیا
دونوں جہاں ہیں آپ کے قبضہ و اختیار میں (اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ)

ان روایات سے معلوم ہوا آپ ہر چیز علم و فقاہت، فہم و فراست، مال و دولت اور تمام نعمتیں دیتے ہیں اور آپ وسیلہ عظمیٰ ہیں۔ سیدی اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

رب ہے معطی، یہ ہیں قاسم
دیتا وہ ہے، دلاتے یہ ہیں

شارح مسلم مولانا علامہ غلام رسول سعیدی صاحب فرماتے ہیں: اور یہ بھی بعید نہیں کہ اس حدیث کا یہ مفہوم ہو عزت و شرف، مال و دولت، علم و حکمت، غرضیکہ ہر نعمت دینا اللہ تعالیٰ ہے اور تقسیم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کرتے ہیں، کیونکہ آپ ہر نعمت کے حصول میں واسطۂ عظمیٰ ہیں، ملا علی قاری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

ای العلم والغنيمة ونحوهما وقيل البشارة للصّالح والنذارة للطّالح ويُمكن ان تكون قسمة الدّرجات والدّركات مفوّضة اليهِ صلّى الله تعالىٰ عليه وسلّم ولا منع من الجمع كما يدل عليه حذف المفعول لتذهب انفسهم كل المذهب ويشرب كل واحد من ذالك المشرب (مرقاة شرح مشكوٰة)

آپ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) علم اور مال غنیمت اور اس جیسی چیزیں تقسیم فرماتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ نیک لوگوں کو بشارت اور بدوں (گنہ گاروں) کو وعید تقسیم کرتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بلندیوں اور پستیوں کی تقسیم بھی آپ کی طرف مفوض (سپرد) ہو اور ان تمام معانی کے ارادہ کر لینے سے بھی کوئی بھی مانع نہیں ہے جیسا کہ اس بات پر مفعول کا محذوف ہونا دلالت کرتا تاکہ ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق کہہ سکے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز دیتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کو تقسیم کرتے ہیں (شرح مسلم جلد دوم صفحہ ۹۶۴)

کون دیتا ہے دینے کو منہ چاہیئے
دینے والا ہے سچا ہمارا نبی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

هٰذِهِ الْاُمَّةَ اس حدیث میں جو فرمایا گیا ہے "یہ اُمت ہمیشہ قائم رہے گی۔ شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اس سے مراد اہلِ علم ہیں" اور

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اگر اہل حدیث یعنی علم حدیث کے جاننے والے مراد نہ ہوں تو کون سے لوگ مراد ہوں گے۔ اور قاضی عیاض علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اس سے امام احمد علیہ الرحمہ کی مراد اہل سنت و جماعت ہیں اور شارح مسلم علامہ نووی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ احتمال ہے یہ طائفہ مومنین کی اقسام پر تفریق ہو، ان میں فقہاء، ان میں مجاہد اور ان میں محدثین اور ان میں صوفیا بھی ہیں (علیٰ)

ان شارحین کے اقوال سے معلوم ہوا کہ قیامت تک اہل علم اور اولیاء کے گروہ قائم رہیں گے اور ان کی برکات و فیوض سے آپ کی امت مستفید و مستفیض ہوتی رہے گی اور ان کے وسیلہ سے فیضان نبوت حاصل ہوتا رہے گا اور علماء و اولیاء کے دونوں گروہ آپس میں شیر و شکر ہیں، اسی لئے اولیاء علماء کے شاگرد اور علماء و اولیاء کے مرید ہوتے ہیں۔ بعض جاہل علماء کی مخالفت کرتے ہیں اور بزعم خویش صوفی بنتے ہیں، اور پیری مریدی کرتے پھرتے ہیں، وہ فراڈ اور دھوکہ ہے اور شیطان کے جال میں پھنسے ہوتے ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ علماء و اولیاء کا عقیدت مند رکھے اور جہالت کی وبا سے محفوظ و مامون فرمائے۔ (آمین!)

دل کے غنا کا بیان

حدیث ۳۹: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰکِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ۔

(بخاری شریف جلد دوم ص ۹۵۴، مسلم جلد اول ص ۳۳۶)

حلِّ لغات: اَلْغِنٰی: غنی ہونا۔
اَلْعَرَضِ: دنیاوی ساز و سامان

ترجمہ: "سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا، غِنا مال کی زیادتی سے نہیں، نفس کے استغناء سے حاصل ہوتا ہے۔"

تشریح و توضیح اِس حدیث میں قناعت اور دل کی غنا پر ترغیب دی جا رہی ہے فرمایا آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غنی وہ نہیں ہے، جس کے پاس دنیاوی مال و اسباب زیادہ ہوں، بلکہ غنی وہ ہے جس کا دل حرص، طمع، لالچ سے خالی ہو۔ جو شخص مال رکھنے کے باوجود مال و دولت پر حریص ہو اور مال میں زیادتی کا طالب ہو اور ہر وقت اسی دُھن میں لگا رہے کہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کر لے، اور حلال و حرام، جائز و ناجائز کی پرواہ کئے بغیر مال اکٹھا کرنے کی لگن میں لگا ہے وہ ایسے مال کی وجہ سے مستغنی نہ ہوگا، بلکہ وہ مال کی زیادتی کا محتاج ہے، لہٰذا وہ غنی نہیں ہے۔ غنی تب ہی ہوگا، جب وہ مال و دولت کی کثرت کی خواہش سے مستغنی ہو جائے اور جو مل جائے، اس پر قانع اور صابر رہ کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے اور اس کی تقدیر و قضا پر راضی رہے۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف محتاج رہے دنیا اور دُنیا کی چیزوں سے بے نیاز رہے۔ آج حال یہ ہے کہ لوگ بظاہر احکامِ خداوندی سے بے نیاز معلوم ہوتے ہیں، درحقیقت دنیا کی طرف حد درجہ کے محتاج نظر آرہے ہیں۔

علامہ بدرالدین عینی علیہ الرحمہ اسی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: مالِ کثیر والا غنی بالذّات نہیں ہے بلکہ اس میں تصرف کے اعتبار سے واضح ہوگا۔ اگر اس کا دل غنی نہیں ہوگا واجبات و مستحبات میں صرف کرنے سے توقف نہیں کرے گا، بلکہ نیکی کے امور میں مال خرچ کرے گا، اور اگر دل کا فقیر اور محتاج ہوگا، اس کے خرچ کرنے سے رُک جائے گا، اس ڈر سے کہ کہیں مال ختم نہ ہو جائے، وہ حقیقت میں محتاج و فقیر ہے، اگرچہ مالِ کثیر کا مالک

لہ آپ کے حالات حدیث ۶۲ کے حاشیہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ہے، کیونکہ اس سے نہ دنیا میں نفع حاصل کرتا ہے اور نہ آخرت میں اس کو فائدہ ہوگا بلکہ وہ مال اس پر وبال ہوگا۔" (عمدۃ القاری شرح بخاری)

جیسا کہ حدیث میں ہے کہ "جس مال سے زکوٰۃ نہ ادا کی جائے، وہ مال کل قیامت کو گنجے سانپ کی شکل ہو کر اس کو تکلیف دے گا۔"

محدث ابن بطال علیہ الرحمہ نے فرمایا: "حدیث کا مفہوم یہ ہے حقیقۃً غنا مال کی کثرت سے نہیں، اس لئے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں باوجودیکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے مال کی فراوانی اور وسعت دی ہے، لیکن اس پر قانع اور صابر نہیں ہوتا، بلکہ مال کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ خیال نہیں کرتا کہ وہ کس طریقہ سے مال بڑھانے کی کوشش اور کس طرح اسے حاصل ہو رہا ہے۔ (یعنی حلال و حرام کی پرواہ نہیں کرتا، تو گویا وہ شدتِ حرص کی وجہ سے محتاج ہے اور حقیقۃً غنا، دل کی غنا وہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے جو دیا وہ اس پر قانع ہو اور راضی ہو، زیادتی کا طالب نہ ہو، اور طلب میں اصرار نہ ہو۔"

علامہ قرطبی نے فرمایا حدیث کا مفہوم یہ ہے: فائدہ مند اور عظیم اور قابل مدح غنا دل کی غنا ہے۔ جس شخص کا دل غنی ہوگا، وہ حرص و طمع سے محفوظ ہوگا اور اس کو شرف و مدح ایسے غنی سے زیادہ حاصل ہوگا جو حرص و طمع کی وجہ سے دل کا فقیر و محتاج ہوگا۔"

(فتح الباری شرح بخاری جلد ۱۰، ص ۲۳۲)

لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ وہ کوشش کرے کہ اس کو دل کی غنا حاصل ہو جائے اور مولیٰ کریم کی عطا پر قانع اور راضی اور صابر و شاکر رہے۔ بعض دفعہ مال کی زیادتی کی وجہ سے دل غافل ہو جاتا ہے اور امورِ مستحبہ میں خرچ کرنے کی بجائے واجبات کا بھی تارک ہو جاتا ہے جیسا کہ ثعلبہ بن حاطب کا واقعہ ہے کہ پہلے وہ مالدار نہ تھا تو نیک اور صالح تھا، اس نے بار بار حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے مالدار ہونے کے لئے دعا کی درخواست کی، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بار بار سمجھایا کہ جو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس پر راضی

رہ، لیکن اُس نے اصرار کیا تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے دُعا فرمادی، وہ مالدار ہوگیا، تو پہلے نمازوں سے غافل ہوا، پھر جمعہ شریف کا تارک ہوگیا اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کے باوجود بالآخر زکوٰۃ دینے کا انکاری ہوگیا اور سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمادیا کہ ثعلبہ ہلاک ہوگیا۔ اس طرح کے واقعات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ مولیٰ تعالیٰ ہم سب کو دل کی غنا عطا فرمائے اور قناعت اور صبر کی دولت نصیب فرمائے۔ آمین!

صدقہ کی تبدیلی سے حکم بدل جاتا ہے

حدیث نمبر ۴۰: عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُتِیَ بِلَحْمٍ تُصُدِّقَ بِہٖ عَلٰی بَرِیْرَۃَ فَقَالَ ھُوَ عَلَیْھَا صَدَقَۃٌ وَّھُوَ لَنَا ھَدِیَّۃٌ۔

(بخاری شریف جلد اوّل ص۲۰۳ مسلم شریف جلد اوّل ص۳۴۵)

حلِ لغات: اُتِیَ:۔ دیا گیا۔ لَحْمٍ: گوشت
تُصُدِّقَ: صدقہ کیا گیا۔

ترجمہ: "سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس گوشت لایا گیا، جو سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا پر صدقہ ہوا تھا، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا وہ گوشت اس کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے۔"

تشریح: سیدہ بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، آپ عتبہ بن ابولہب کی باندی تھیں، یا بعض کے مطابق بنی ہلال کی۔ اس کے مالک سے سیدہ ام المومنین

لہ آپ کے حالات حدیث نمبر ۶ کے حاشیہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خرید کر آزاد فرما دیا۔ ان پر گائے کے گوشت کا صدقہ ہوا اور اس گوشت سے کچھ نبی پاک صاحب لولاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں پیش کیا گیا اور عرض بھی کر دیا گیا کہ یہ وہ گوشت ہے جو بریدہ (رضی اللہ عنہا) پر صدقہ کیا گیا ہے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اس کے حق میں صدقہ اور ہمارے حق میں ہدیہ اور نذرانہ ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ امام بخاری علیہ الرحمہ نے اسی باب میں اس حدیث سے پہلی حدیث میں ذکر فرمایا کہ سیدہ ام عطیہ نسیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بطور صدقہ گوشت بھیجا، انھوں نے اس گوشت سے قدرے آپ کے گھر بھیج دیا۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گھر آکر سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: "کیا گھر میں کوئی کھانے والی شے موجود ہے؟" تو آپ سے عرض کیا "صرف وہی گوشت ہے جو آپ نے ام عطیہ پر صدقہ کیا تھا، اُس نے کچھ بھیجا ہے۔" آپ نے فرمایا "وہ صدقہ اپنے مقام کو پہنچ گیا۔ یعنی وہ اُس کے حق میں صدقہ ہے اور اب ہمارے حق میں ہدیہ ہے۔"

ان روایات سے معلوم ہوا کہ جب صدقہ محتاج کے حوالے کر دیا جائے اور اُس کو اس کا مالک کر دیا جائے، اب وہ جو چاہے کرے، چاہے فروخت کر دے، چاہے کسی کو ہبہ اور ہدیہ کر دے یا مسجد و مدرسہ پر خرچ کر دے۔ اس کے تمام تصرفات اس میں جائز ہیں، کیونکہ وہ اس کا مالک ہے، بلکہ وہ صدقہ کرنے والے کو بھی بطور ہدیہ دے سکتا ہے جیسا کہ ام عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کیا اور آپ نے ان کے عمل کو ثابت فرمایا۔ تاہم فقہاء نے متصدق (صدقہ کرنے والا) کے لئے فرمایا ہے کہ مناسب ہے کہ وہ محتاج سے وہی صدقہ بعینہٖ نہ خریدے، کیونکہ وہ جب اس کو فروخت کرے گا، تو قدرے لحاظ کرتے ہوئے ارزاں قیمت پر فروخت کرے گا، تو اس طرح گویا اُس نے اپنے صدقہ سے

کچھ واپس لے لیا اور صدقہ کرنے کے بعد واپس لینا یہ بہت ناپسندیدہ عمل ہے۔ آپ نے فرمایا، وہ ایسا ہے جو قے کرنے کے بعد واپس کرلے۔

اور ایسا واقعہ سیدنا عمر بن خطاب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا امام بخاری علیہ الرحمہ نے نقل فرمایا ہے۔ آپ نے ایک گھوڑا کسی مجاہد کو بطور صدقہ دیا۔ اُس نے اچھی طرح دیکھ بھال نہ کی، تو وہ کمزور ہوگیا تو آپ نے اس سے گھوڑا خریدنے کا ارادہ فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا، تو آپ نے خریدنے سے منع فرمادیا۔ اس حدیث کے پیشِ نظر فقہاء کرام نے اس سے صدقہ خریدنا مکروہ فرمایا۔ ہاں اگر اُس سے کسی دوسرے شخص نے خریدلیا، پھر وہ ہی صدقہ متصدق نے خریدلیا تو اس میں کوئی کراہت نہ ہوگی اسی طرح اگر متصدق کو بطورِ وراثت دوبارہ مل جائے، اس میں بھی کچھ کراہت اور حرج نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ کے زمانہ میں ایسا ہوا۔ ایک عورت سرکار ابدقرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آئی۔ اُس نے عرض کیا کہ میں نے اپنی والدہ پر ایک جاریہ (باندی) صدقہ کی۔ اب میری والدہ فوت ہوگئی ہے، اب وہ جاریہ مجھے وراثت میں مل گئی ہے، تو آپ نے فرمایا: تجھے صدقہ کا اجر مل گیا اور وراثت کی وجہ سے وہ صدقہ واپس مل گیا۔ (عمدۃ القاری)

معلوم ہوا کہ ملک بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے۔ جب صدقہ محتاج کے پاس ہوگا، وہ صدقہ جب دُوسرے کی مِلک میں جائے گا، تو حکمِ صدقہ سے نکل جائے گا۔ حیلہ اسقاط میں جب ایک ہی رقم کو بار بار مختلف لوگ، مختلف اشخاص کو دیتے ہیں، اس میں تعدّد آجاتا ہے۔

حیلہ اسقاط کا طریقہ

جب کوئی شخص فوت ہوجائے اور اس کے ذمہ نمازیں، روزے وغیرہ لازم ہوں، تو اُس کی جانب سے ورثاء کچھ رقم چند محتاجوں کو اس طرح اس کی نماز، روزہ کے فدیہ میں دیتے ہیں، وارث ایک شخص کو، پھر وہ دوسرا، دوسرے کو پھر تیسرے کو، اس طرح وہ بار بار کرتے ہیں

اس طرح اس کا فدیہ ہو جاتا ہے، اس میں مِلک بدلنے سے تعدد آجاتا ہے اور میّت کی جانب سے نماز روزہ کا فدیہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح آجکل مدارس میں اسی حیلہ سے زکوٰۃ و صدقات کو صرف کیا جاتا ہے، مثلاً زکوٰۃ کی رقم پہلے محتاج کے حوالے کر دی جائے اور اس کو مالک بنا دیا جائے، پھر وہ مدرسہ کو بطورِ ہدیہ دے دے، تو اس طرح مدرسہ پر خرچ کرنا جائز ہوتا ہے۔

تفسیر کبیر میں ہے کہ صدقات و خیرات کے چھ فائدے ہوتے ہیں، تین دنیا میں، تین آخرت میں: (۱) رزق میں برکت (۲) مال میں فراوانی (۳) گھر میں آبادی (۴) آخرت کی دھوپ سے حفاظت (۵) عیبوں پر پردہ (۶) جہنم کی آگ سے حفاظت

(بحوالہ تفسیر نعیمی، پہلا پارہ)

اس حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا: "وہ ہمارے لئے ہدیہ ہے" ایک دوسرے کو ہدیہ دینے سے محبت بڑھتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:۔ تَہَادَوْا تَحَابُّوْا۔

"یعنی ایک دوسرے کو ہدیہ کیا کرو، اس سے محبت بڑھتی ہے۔"

اِسی لئے علماء و مشائخ اور اساتذہ کی بارگاہ میں ہدیئے نذرانے پیش کئے جاتے ہیں اور محبت و شفقت میں اضافہ ہوتا ہے، جو مُردگان کو صدقات و عطیات کا اجر و ثواب ایصال کیا جاتا ہے، وہ بھی ہدیہ اور نذرانہ ہوتا ہے، اور ان سے محبت بڑھتی ہے، اولیاء کی بارگاہ میں جب ثواب پیش کیا جاتا ہے، تو اُن کی جانب سے دُعاء اور خصوصی توجہ نصیب ہوتی ہے، اس لئے سوم۔ دسواں، چالیسواں اور سالانہ ختماتِ مبارکہ معمولاتِ اہلِ سُنّت سے ہیں اور اُن کے جواز میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ ان ختمات میں اموات کے لئے اجر و ثواب کا ہدیہ پیش کیا جاتا ہے اور ان کی مغفرت کے لئے دُعا کی جاتی ہے، اس میں کونسی قباحت ہے۔؟

ماہِ رمضان کی فضیلت

حدیث ۱۴۱ : عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ شَهْرُ رَمَضَانَ فُتِحَتْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ جَهَنَّمَ وَ سُلْسِلَتِ الشَّیَاطِیْنَ۔ (بخاری جلد اول ص ۲۵۵ ۔ مسلم جلد اول ص ۳۴۶)

حلِّ لغات فُتِحَتْ : کھول دیئے جاتے ہیں۔ غُلِّقَتْ۔ بند کر دیئے جاتے ہیں سُلْسِلَتْ : زنجیر ڈال دیئے جاتے ہیں۔

ترجمہ: "سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، جب ماہِ رمضان آجاتا ہے، تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، اور شیطانوں کو زنجیروں میں قید کر دیا جاتا ہے۔"

تشریح اس حدیث میں حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ماہِ رمضان کی فضیلت میں ارشاد فرمایا کہ اسی ماہ میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ایک روایت میں ہے، رحمت کے دروازے (اس میں محدثین نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ) جنت آسمان کے اوپر ہے اور جنت مقامِ رحمت بھی ہے۔ اب اس طرح ہوا کہ جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور خصوصی رحمتیں آسمانوں کے دروازوں سے زمین پر اترتی ہیں اور اہلِ جنت کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اب دُنیا میں ماہِ رمضان آگیا ہے لہٰذا وہ بھی آپ کی اُمت کے لئے دُعائیں فرماتے ہیں، جس طرح دُوسری حدیث میں ہے کہ رمضان کے لئے (شروع سال سے آخر تک) جنت کو مزین کیا جاتا ہے اور جب رمضان شریف آتا ہے تو عرش کے نیچے جنت کے پتوں پر سے موٹی آنکھ والی حوروں پر ایک

لہ آپ کے حالات حدیث ۹ کے حاشیہ پر درج ہیں۔

خوشگوار ہوا چلتی، تو حوریں عرض کرتی ہیں: یارب اپنے بندوں سے ہمارے خاوند بنا اُن سے ہماری آنکھیں اور ہم سے اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ (مشکوٰۃ شریف بحوالہ بیہقی)

علامہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں فرمایا کہ جہنّم کے دروازے بند ہونے سے مراد یہ ہے کہ بندوں سے گناہ متروک ہو جاتے ہیں، جو جہنّم میں جانے کے اسباب ہوتے ہیں، اور اس ماہ کی برکت سے گناہوں کی معافی ہو جاتی ہے اور بندے جہنّم سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور شیاطین کے قید کرنے سے مراد بھی گناہوں میں کمی کا ہونا ہے جیسا کہ ماہ رمضان میں محسوس ہوتا ہے، مساجد آباد ہوتی ہیں اور مجموعی طور پر گناہوں میں کمی آجاتی ہے، اس کے علاوہ محدّثین نے اور بھی تاویلیں فرمائی ہیں۔

حضرت مولانا مفتی احمد یار خاں نعیمی صاحب علیہ الرحمہ نے شرح مشکوٰۃ میں فرمایا کہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے، لکھتے ہیں: حق یہ ہے کہ ماہِ رمضان میں آسمانوں کے دروازے کھلتے ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں زمین پر اترتی ہیں اور جنّتوں کے دروازے بھی کھلتے ہیں، جس کی وجہ سے حور و غلمان کو خبر ہو جاتی ہے کہ دُنیا میں رمضان آگیا اور وہ روزہ داروں کے لئے دُعاؤں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں ماہِ رمضان میں واقعی دوزخ کے دروازے ہی بند ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے اس مہینے میں گناہ گاروں، بلکہ کافروں کی قبروں پر بھی دوزخ کی گرمی نہیں پہنچتی اور حقیقت میں ابلیس مع اپنی ذرّیت کے قید کر دیا جاتا ہے۔ اس مہینے میں جو کوئی گناہ کرتا ہے وہ اپنے نفسِ امارہ کی شرارت (جو گیارہ ماہ شیطان کی سنگت میں خراب ہوتا گیا) سے کرتا ہے۔ فرماتے ہیں: فقیر کی اس تقریر سے اس حدیث کے متعلق بہت سے اعتراضات رفع ہو گئے، مثلاً یہ کہ جب ابھی جنّت میں کوئی جا ہی نہیں رہا، تو اُس کے دروازے کھلنے سے کیا فائدہ یا یہ کہ جب دوزخ کے دروازے بند ہو گئے، تو رمضان میں گرمی کہاں سے؟ یا یہ کہ جب شیطان بند ہو گیا تو اس مہینہ میں گناہ کیسے ہوتے ہیں؟ (مرآۃ شرح مشکوٰۃ جلد سوم کتاب الصوم فصلِ اوّل)

ماہِ رمضان اس مہینہ کا نام رمضان یا تو اس لئے ہے کہ یہ لفظ رمض سے بنا جس کا معنیٰ گرمی ہے یا گرم بھٹی ہے۔ جب لوگوں نے مہینوں کے نام رکھے، تو یہ مہینہ گرمیوں میں واقع ہوا۔ اس لئے کہ اس میں گناہ جلتے ہیں۔ (فتح الباری)

مولانا مفتی احمد یار خاں نعیمی صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: چونکہ بھٹی گندے لوہے کو صاف کرتی ہے اور صاف لوہے کو پرزہ بنا کر قیمتی کر دیتی ہے اور سونے کو محبوب کے پہننے کے لائق کر دیتی ہے، اسی طرح روزہ گناہگاروں کے گناہ معاف کرواتا ہے اور نیکوکاروں کے درجے بڑھاتا ہے اور ابرار کا قربِ الٰہی زیادہ کرتا ہے۔ (حوالہ مذکور)

حروفِ رمضان لفظ رمضان میں پانچ حرف ہیں: ر۔ م۔ ض۔ ا۔ ن۔ ان کا اشارہ ہے: رحمت۔ محبت۔ ضمان۔ امان۔ نور کی طرف ہے۔ ماہِ مذکورہ پانچ انعامات لے کر آتا ہے؛ اس لئے اس کو رمضان کہا جاتا ہے۔ خیال رہے رمضان المبارک یہ پانچ نعمتیں لاتا ہے اور اس ماہ میں پانچ عبادتوں کا اضافہ ہوتا ہے روزہ۔ تراویح۔ اعتکاف، شبِ قدر کی عبادات، کثرتِ تلاوتِ قرآنِ کریم۔ اسی ماہ میں قرآنِ عظیم اُترا اور اسی ماہ کا نام قرآنِ کریم میں مذکور ہوا۔

مولانا علامہ نور محمد صاحب اس حدیث کے تحت رقمطراز ہیں:

فائدہ: سبحان اللہ! رمضان پاک کا کیسا مبارک اور مقدس مہینہ ہے کہ اس کی آمد پر آسمان اور رحمت اور جنت کے دروازے، اُمتِ مصطفیٰ پر کھل جاتے ہیں اور دوزخ وجہنم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، اس پر مزید یہ کہ شیطان دشمنِ انسان قید کیا جاتا ہے تاکہ وہ بندگانِ خدا کو نیک عمل کرنے سے روک نہ سکے اور وہ ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ رمضان پاک میں گناہوں کا زور شور کم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ رمضان مبارک میں رحمت کا نزول اور عبادت کی کثرت کا تقاضا یہ تھا کہ شیطان اہلِ ایمان کو بہکانے میں انتہائی کوشش کرتا اور معاصی کی کثرت ہو جاتی،

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ رمضان مبارک میں گناہوں میں مجموعی حیثیت سے ضرور کمی ہوجاتی ہے بعض ناسمجھ افراد اعتراض کرتے ہیں کہ جب شیطان بند ہوجاتے ہیں، تو بعض لوگ گناہ کیوں کرتے ہیں، اس اعتراض کا جواب ہمارے مشائخ عظام نے کئی وجوہ سے دیا ہے ؛

(۱) جہاں شیطانوں کے قید ہونے کا ذکر ہے۔ ان شیاطین سے سرکش اور متمرد شیطان مراد ہیں، چنانچہ بعض روایات میں سرکش کی قید موجود ہے، لہٰذا اگر گناہ غیر سرکش شیطانوں کے اثر سے ہوں، تو حدیث پاک پر کوئی اشکال نہیں۔

(۲) اگر حدیث پاک میں سب شیطان خواہ سرکش ہوں یا غیر سرکش مراد ہوں، تب بھی کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ شیطان ہر قسم کے بند ہیں، مگر گناہوں کے صادر ہونے کی وجہ اور ہے، وہ یہ کہ گیارہ ماہ شیطان انسان کے ساتھ رہتا ہے جس سے نفس انسانی گناہوں کے ساتھ اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ خیالاتِ فاسدہ اور گناہ انسان کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتا ہے، جس کی وجہ سے گناہوں کا صدور ہوتا رہتا ہے۔

چند روایات ماہِ رمضان کی فضیلت میں مزید لکھی جاتی ہیں :

جس طرح بعض جگہیں ایسی مبارک ہوتی ہیں جس میں عملِ خیر کا اجر و ثواب بڑھ جاتا ہے جیسا کہ گھر میں نماز پڑھنے سے مسجد میں پڑھنے کا اجر و ثواب زیادہ ہوتا ہے اور مسجدِ نبوی میں ایک نماز پڑھنے کا اجر پچاس ہزار کے برابر اور مسجد حرام میں ایک کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہے، ایسے ہی بعض اوقات ایسے مبارک ہوتے ہیں جس میں اعمالِ خیر کا ثواب بڑھ جاتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے کہ لیلۃ القدر ہزار ماہ کی عبادات سے بہتر ہے، ایسے ہی ماہِ رمضان وہ مبارک مہینہ ہے جس کے متعلق حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس میں نفلی عبادت فرض کا درجہ رکھتی ہے اور ایک فرض کا ثواب ستر فرض کے برابر ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

سبحان اللہ! کیا عظمت ہے ماہ رمضان کی، پھر مسجدِ نبوی یا مسجدِ حرام میں کوئی

خوش نصیب جائے گا، تو اجر زیادہ پائے گا۔ ماہِ رمضان ہر جگہ خود آکر فیوض و برکات عطا کرتا ہے، اس میں صدقہ و خیرات کا اجر و ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے اور اس میں محتاجوں اور مساکین کے ساتھ خود بخود ہمدردی اور ایثار کا جذبہ زیادہ ہو جاتا ہے، اِسی لئے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ھو شھر المواساۃ کہ "یہ ہمدردی کا مہینہ ہے" اور آپ نے فرمایا: "اس ماہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔" (مشکوٰۃ)

کل قیامت میں ماہِ رمضان، روزے داروں کی شفاعت کرے گا عرض کرے گا، میں نے اسے کھاتے پینے سے روکا، یارب کریم! میری شفاعت اِس کے حق میں قبول فرما۔ (مشکوٰۃ)

مولوی نور محمد صاحب نے "زواجر" کے حوالہ سے ایک حدیث بیان فرمائی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے: آسمان سے رمضان کی ہر رات کو ایک منادی طلوعِ فجر تک یہ ندا کرتا ہے: اے خیر کے طلب گار! تمام کر اور خوش ہو اور بُرائی کے چاہنے والے! رُک جا اور عبرت حاصل کر، کیا کوئی بخشش مانگنے والا ہے کہ اس کی بخشش کی جائے، کیا کوئی توبہ کرنے والا ہے کہ اس کی توبہ قبول کی جائے، کیا کوئی دُعا مانگنے والا ہے کہ اس کی دُعا قبول کی جائے، کیا کوئی سوالی ہے کہ اس کا سوال پورا کیا جائے (الیٰ آخرہٖ)

(زواجر جلد اوّل ص۱۶۱)

۔ عمدۃ القاری شرح بخاری میں حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت مذکور ہے کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ماہِ رمضان کے روزے فرض فرمائے اور میں نے اس کا قیام مسنون فرمایا، پس جس نے ایمان اور احتساب (ثواب کے لئے) کے ساتھ روزے رکھے اور اس کا قیام کیا، تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جائے گا، جس طرح اس دن پاک تھا، جس دن وہ اپنی والدہ کے ہاں پیدا ہوا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے رسول اللہ

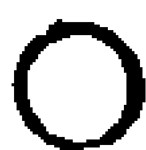
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے سُنا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرما رہے ہیں کہ رمضان شریف کا چاند طلوع ہو گیا تھا:

لو یعلم العباد ما فی رمضان لتمنت امتی ان تکون السنۃ کلھا رمضان۔	اگر لوگ رمضان مبارک کی فضیلت کو (کما حقہٗ) جانتے، تو میری امت آرزو کرتی کہ سارا سال ہی رمضان ہوتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بحوالہ طبرانی شریف مروی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: کیا تمہیں خبر نہ دوں کہ فرشتوں میں افضل حضرت جبریل علیہ السلام ہیں اور (دیگر) انبیاء کرام میں افضل سیدنا آدم علیہ السلام، اور دنوں میں یوم جمعۃ المبارک افضل اور راتوں میں افضل لیلۃ القدر اور مہینوں میں افضل ماہِ رمضان اور عورتوں میں افضل مریم بنت عمران (الیٰ آخر الحدیث) اس کی سند میں ایک راوی ضعیف ہے۔

(عینی شرح بخاری جلد ۱۰، ص ۲۶۸، ص ۲۶۹)

اس حدیث میں جو سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو افضل الانبیاء فرمایا گیا ہے اس سے مراد آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ انبیاء ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت تمام انبیاء پر اور تمام انبیاء کی فضیلت باقی تمام مخلوق پر دلائل قطعیہ سے ثابت ہے اور اس پر اجماعِ اُمت ہے۔ معلوم ہوا تمام مہینوں میں سے ماہِ رمضان افضل ہے، جس طرح سیدنا یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں سیدنا یوسف علیہ السلام افضل تھے، ایسے ہی بارہ مہینوں میں ماہِ رمضان افضل و اعلیٰ ہے۔ اس مہینے میں گناہ گاروں کی عام بخشش ہوتی ہے اور گویا کہ یہ مہینہ نیکیاں کمانے کا سیزن ہے۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں کو اس ماہ کی قدر اور احترام کی توفیق بخشے۔



ہماری دیگر مطبوعات

سیرتِ رسولِ اعظم — مفتی عنایت اللہ

جواہر البیان فی اسرار الارکان — مولینا نقی علی خان رحمۃ اللہ علیہ
اعلیٰ حضرت کے والد ماجد

المعروف آداب اور حکمتیں

بیعت و خلافت — اعلیٰ حضرت مولینا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

حیاۃ انبیاء — علامہ سعید احمد کاظمی

ذکرِ محبوب — مولینا محمد رفیق قادری رضوی

نغمۂ محبوب اول دوم — مولینا محمد رفیق قادری رضوی

عظمتِ امامِ اعظم — سید غلام معین الدین نعیمی

بردہ — ابو البشر محمد صالح رحمۃ اللہ علیہ

ملنے کا پتہ
مکتبہ جمالِ کرم
[illegible] دربار مارکیٹ لاہور